دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اسی "اُجڑے دیار" کے

شاہد احمد دہلوی

ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز نئی دہلی

اجڑا دیار

شاہد احمد دہلوی

ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی

نام کتاب : اجڑا دیار

مرتب : شاہد احمد دہلوی

مطبع : نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔

ناشر : ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز

10 میٹرو پول مارکیٹ، 2724-25 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

Ujra Dyar

by

Shahid Ahmad Dehlvi

ISBN: 978-93-80934-11-2

Edition :2012

Price: **Rs. 225/-**

Library Edition: Rs. 375/-

Printed & Published by

M. R. PUBLICATIONS

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor

Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 09873156910

E-mail: abdus26@hotmail.comi

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اسی "اُجڑے دیار" کے

شاہد احمد دہلوی

شاہد احمد دہلوی

فہرست مضامین

تعارف

تعارف لکھنا کسی ایسے مصنف کی کتاب پر جو روشناس خلق نہ ہو، اس لحاظ سے مفید ہو سکتا ہے کہ اس طرح بھی اس کا چرچا ہو جائے گا، لیکن جسے خاص و عام، سب پہلے سے جانتے ہوں، اس کو متعارف کرانے کے لئے کچھ لکھنا محض رسمی سی بات ہے۔ بھلا ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے اور مولوی بشیر الدین احمد کے بیٹے اور مدیر "ساقی" سے کون واقف نہیں۔ جس نے رسالہ "ساقی" کی جھلک بھی دیکھی ہے اور جو ادب سے ذرا بھی دلچسپی رکھتا ہے وہ شاہد احمد کے نام سے اور ان کے ان کارناموں سے ضرور واقف ہے کہ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے اور ۲۷ سال مسلسل ساقی نکالتے رہے تھے اور ادیب ابن ادیب تھے۔ روپے پیسے کی طرح علم اور ادب بھی ایک گھر میں تین پشت نہیں ٹھہرا کرتا۔ یہ شرف صرف شاہد احمد صاحب کو حاصل تھا شاہد احمد تین پشت سے صاحب علم اور صاحب قلم تھے۔

افسوس! آج شاہد صاحب کے ذکر میں ماضی کا صیغہ استعمال کرنا پڑ رہا ہے۔ ڈیڑھ دو ماہ پہلے تک وہ بزم ساقی میں پورے انہماک کے ساتھ موجود تھے۔ انہوں نے اپنے انتقال سے صرف ہفتہ بھر قبل اس کتاب کا پیش لفظ لکھا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ اس کا تعارف میں لکھوں۔ اپنے قول کے مطابق میرے چند الفاظ تبرک کے طور پر اس میں شامل کر لینا چاہتے تھے۔ میں پندرہ مہینے سے فالج کا مریض ہوں۔ اس لئے میرے الفاظ واقعی تبرک کے دائرے سے نہیں بڑھیں گے۔

شاہد احمد کے عہد سے، بہت پہلے میرؔ نے دلی کو "اجڑا دیار" کہہ کر گویا ہمیشہ کے واسطے مہر لگا دی تھی کہ یہ بستی اہل دہلی کے حق میں اُجڑی اور اجڑتی رہے گی۔ شاہد صاحب نے یہ شعر بار ہا پڑھا تھا، اور میں نے سنا ہے کہ وہ یہ شعر بڑے سوز کے ساتھ گایا بھی کرتے تھے، جس میں اُجڑے دیار کا ذکر ہے۔ لیکن وہ دلی کو بسی ہوئی حالت میں دیکھتے تھے اور یوں پوری طرح شعر کی کیفیت کو شاید محسوس نہ

کرتے ہوں۔ ۱۹۴۷ء میں دلّی وہاں کے اصل باشندوں کی نظر میں درحقیقت اُجڑ گئی تو شاہد صاحب کے لئے اس کا احساس سوہانِ روح بن گیا اور انہوں نے ان ہستیوں کا تذکرہ لکھنا شروع کر دیا، جن کے دم قدم سے ۱۹۴۷ء تک دلّی صحیح معنوں میں دلّی تھی۔ اور جنہیں نظر انداز کرنے کے بعد نگاہِ بازگشت ڈالنے سے وہاں کوئی رونق دکھائی نہیں دیتی، وہ خود لُٹ لٹا کر اس شہرِ خوباں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے اور اس کو اُجڑی حالت میں چھوڑ کر پاکستان آئے تھے۔ ان کے سینے پر زخم پڑ گئے تھے۔ انہوں نے ان زخموں کو کُرید کُرید کر جو لکھا اور اپنے پورے تاثرات کے ساتھ ہمارے سامنے ہے۔

جن پیشہ وروں کا ذکر اُنہوں نے کیا ہے، وہ ہر ملک میں اور ہر شہر میں پائے جاتے ہیں، لیکن دلّی کے ان پیشہ وروں کی بات کچھ اور تھی۔ مثال کے طور پر لاہور میں وزیر خاں والے چوک کے کبابی مشہور تھے لیکن لوگ ان کے کبابوں کا مزا تو لیتے تھے، مگر ان کی ذات سے متاثر نہیں تھے۔ ان کا ذکر آج تک کسی مضمون میں نہیں آیا۔ شاہد صاحب نے جن کبابی کا حال لکھا ہے، ان کا کردار تھا جسے کباب کھانے والے کباب کی لذت کے ساتھ یاد رکھتے تھے۔ محفلوں کا رنگ دوبالا کرنے کے لئے بھانڈوں اور طوائفوں کے مجرے بھی ہر جگہ ہوتے ہیں لیکن دلّی میں کمالِ فن کے ساتھ دل کی لگن بھی پائی جاتی تھی جواب ناپید ہے۔ اسی طرح کبوتر ہر جگہ اُڑائے جاتے ہیں مگر دلّی کے کبوتر بازوں کی جس خودداری کا ذکر شاہد صاحب نے کیا ہے وہ کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ کھانے پینے میں لذت کام و دہن کا خیال رکھنا معاشرے کا ایک اہم جزو ہے۔ بہت سے ملکوں یا ان کے شہروں میں لوگ صرف پیٹ بھر لینا جانتے ہیں۔ ان کی سعی و کاوش کی یہی معراج ہے کہ صبح و شام جو ملا کھا لیا اور زندگی بسر کر لی۔ اپنے کھانوں میں تنوع اور لذت پیدا کرنا دلّی والوں کا خاص مشغلہ تھا جو صحیح ذوق کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ دلّی والوں کا چٹورپن مشہور تھا۔ شاہد احمد خود بھی اس سے بیگانہ نہیں تھے۔ لہٰذا بڑے مزے لے لے کر ان باتوں کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ پڑھنے والے کے مُنھ میں پانی بھر بھر آتا ہے۔ موسمی تہوار اور میلے بھی ہر جگہ منائے جاتے ہیں لیکن جو روایات دلّی کے تہواروں اور میلوں سے وابستہ ہیں، ان کا احساس کتنے لوگوں کو کس شدت کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ شاہد صاحب کے دل سے پوچھیے اور ان کی تحریروں میں تلاش کیجئے۔

آخر میں اُنہوں نے دلّی کے غسلِ خونیں کی داستان بیان کی ہے۔ اس میں کچھ آپ بیتی کا رنگ ہے اور کچھ جگ بیتی کا۔ وہ اپنے غموں کے ساتھ دوسروں کے دکھ درد کو نظر انداز نہیں کر سکتے

تھے۔ اگر چہ یہ تذکرہ زیادہ تفصیل کے ساتھ "دلّی کی بپتا" میں کر چکے ہیں، لیکن اس اختصار میں بھی کوئی پہلو چھوڑا نہیں گیا ہے۔

ان سب مضامین کو اور ان سچے قصہ ہائے پارینہ کو پڑھنے کے بعد ایک اضمحلال سا طبیعت میں محسوس ہوتا ہے لیکن اس میں ایک لذت پائی جاتی ہے — ایک لذتِ غم جس سے زندگی عبارت ہے۔

خاکسار

واحدی

حسین ڈی سلوا کولونی، کراچی

۱۵/۰۷/۱۹۶۷

ایک چراغ اور گُل ہو گیا

(شاہد احمد دہلوی کی وفات پر رسالہ "گفتگو" بمبئی کے مدیر سردار جعفری صاحب کے تاثرات)

شاہد احمد دہلوی کے ساتھ دلی کی ایک روایت ختم ہو گئی۔ ایک دور قبر میں اُتر گیا۔ اب میر اور غالب، ڈپٹی نذیر احمد اور ان کے پوتے شاہد احمد کی دلی باقی نہیں ہے۔ ایک دوسری دلی نئے حسن کے ساتھ اُبھر رہی ہے۔

گرم ہنگامہ ہوئے لالہ رُخانِ پنجاب
گل کھلائے ہیں نئے تو نے خزانِ دلی

اور یہ نئی دلی کراچی اور لاہور کی طرح شاہد احمد دہلوی کے سوگ میں شریک ہے۔

شاہد احمد دہلوی کی زندگی ادب اور موسیقی سے عبارت تھی۔ دلی کی زبان اور ہندوستان کی موسیقی وہ دونوں کے عاشق تھے اور اُن کے تمام اسرار و رموز سے واقف۔ انہوں نے تقریباً پچاس کتابیں لکھیں اور ترجمہ کیں۔ لیکن غالباً ان کا سب سے بڑا کارنامہ رسالہ "ساقی" ہے جو انہوں نے ۱۹۳۰ء میں جاری کیا تھا۔ ساقی کا شمار ان رسالوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے عہد میں ادیبوں کی ایک پوری نسل کی تربیت کی ہے۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، اختر حسین رائے پوری اور بہت سے ادیب اس افق سے طلوع ہوئے۔ جن ادیبوں کی شخصیت اور تحریروں سے عصمت چغتائی متاثر ہوئی ہیں ان میں شاہد احمد بھی ہیں۔ "ساقی بک ڈپو" نے بھی اردو ادب کی بڑی خدمت کی اور ڈیڑھ دو سو کتابیں شائع کیں۔

لیکن جب ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد دلی اجڑی تو ساقی اور ساقی بک ڈپو اور شاہد احمد دہلوی نے بھی دلی کو خیر باد کہا۔ اور یہ دلی کراچی میں جا بسی۔ جہاں اتفاق سے "ساقی" اور شاہد احمد کو

وہ فراغت نصیب نہ ہو سکی جو دلی میں تھی۔ یوں تو شاہد احمد کو پاکستان میں بھی اعزاز ملا اور ادیبوں کی تنظیم میں اعلیٰ مقام بھی لیکن ساقی اپنی پچھلی اہمیت کھو چکا تھا۔ شاید اسی درد نے شاہد احمد کے یہاں تھوڑی سی تلخی پیدا کر دی تھی۔

وہ بہت حساس تھے۔ ایک بار جوش ملیح آبادی نے ڈپٹی نذیر احمد کی زبان پر اعتراض کر دیا اور شاید کہیں کہیں تصحیح بھی کر دی۔ اس پر شاہد صاحب اتنے برہم ہوئے کہ انہوں نے جوش کی شخصیت اور شاعری کے خلاف "ساقی" کا ایک ضخیم نمبر شائع کر دیا۔ یہ "افکار" (کراچی) کے جوش نمبر کے بعد شائع ہوا اور اس اعتبار سے یہ ایک اہم دستاویز ہے کہ آنے والی نسلوں کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ اس عہد کے ایک عظیم شاعر کے خلاف کیا کہا جا تا تھا۔

۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کے بعد وہ اس تحریک کے سرگرم طرفداروں اور کارکنوں میں تھے۔ جب دارو گیر شروع ہوئی تو شاہد صاحب نے تحریک سے کنارہ کشی کر لی لیکن ترقی پسند ادیبوں سے ان کے دوستانہ مراسم برقرار رہے اور ان کی کتابیں ساقی بک ڈپو سے شائع ہوتی رہیں۔

آج شاہد احمد دہلوی ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی تحریریں زندہ ہیں اور ان میں دلی کی ٹکسالی زبان کے نادر نمونے ہمیشہ باقی رہیں گے۔ وہ زبان جو اب دلی میں نہیں بولی جائے گی، جو تھی نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرف محرمانہ۔

سردار جعفری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

یہ مضامین وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے، اس لئے ان میں بعض باتیں آپ کو بعض مضامین میں مکرر نظر آئیں گی۔ مضمون کی روانی کو قائم رکھنے کے لئے ان کا اخراج بھی ممکن نہیں تھا، اس لئے انہیں خارج نہیں کیا گیا۔

ان مضامین میں اس دلّی کی معاشرتی اور تہذیبی جھلکیاں پیش کی گئی ہیں جو ۱۹۴۷ء تک قائم تھی۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد دلّی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تھی۔ بوڑھے بادشاہ کو قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا تھا اور دلّی کے مسلمان شرفا چن چن کر توپ دم کر دیئے گئے تھے۔ ان مرنے والوں کے ساتھ دلّی کی وہ تہذیب بھی مر گئی جو مسلمانوں کے دم قدم کی برکت سے صدیوں میں بنی تھی۔ معافیوں کے بعد بچے کھچے دلّی والے جب واپس اپنے شہر میں آئے تو اسے ویرانہ پایا۔ انہوں نے اس کھنڈر ہی کو اللہ عزیز کر لیا اور رفتہ رفتہ دلّی نے اپنی عظمت رفتہ پھر حاصل کر لی۔

دلّی کی ایک مخصوص تہذیب تھی جو عروج و زوال کے تانے بانے سے بنتی بگڑتی رہی۔ اس کے ہر بگاڑ میں ایک سنوار تھا۔ ۱۹۴۷ء میں دلّی کو غسل خون دیا گیا۔ اس سے دلّی کی آبادی تو دگنی ہو گئی مگر وہ تہذیب اور وہ معاشرت غارت ہو گئی جس پر دلّی کو ناز تھا اور جس سے دلّی کی انفرادیت قائم تھی۔ وہ تہذیب کیا تھی اور وہ معاشرت کیسی تھی؟ اسے بیان کرنے کے لئے دفتر درکار ہیں جن کی نہ توفیق نہ ہمت۔ البتہ چند جھلکیاں آئندہ صفحات میں پیش کی جا رہی ہیں۔ ان سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ وہ کیسی ستھری تہذیب اور کیسی اُجلی معاشرت تھی جس سے دلّی محروم ہو گئی۔ اور یہ محرومی صرف دلّی ہی کی نہیں ہے، پورے ہندوستان کی ہے، کیونکہ دلّی ہندوستان کا دل ہے۔

شاہد احمد دہلوی

مدیر ماہنامہ "ساقی"

کراچی

۲۲ مئی ۱۹۶۷ء

دلّی کے چٹخارے

شاہ جہاں بادشاہ نے آگرہ کی بچ بچاتی گرمی سے بچنے کے لئے دلّی کو حکومت کا صدر مقام بنانے کے لئے پسند کیا۔ اور جمنا کے کنارے قلعہ معلّٰی کی نیو پڑی۔ یہاں ہُو کا عالم تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جمنا کے کنارے کنارے ہلالی شکل میں شہر آباد ہونا شروع ہو گیا۔ ہزاروں مزدور قلعہ کی تعمیر میں لگ گئے۔ ان کے بال بچے، کنبے قبیلے والے سب مل ملا کر لاکھ ڈیڑھ لاکھ آدمی تو ہوں گے۔ ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے سودا سلف بیچنے والے بھی آ گئے۔ گھاس پھونس کی جھونپڑیاں اور کچے مکانوں کی آبادی میں خاصی چہل پہل رہنے لگی۔ لال قلعہ کے پہلو میں دریا گنج کے رُخ متوسلین شاہی اور امیر اُمرا کے محلات، ڈیوڑھیاں اور حویلیاں بننی شروع ہو گئیں۔ ادھر قلعہ کے سامنے پہاڑی پر جامع مسجد اُبھرنی شروع ہوئی۔ شہر کے بازاروں کے نقشے بنے۔ جہاں اب پریڈ کا میدان ہے یہاں اُردو بازار، خانم کا بازار اور خاص بازار تھا۔ چاندنی چوک بھی تھا اور قلعہ کے چوک پر ختم ہوتا تھا۔ جا بجا نہروں اور باغوں سے شہر کو سجایا گیا تھا۔ جب قلعہ کی تعمیر مکمل ہوئی اور بادشاہ نے اس میں نزول اجلال فرمایا تو شاہ جہاں آباد سج سجا کر دلہن بنا۔

پہلا دربار ہوا تو بادشاہ نے خزانے کا منہ کھول دیا۔ مغل شہنشاہوں کی بے انتہا دولت پانی کی طرح بہنے لگی اور رعایا فارغ البال اور مالا مال ہو گئی۔ بادشاہ کے حکم کے مطابق بازاروں میں دنیا زمانے کی چیز موجود۔ اس کے علاوہ فرمان ہوا کہ روزمرہ سودا گلی گلی اور کوچے کوچے پھیری والے آواز لگا کر بیچیں، چنانچہ دلّی میں یہی دستور چلا آتا تھا کہ گھر بیٹھے ایک پیسے سے لیکر ہزار روپے کی چیز پھیری والوں سے بازار کے بھاؤ خرید لو۔ اصل میں پردہ نشین خواتین کی آسائش بادشاہ کو منظور تھی کہ جن کا جی چاہے اپنی ڈیوڑھی پر ضرورت کی چیز لے لے۔ دلّی کی عورتیں بیٹی کا پورا جہیز گھر بیٹھے خرید کر جمع کر لیا کرتی تھیں گھر سے قدم نکالنا بُرا سمجھا جاتا تھا۔ جس گھر میں ان کا ڈولا آتا تھا اس گھر سے ان کی کھاٹ ہی نکلتی تھی۔

کنجڑے، قصائی، کسیرے، ٹھٹیرے، قلعی گر، بڑھئی، کھٹ بنے، بزاز، منہیار، فصل کا میوہ اور رُت کا پھل بیچنے والے، حد یہ کہ پھول والے تک بڑی دلکش آواز لگاتے تھے اور گلی گلی سودا بیچتے پھرتے تھے، ان کی آوازیں پھر کبھی آپ کو سنائیں گے، اس وقت تو صرف ایک آواز سن لیجیے:

"ریشم کے جال میں ہلایا ہے، نکتیاں بنا قدرت کا اُودا بنا جلیبا کھا لو"

ایک تو بول دلکش، اس پر ترنم غضب۔ جی اوبدا کر یہی چاہتا ہے کہ سودے والا خالی نہ جانے پائے۔ گنڈے دمڑی کی اوقات ہی کیا؟ جھٹ آواز دی "اے بھئی جلیبے والے، یہاں آنا" "اچھاؤا" کہہ کر وہ ڈیوڑھی پر آ گیا۔ "ہاں بوا، کیا حکم ہے؟"

"اے بھئی حکم اللہ کا۔ دھیلے کا جلیبا دے جاؤ۔"

پھیری والا دھیلے کے ڈھیر سارے شہتوت دے گیا۔ اچھے زمانے، سستے سمے، پیسے میں چار سودے آتے تھے۔ دلّی کے دل والے سدا کے چٹورے ہیں۔ شاید اس زبان کے چٹخارے کے ذمہ دار یہی چٹ پٹے پھیری والے ہیں جن کی سریلی آوازیں دل کو کھینچتی ہیں۔ شاید ہی کوئی سودے والا ہو جو کسی شوم کے گھر سے خالی جاتا ہو۔ دھیلی پاؤلا ہر گلی سے مل جاتا ہے۔ باہر والے دلّی والوں کے یہ طور طریقے دیکھتے تو ان کی آنکھیں پھٹتیں۔ شاہی ۱۸۵۷ء کے ساتھ ختم ہوئی مگر دلّی والوں کی زبان کا چٹخارہ اور شاہ خرچیاں پھر بھی نہ گئیں۔

زبان کے چٹخارے کا ذکر آیا ہے تو اس شہر والوں کے ایک اسی پہلو کو لے لیجیے۔ دلّی والوں کو اچھا کھانا اور طرح طرح کے کھانوں کا شوق تھا۔ یہ شوق انہیں ورثے میں ملا تھا۔ اگلے دلّی والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو بادشاہ سے بالواسطہ وابستہ نہ ہو۔ بادشاہ کی دولت میں سے حصہ رسد سب کو پہونچتا تھا۔ مہنگائی نام کو نہ تھی۔ روپے پیسے کی طرف سے فراغت، بے فکری سے کماتے تھے اور بے فکری سے اُڑاتے تھے۔ اور باتوں کی طرح کھانے پینے میں بھی قلعہ والوں کی تقلید کی جاتی تھی۔ ہر قسم کے کھانے رکابدار اور باورچیوں سے تیار کرائے جاتے تھے ہفت ہزاری سے لے کر ٹکے کی اوقات والے تک ہر ایک کو خود بھی اپنے ہاتھ کا کمال دکھانے کا شوق تھا۔ آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ نے کئی کھانے ایجاد کیے جن میں سے مرچوں کا دلیہ آج بھی دلّی والوں کے گھروں میں پکایا جاتا ہے۔ غریبوں میں اب بھی کسی کسی کے ہاں طاہری ایسی پکتی ہے کہ بریانی اس کے آگے ہیچ ہے۔ کبھی ان کے ہاں سونگ پلاؤ یا یخنی پلاؤ کھانے کا اتفاق ہو تو انگلیاں ہی چاٹتے رہ جایئے۔ ماش کی دال ایسی

مزے دار کہ کوئی اور لگا دن اس سے لگا نہیں کھاتا۔

گھروں کے علاوہ بعض بازار کے دکانداروں نے کسی ایک چیز میں ایسا نام پایا کہ آج تک ان کی مثال دی جاتی ہے۔ مثلاً گھنٹے والا حلوائی، چڑیاوالا کبابی، سرکی والوں کا کھیر والا، پائے والوں کے چچی کبابی، قابل عطار کے کوچے کا حلوہ سوہن والا، شاہ گنج کا نواب قلفی والا، فراش خانے کا شابو بھٹیارا، لال کنویں کا حاجی نانبائی اور چاندنی چوک کا گنجی نہاری والا۔ یہ وہ نام ہیں جو دِلّی میں زبان زدِ عام تھے۔ ورنہ شاید ہی کوئی محلہ ایسا ہو جس میں ان سب سودے بیچنے والوں کی دکانیں نہ ہوں مشہور دکانداروں کے ہاں سودا سُتھرا صاف ستھرا، نفیس اور ذائقہ دار ہوتا ہے۔ پشتہا پشت سے ان کے ہاں یہی کام ہوتا چلا آتا ہے۔ ان کے خاندانی نسخے ان کے سینوں میں محفوظ رہتے ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ ہر کاروبار کی طرح ان کے بھی چند بھید ہوتے ہیں۔ عوام کے اس نظریے نے اتنی شدت اختیار کی کہ طرح طرح کی روائتیں اور افواہیں شہر میں پھیل گئی تھیں۔

چچا کبابی گولے کے کباب ایسے بناتے تھے کہ سارا شہر ان پر ٹوٹا پڑتا تھا۔ پائے والوں کے رخ جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پہلو میں ان کا ٹھیہ تھا۔ چچی کے دادا کے کباب بادشاہ کے دسترخوان پر جایا کرتے تھے۔ شہر میں مشہور تھا کہ چچا کے دادا جیسے کباب نہ تو کسی نے بنائے اور نہ آئندہ بنائے گا۔ ان میں کچھ ایسا سلونا پن پایا جاتا تھا کہ کھانے والا ہونٹ چاٹتا رہ جاتا تھا۔ ہم نے اکثر بڑے بوڑھوں سے پوچھا کہ آخر ان کبابوں میں اور ان کبابوں میں فرق کیا ہے؟ وہ کہتے ''میاں چپکے ہو جاؤ۔ کچھ کہنے کا مقام نہیں؟''

''آخر کچھ تو بتایئے''

''میاں سمجھے بھی یہ سلونا پن کاہے کا ہوتا تھا؟''

''نمک کا ہوتا ہوگا''

''اُونہہ۔ اماں آدمی کا گوشت گھلتا تھا، آدمی کا''

''آدمی کا گوشت؟''

''اور نہیں تو کیا۔ جب وہ پکڑا گیا ہے اور اس کے گھر کی تلاشی ہوئی ہے تو سینکڑوں کھوپریاں تہہ خانے میں سے نکلیں۔''

''آپ نے خود دیکھا تھا؟''

"خود تو نہیں دیکھا، البتہ کان گنہگار ہیں"

"روزانہ آدمی غائب ہوتے رہیں اور کوئی انہیں تلاش نہ کرے؟"

"کیا پتہ چل سکتا ہے؟ آدمیوں سے دنیا بھری پڑی ہے"

"مگر کھوپڑیاں آخر تہہ خانے میں کیوں بھر رکھی تھیں؟"

"اوہو بھئی مجھے کیا معلوم۔"

"مگر"

"اگر مگر کچھ نہیں۔ تمہیں تو عادت ہی حجت کرنے کی ہے۔"

ناراض ہو کر چلے گئے۔

لاحول ولا قوۃ۔ بھلا یہ بھی کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ سچ ہے افواہوں کی دیوی بڑی بھیانک ہوتی ہے جو اپنی ہزاروں خاموش لگی ہوئی زبانوں سے ہوا میں رس گھولتی رہتی ہے۔

اصل میں اجزائے ترکیبی کے صحیح اور خاص تناسب کی وجہ سے ایک مخصوص ذائقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر تاؤ بھاؤ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بھلا کھیر ایسی کونسی انوکھی چیز ہے؟ گھر گھر پکتی ہے۔ مگر سرکی والوں کی دکان کے پیالوں میں کچھ اور ہی مزہ ہوتا تھا۔ وہی دودھ، چاول اور شکر کا آمیزہ ہے، مگر تناسب اور تاؤ ہی تو ہے، یہ معلوم ہوتا تھا کہ دولت کی چاٹ کھا رہے ہیں۔

شابو بھٹیارے کے ہاں کا شوربہ مشہور تھا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ:

"ہمارے ہاں بادشاہی وقت کا شوربہ ہے۔"

"ارے بھئی بادشاہی وقت کا؟ یہ کیسے؟"

"اجی حضت یہ ایسے کہ ہم شوربے میں سے روزانہ ایک پیالہ بچا لیتے ہیں، اور اگلے دن کے شوربے میں ملا دیتے ہیں۔ یہ دستور ہمارے ہاں سات پیڑھی سے چلا آ رہا ہے۔ یوں ہمارا شوربہ شاہی زمانے سے چلا آتا ہے۔"

حاجی نانبائی کے ہاں یوں تو شادی بیاہ کے لئے خمیری کلچے اور شیرمال تیار کئے جاتے اور ایسے مُلائم کہ ہونٹوں سے توڑ لو، مگر ان کا ہنر دیکھنا ہو تو فرمائش کر کے پکوا لیجئے۔ روٹیوں کے نام ہی سُن لیجئے:

روغنی روٹی، بری روٹی، قیمہ بھری روٹی، بیسنی روٹی، گاؤ دیدہ، گاؤ زبان، باقر خانی، شیرمال، بادام کی روٹی، پستے کی روٹی، چاول کی روٹی، گاجر کی روٹی، مصری کی روٹی، غوٹی روٹی، نان معبہ، نانِ

گلزار، نانِ قماش، نانِ تاقان، روے کے پراٹھے، میدے کے پراٹھے، گول، چوکور، تکونے، غرض روٹی کی کوئی شکل اور ترکیب ایسی نہیں ہے جوان کے تندور میں تیار نہ ہوسکتی ہو۔

حاجی نان بائی کا ذکر آیا تو بادشاہ بخیر میاں گھنٹے نہاری والے یاد آ گئے۔ اصل میں نہاری والے نانبائی ہی ہوتے ہیں، بھٹیارے نہیں ہوتے۔ نہاری تو جاڑوں میں کھائی جاتی ہے۔ گرمیوں اور برسات میں نہیں کھائی جاتی، خالی دنوں میں نہاری والے اپنا تندور گرم کرتے ہیں اور روٹی پکانے پر ان کی گزراوقات ہوتی ہے۔ ۴۷ء میں دلّی اُجڑنے سے پہلے تقریباً ہر محلّے میں ایک نہاری والا موجود تھا۔

لیکن اب سے ۴۰/۵۰ سال پہلے صرف چار نہاری والے مشہور تھے۔ انہوں نے شہر کے چاروں کھونٹ داب رکھے تھے۔ گھنٹے کی دکان چاندنی چوک میں نل کے کٹرے کے پاس تھی، اور شہر میں اس کی نہاری سب سے مشہور تھی۔

دلّی سے باہر اکثر لوگ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ نہاری کیا ہوتی ہے۔ بعض شہروں میں یہ لفظ کچھ اور معنوں میں مستعمل ہے۔ مثلاً چوپایوں کو، خصوصاً گھوڑوں کو تقویت دینے کے لئے ایک گھولوا پلایا جاتا ہے جسے نہاری کہتے ہیں۔ بعض جگہ پایوں کو نہاری کہا جاتا ہے۔ دلّی میں یہ ایک خاص قسم کا سالن ہوتا تھا جو بڑے اہتمام سے تیار کیا جاتا تھا اور بازار میں فروخت ہوتا تھا۔ اس کے پکانے کا ایک خاص طریقہ ہے اور اس کے پکانے والے بھی خاص ہوتے ہیں۔ نہاری کو آج سے نہیں ۱۸۵۷ء کے پہلے سے دلّی کے مسلمانوں میں بڑی اہمیت حاصل ہے یوں تو گھر میں بھی اور باہر بھی سینکڑوں قسم کے قورمے پکتے ہیں مگر نہاری ایک مخصوص قسم کا قورمہ ہے جس کا پکانا سوائے نہاری والوں کے اور کسی کو نہیں آتا اس کی پخت وپز کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسے ساری رات پکایا جاتا ہے، اور پکنے کی حالت میں ہر وقت اس کا تاؤ مساوی رکھا جاتا ہے۔ اس کام کے لئے بڑی مشق ومہارت کی ضرورت ہے۔ تیسرے پہر سے اس کی تیاری شروع ہوتی ہے۔ دکان کی دہلیز کے پاس زمین میں گڑھا کھود کر ایک گہر چولہا یا بھٹی بنائی جاتی ہے۔ اور اس میں ایک بڑی سی دیگ اس طرح اتار کر جمادی جاتی ہے کہ صرف اس کا گلا باہر نکلا رہ جاتا ہے۔ چولہے کی کھڑکی باہر کے رخ کھلتی ہے۔ اس میں سے ایندھن ڈالا جاتا ہے جو دیگ کے نیچے پہونچ جاتا ہے۔ آگ جلانے کے بعد جیسے قورمے کا مسالا بھونا جاتا ہے گھی میں پیاز داغ کرنے کے بعد دھنیا، مرچیں، لہسن، ادرک اور نمک ڈال کر نہاری کا مسالا بھونا جاتا ہے۔ جب مسالے میں جان پڑجاتی ہے تو گوشت کے پارچے، خصوصاً ادلے ڈال کر، نہیں

بھونا جاتا ہے۔ اس کے بعد اندازے سے پانی ڈال کر دیگ کا منھ بند کر دیا جاتا ہے۔

پکانے والے کو جب ادھ گلے گوشت کا اندازہ ہو جاتا ہے تو دیگ کا منھ کھول کر اس میں پچیس تیس بھیجے اور اتنی ہی نلیاں یعنی گودے دار ہڈیاں ڈال دی جاتی ہیں۔ شوربے کو لبدڑا بنانے کے لئے آلن ڈالا جاتا ہے۔ پانی میں آٹا گھول کر آلن بنایا جاتا ہے۔ اب دیگ کے منھ پر آٹا لگا کر کونڈے سے بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ دیگ ساری رات پکتی رہتی ہے اور اس کا تاؤ دھیما رکھا جاتا ہے۔ بارہ چودہ گھنٹے پکنے کے بعد جب علی الصبح دیگ پر سے کونڈا ہٹایا جاتا ہے تو دور دور تک اس کی اشتہا انگیز خوشبو پھیل جاتی ہے۔

سب سے پہلے دیگ میں سے بھیجے اور نلیاں نکال کر الگ لگن میں رکھ لی جاتی ہیں۔ پھر گاہکوں کا بھگتان شروع ہوتا ہے۔ یہ کھانا چونکہ دن کے شروع ہوتے ہی کھایا جاتا ہے اس لئے اس کا نام نہار کی رعایت سے نہاری پڑ گیا۔

ہاں تو ذکر تھا گنجے نہاری والے کا۔ دلی والوں کے علاوہ قرب و جوار سے بھی لوگ ان کی نہاری کھانے آیا کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں ہمیں بھی چند بار گنجے صاحب کی نہاری سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ ان کی دکان گجردم کھلتی تھی اور کھلنے سے پہلے گاہک موجود ہوتے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں پتیلی، کوئی بادیہ، کوئی ناشتہ دان سنبھالے سردی میں سکڑتا، سوں سوں کرتا ٹہل لگا رہا ہے۔ بس تلی ایک دیگ پکتی اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ذرا دیر سے پہونچے تو میاں گنجے نے معذرت کے لہجے میں کہا۔

"میاں اب خیر سے کل لیجئے گا، اور ذرا سویرے آیئے گا۔"

نہاری کے مسالوں کا وزن اور پکانے کا طریقہ اوروں کو بھی معلوم ہے مگر وہ ہاتھ اور نگاہ جو استاد گنجے کو میسر تھی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ اکثر لوگ خود ان سے دریافت بھی کرتے تھے کہ "آخر استاد کیا بات ہے کہ دوسروں کے ہاتھ کی نہاری میں یہ لذت نہیں ہوتی؟" وہ ہنس کر کہہ دیا کرتے تھے کہ "میاں بزرگوں کی جوتیوں کا صدقہ اور حضرت سلطان جی کا فیض ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا؟"

استاد گنجے کے کردار پر روشنی ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ کچھ ان کا سراپا بھی بیان کر دیا جائے۔ "گنجے" کے نام سے خواہ مخواہ ذہن میں ایک کراہت سی پیدا ہوتی ہے۔ نفیس مزاج اور نازک خیال لوگ تو گنجے کے ہاتھ کا پانی پینا بھی گوارہ نہیں کر سکتے۔ لیکن استاد کو تو سرے سے گنج کی بیماری تھی ہی نہیں۔ اصل میں ان کی چندیا کے بال جھڑ گئے تھے اور ٹانٹ صاف ہو کر تا مڑ انکل آیا تھا، جس کے تین طرف چار انگل چوڑی بالوں کی ایک جھالر سی تھی۔

دلّی کے چلبلی طبیعت والے بھلا کب چوکنے والے تھے۔ گنجے کی پھبتی ان پر کسی، اور یہ پھبتی ایسی جمی کہ چپک کر رہ گئی۔ گندمی رنگ کا گول چہرہ، خشخشی ڈاڑھی، بڑی بڑی چمکدار مگر حلیم آنکھیں، باوجود نہاری فروشی کے ان کا لباس ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا۔ لٹھے کا شرعی پاجامہ، نیچا کرتہ، کرتے پر بہت صوفیانہ چھینٹ کی نیم آستین، سر پر صافہ، کسرتی اور بھرا بھرا بدن، کوئی دیکھے تو سمجھے کہ بڑے تڑانٹ ہیں، بات بات پر کاٹنے کو دوڑتے ہوں گے، مگر ان کی طبیعت اس کے بالکل برعکس تھی۔ بالعموم نامی دکاندار بڑے بدمزاج اور غصیل ہوتے ہیں، جیسے چچا کبابی کہ بڑے ہتھ چھٹ تھے اور مار پیٹ تک سے نہیں چوکتے تھے۔ استاد گنجے بڑے خلیق اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے ہم نے کبھی سنا نہیں کہ انہیں تاؤ آیا ہو، کبھی ان کے منھ سے کوئی ناشائستہ کلمہ نکلا ہو۔ ہر گاہک سے چاہے وہ آنے دو آنے کا ہو چاہے روپے دو روپے کا بڑی نرمی سے بات کرتے اور مستقل گاہکوں کو تو اپنا مہمان سمجھتے تھے۔

استاد گنجے کے کردار میں سب سے نمایاں چیز ان کا حلم اور انکسار تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاء سے جنہیں دلّی والے سلطان جی کہتے ہیں، استاد گنجے کو بڑی عقیدت تھی۔ اور یہ سلطان جی ہی کا روحانی تصرّف تھا کہ استاد کا دل گداز ہو گیا تھا۔ وہ اپنی ساری کمائی غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کی امداد کرنے میں صرف کر دیا کرتے تھے۔

سلطان جی کی سترھویں میں اپنی دکان بڑے اہتمام سے لے جاتے تھے اور سادے دنوں میں جمعرات کے جمعرات درگاہ میں حاضری پابندی سے ہوتی تھی روپے پیسے سے خوش تھے مگر دلّی سے سلطان جی پیدل جایا کرتے تھے۔ ہر موسم کے لحاظ سے محتاجوں کو کپڑا تقسیم کرتے تھے۔ ہر مہینے گیارہویں کی تیاری ان کے ہاں بڑی دھوم سے ہوتی۔ دن بھر لنگر جاری رہتا جمعرات کو ان کی دکان پر فقیروں کی لنگتار رہتی اور سب کو پیسہ ٹکا ملتا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دکانداری شروع کرنے سے پہلے اللہ نام کا حصہ نکالا کرتے۔ اگر کوئی محتاج موجود ہوا تو پہلے اسے کھلایا ورنہ نکال کر الگ رکھ دیا۔ پھر دیگ میں سے چمچے اور تلیاں نکال کر طباق میں رکھیں، تار اور روغن کو ایک بڑے بادیئے میں الگ نکال لیا۔ اس کے بعد دکانداری شروع ہوئی۔

دکان میں بیسیوں پتیلیاں، دیگچے اور برتن رکھے ہیں۔ کسی میں دو روپے کسی میں روپیہ کسی میں بارہ آنے، کسی میں آٹھ آنے پڑے ہیں۔ شوقین اور قدردان رات ہی کو اپنے اپنے برتن دے گئے ہیں کہ صبح کو مایوس نہ ہونا پڑے۔ سب سے پہلے انہی برتنوں کی طرف استاد کی توجہ ہوتی ہے۔ بڑی تیزی اور پھرتی

سے ہاتھ چلاتے ہیں ادھر گاہکوں کے ٹھٹ لگے ہیں۔ ان کی آسائش کا بھی انہیں خیال ہے۔ گاہک بھی جانتے ہیں کہ جن کے برتن پہلے آگئے ہیں انہیں نہاری پہلے ملے گی۔ کسی باہر والے نے، جو یہاں کے قاعدے قرینے نہیں جانتا، جلدی مچائی تو استاد نے رسان سے کہا "ابھی دیتا ہوں۔ جو پہلے آیا ہے اُسے اگر پہلے نہ دوں گا تو شکایت ہوگی۔"

برتنوں کی لین ڈوری ختم ہوئی تو گاہکوں کا بھگتان شروع ہوا۔ دو روپے سے دو پیسے تک کے خریدار موجود، اور سب کو حصہ رسد ملتا ہے۔ تین گھنٹے میں ڈیڑھ دو سو گاہکوں کو نہاری دی اور دیگ سخی کے دل کی طرح صاف ہوگئی۔ اب جو کوئی آتا ہے تو بڑی انکساری سے کہتے ہیں "میاں معافی چاہتا ہوں۔ میاں اب کل دوں گا، اللہ نے چاہا تو۔ اللہ خیر رکھے، کل کھائیے گا۔"

سبحان اللہ، کیا اخلاق تھا اور کیسی وضعداری تھی۔ آگ اور مرچوں کا کام اور اس قدر ٹھنڈے اور میٹھے! دوسروں کو دیکھئے گالی گلوج، دھکا مکّی اور لپاڈگی کی نوبت رہتی ہے۔

استاد گنجے کے ہاں دو قسم کے گاہک آتے تھے۔ ایک وہ جو خرید کر لے جاتے تھے، اور دوسرے وہ جو وہیں بیٹھ کر کھاتے تھے۔ وہیں بیٹھ کر کھانے والوں کے لئے دکان کے اوپر کمرے میں نشست کا انتظام تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا کمرہ تھا جس میں چٹائیاں بچھی رہتی تھیں۔ اس کمرے میں ایک ایک دو دو آدمی بھی کھاتے تھے اور دس دس بارہ بارہ کی ٹولیاں بھی۔ استاد سے جتنا جتنا اور جو جو سودا کہا جائے اتنا ہی دیتے تھے، اپنی طرف سے اس میں کمی بیشی نہیں کرتے تھے۔ مستقل گاہکوں کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ بڑے مزاج شناس تھے اور ان کی یادداشت بھی غضب کی تھی۔ صورت دیکھتے ہی کہتے "فرمایئے حکیم صاحب کیا حکم ہے؟ حکیم صاحب قبلہ تو خیریت سے ہیں؟" "ہاں ڈپٹی صاحب، ارشاد؟ بڑے ڈپٹی صاحب کے دیدار تو روزانہ شام کو ہو جاتے ہیں۔" "ہاں میاں، آپ فرمایئے؟ وکیل صاحب سے میرا سلام عرض کیجئے گا۔"

استاد گنجے کی نہاری دلّی کے سب شرفا کے ہاں جاتی تھی۔ ان کی سات پشتیں اسی دلّی میں گزری تھیں۔ سارا شہر ان کو جانتا تھا۔ اور یہ بھی دلّی کی دائی بنے ہوئے تھے۔ شہر آبادی اور شہر آبادی بعد کے سارے خاندان اور ان کے روداد افراد انہیں ازبر تھے۔ کبھی موج میں ہوتے تو مزے مزے کی باتیں بھی کر لیتے۔ "جی چاہتا ہے کہ ڈپٹی صاحب کو ایک دن تحفہ نہاری کھلاؤں۔ اللہ نے چاہا تو اب کے وہ نہاری کھلاؤں کہ چلّے کے جاڑوں میں پسینہ آجائے۔"

"ہاں میاں تو آپ کے لئے کیا بھیجوں؟"

"استاد، چھ آدمیوں کے لئے نہاری کمرے پر۔"

بس اس سے زیادہ آپ کو کہنے کی اور ان کو سننے کی ضرورت نہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ آپ کی نہاری کا کیا لوازمہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کے ساتھی بھی آپ کے ہم مذاق ہی ہوں گے۔ فی کس پاؤ بھر نہاری کے اندازہ سے انہوں نے نہاری ایک بڑے سے بادیے میں نکالی۔ گھی آدھ پاؤ فی کس کے حساب سے داغ کرنے انگیٹھی پر رکھ دیا۔ اتنے گھی تیار ہوا انہوں نے چھ بھیجے تو ڑ صاف صوف کر نہاری میں ڈال دیئے اور بارہ نلیاں بھی اس میں جھاڑ دیں۔ اوپر سے کڑ اکڑ اتا گھی ڈال تانبے کی رکابی سے ڈھک دیا۔ لڑکے کو آواز دے کر پہلے غوریاں اور چمچے اُوپر بھیجا۔ لڑکے نے اُوپر پہونچ کر کھونٹی پر سے کھجور کا بڑا سا گول دستر خوان بیچ میں بچھا دیا اور اس پر غوریاں چن دیں۔ پھر لپک کر نیچے آیا اور نہاری کا بادیہ احتیاط سے اُوپر پہونچا دیا۔ پھر آفتابہ اور سلفچی لے کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ اتنے وہ ہاتھ دھلائے دوسرا لڑکا تھئی کی تھئی خمیریاں اور ایک رکابی میں گرم مسالہ، ادرک کی ہوائیاں، ہری مرچیں اور کھٹا رکھ گیا۔ سب دستر خوان پر ہو بیٹھے تو وہی لڑکا دہر دہر جلتی انگیٹھی ایک کنی میں ان کے پاس رکھ گیا۔ لڑکا روٹی سینک سینک کر دیتا جاتا ہے۔ دوستوں کے قہقہے چہچہے ہوتے جاتے ہیں۔ گھی نے نہاری کی لذت بڑھانے کے علاوہ مرچوں کا دف بھی مار دیا ہے۔ نہاری ذرا ٹھنڈی ہوئی اور غوری انگیٹھی پر رکھ گئی۔

لیجئے، استاد نے آپ کے دوستوں کے لئے ایک خاص تحفہ بھیجا ہے۔ تنور میں سے گرم گرم روٹیاں نکال کر گھی میں ڈال دیں اور روٹیاں گھی پی کر ایسی خستہ اور ملایم ہو گئی ہیں جیسے روئی کے گالے۔ واہ واہ! کیا مزاج دانی اور ادا شناسی ہے! جبھی تو آج تک گنجے نہاری والے کو دلی والے یاد کرتے ہیں۔

یہ تو خیر امیروں کے چونچلے ہیں۔ اصل میں نہاری غریب غربا کا من بھاتا کھاجا ہے۔ دستکار، مزدور اور کاریگر صبح صبح کام پر جانے سے پہلے چار پیسے میں اپنا پیٹ بھر لیتے تھے۔ دو پیسے کی نہاری اور دو پیسے کی دو روٹیاں۔ ان کے دن بھر کے سہارے کو کافی ہوتیں گھر میں علی الصبح چار پیسے میں بھلا کیا تیار ہو سکتا ہے؟ سستے اور بابرکت سمے تھے۔ ایک کماتا دس کھاتے تھے۔ اب دس کماتے ہیں اور ایک کو نہیں کھلا سکتے۔ وہ وقت نہیں رہے۔ میاں گنجے نہاری والے بھی گزری ہوئی بہاروں کی ایک چٹ پٹی داستان بن کر رہ گئے۔

سدا رہے نام اللہ کا

دلّی کے دل والے

"دلّی کی دل والی، منہ چکنا پیٹ خالی۔"

یہ جو مثل مشہور ہے تو اس میں بہت کچھ صداقت بھی ہے۔ روپے پیسے والوں کا تو ذکر ہی کیا؟ انہیں تو ہر نعمت چٹکی بجاتے میں مہیا ہو جاتی ہے۔ دلّی کے غریبوں کا یہ حوصلہ تھا کہ نہوتی میں دھڑلے سے خرچ کرتے، کل کی فکر انہیں مطلق نہ ہوتی تھی۔ کوڑی کفن کو وہ لگا نہ رکھتے تھے۔ ان کا کہنا یہ کہ جس نے دیا تن کو وہی دے گا کفن کو۔ عجب دلّی والے بے فکرے تھے۔ لنگوٹی میں پھاگ کھیلتے تھے۔ تن کو نہیں لتہ، پان کھائیں البتہ۔ ذرا سی بات کے پیچھے راکھ کا گھر خاک کر دیتے۔ گھر پھونک تماشا دیکھنا انہیں خوب آتا تھا۔ مگر ان کی کمائی میں برکت بھی ایسی تھی کہ پھر ہر بھر ہو جاتی۔ اماں بھٹیارے کی بھی کوئی اوقات ہے؟ بیٹی کی چھٹی میں سونے چاندی کی کھچڑی بھیجی تھی۔ چاندی کے چاول اور سونے کی دال! پہاڑ گنج کے ایک سادہ کار نے بیٹے کی بیاہ میں چاندی کی چتی ہوئی تشتریاں تقسیم کیں جن میں ایک سونے کا پھول جڑا ہوا تھا۔ ان تشتریوں میں پاؤ پاؤ بھر کھوئے کے پیڑے، اوپر سے ایک ریشمی رومال بندھا ہوا۔ اسی برات میں بیٹی والوں نے مینا کاری کی بیضوی ڈبیوں میں بُن دھنیا بانٹا تھا۔ سوئی والوں کے سقوں میں ایک شادی ہوئی تو کئی ہزار کی پوری برادری کو دہرا کھانا کھلایا گیا۔ پھر بھنگیوں میں گھر گھر حصے بھیجے گئے۔ دو قسم کا سالن میٹھے گھیے کا اور قورمہ۔ شیر مال اور خمیری روٹی۔ بڑی بڑی لاکھی رکابیوں میں بریانی اور زردہ۔ ایک ایک جوڑ فیرنی کا۔ ایک گھر میں اگر دس بیاہے ہیں تو دسوں کے دس حصے۔ انہیں دیکھ کر تو شہر آبادی کے تورے یاد آتے تھے۔ ہم نے تو تورے دیکھے نہیں، ہاں بڑی بوڑھیوں سے اس کا ذکر ضرور سنا ہے کہ ایک تورا کم از کم بیس آدمیوں کے لئے کافی ہوتا تھا۔

سقّے، کنجڑے، نائی، قصائی، بھٹیارے، قلعی گر، پٹیے، کندلہ کش، ورق کوب، سادہ کار، نیاریے، غرض

کہ سارے کرخندار اور دستکار اسی دریا دلی سے روپیہ خرچ کرتے تھے۔ اور تو اور ایک دفعہ ایک برات دیکھی۔ روشنی کے جھاڑ بے شمار، ان کے پیچھے انگریزی بینڈ باجہ، ان کے پیچھے نفیری کا ایک طائفہ، اس کے بعد ایک طوائف مع سفر دار برات چند قدم چلتی اور رک جاتی۔ طوائف مبارک باد کے دو بول گاتی، گت بھرتی، تھئی تھئی ناچتی، بیل لیتی، سلام کرتی اور برات آگے بڑھ جاتی۔ گہنا پہنے ہوئے ٹٹو پر ننھا سا دولہا سوار۔ دولہا کے پیچھے پیچھے دولہا کے ابا زری کی چھوٹی باڑھ کی گول ٹوپی سر پر، زربفت کی اچکن اور سفید ساٹن کا آڑا پاجامہ پہنے اسی گھوڑے پر سوار۔ دولہا کے گھوڑے کے پیچھے پالکی جس پر چمکتے دوپٹے پڑے ہوئے۔ آخر میں مسہری اور جہیز کی سنتار، کھانچوں میں چھچھاتے ہوئے برتن رکھے ہوئے۔ ہر دس قدم پر روشنی کا ایک ہنڈا۔ پالکی اور دولہا پر سے مٹھیاں بھر بھر کے ریزگاری کی بکھیر ہوتی جاتی ہے۔ کنگلے لوٹتے جاتے ہیں، ایک اوپر ایک گدا گدڑ رہا ہے۔ یہ کسی کی برات نہیں چڑھ رہی۔ گڈے گڑیا کا بیاہ ہے۔ اس میں شادی بیاہ کی ساری رسمیں پوری کی جائیں گی۔ لاڈ پیار اور من تان اولاد کا اتنا تو ہو۔

وہ دیکھیے ضیا محل کی طرف سے ایک بارات آتی دکھائی دے رہی ہے۔ نفیری کی تانیں اڑ رہی ہیں۔ گھوڑے پر ایک صاحب مرغ زریں بنے بیٹھے ہیں۔ ان کے آگے ایک بچہ ہے تین چار سال کا۔ سر پر سہرا بندھا ہے۔ بدن میں بدھی ہے۔ اوں یہ کیسی برات ہے؟ اجی حضت، یہ برات نہیں ہے۔ بچہ گھوڑی چڑھا ہے۔ اس کی ختنہ ہوئی تھی۔ اچھے ہونے کی خوشی منائی جا رہی ہے۔ ختنہ کو دلی والے ''مسلمانیاں'' کہتے ہیں۔ صاحبزادے کی مسلمانیاں ہوئی ہیں۔ مسجد کو سلام کرنے جا رہے ہیں۔ یہ صاحب جو بچے کو گھوڑے پر لیے بیٹھے ہیں ابا ہیں پیچھے ڈولیوں میں اماں ہیں اور رشتے کنبے کی عورتیں ہیں۔ یہ طاق بھریں گی اور چاندی کے چراغ جلائیں گی۔ لو بھئی سنتوں سے ادا ہوئے، بھلا خوشی کیوں نہ منائیں قرض دام بھی اللہ اتروا دے گا۔

چوپائے میں سماتا نہیں دم میں باندھے چھاج۔ دلی کے غریبوں کی کھنڈلوں میں آدمیوں کے رہنے کے لیے جگہ کم ہوتی تھی، کجا یہ کہ ان میں جانور بھی پالے جائیں؟ مگر شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس میں دو چار جانور پلے ہوئے نہ ہوں۔ ہر گھر میں کبوتروں کے دس پانچ جوڑے ہوتے تھے۔ کبوتر بہت ہی بھولا اور بے ضرر جانور ہے اس لیے اسے معصوم سمجھا جاتا ہے، اور بعض لوگ تو اسے سید سمجھتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جس گھر میں کبوتر ہوتے ہیں اس گھر میں بیماری نہیں آتی۔ گھٹے ہوئے گھروں میں ہوا کا گذر کہاں؟ کبوتروں کے اڑتے رہنے سے ہوا صاف ہوتی رہتی ہے۔ کبوتروں کا شوق اور کبوتروں کی

مانگ بڑھی تو کبوتر بازوں نے نئی نسل تیار کرلی۔ چوک سیڑھیوں پر بائیں طرف ہر قسم کے کبوتروں کے کھانچے اور پنجرے بھرے رہتے تھے۔ جو نسل آپ پسند فرمائیں مول تول کر کے لے لیں۔ بیسیوں قسم کے کبوتر ہوتے تھے۔ اب تو ان کے پورے سے نام بھی یاد نہیں رہے۔ چند نام یہ ہیں۔

لال بند، جنگلا، سفید اپلکہ، تفتہ، کلپوٹیہ، کمریا، تبولیہ، زرد پوٹیہ، لال بند کھیرا، سبز کھیرا، لال جوگیا، لال دیز، سبز دیز، کالا دیز، انجیر دیز، امیری، زمیری، طاؤس، چوئے چندن، کالا لکھی، سبز لکھی، اودا لکھی، سفید لقا، سیاہ لقا، سبز لقا، یاہو سفید، یاہو چوٹی دار، بھاتا، لوٹن، شاور اہر رنگ کا، خال، لال، کالا، سبز، عنابی، کاسنی، بھورا، پٹیہ ہر رنگ کا، تا بڑے، چھیلے، نقاب پوش، گلوئے لکھی، گلوئے ہر رنگ کے، شیرازی، گولے، گرہ باز، کابلی۔

ان میں سے بیشتر خوشنمائی کے لئے رکھے جاتے تھے اور چند اڑانے کے لئے۔ اڑنے والوں کی اڑانوں میں فرق ہوتا تھا۔ بعض ایسے ہوتے تھے جن کی ٹکڑیاں بنائی جاتی تھیں، اور پورے جھلڑ کو ایسے سدھایا جاتا تھا کہ پرا بنا کر دور دور ہو آتے اور کسی اور ٹکڑی میں بھی گھل مل جاتے، مگر ایسے گردان ہو جاتے کہ اکوں ایک اپنی چھتری پر واپس آجاتا۔ اگر ان میں سے کوئی بھٹک کر دوسری ٹکڑی کے ساتھ چلا جاتا تو دوسری ٹکڑی والا اسے چپکے سے پکڑ لیتا۔ پہلی ٹکڑی والا اسے اپنی ہار سمجھتا اور ضرورت سمجھتا تو منھ مانگے دام دے کر دوسری ٹکڑی والے سے واپس لے آتا۔ ورنہ بھٹک جانے والے کبوتر کو اس لائق نہ سمجھا جاتا کہ دوبارہ اسے اپنی ٹکڑی میں شامل کیا جائے۔ جھوٹے کا اعتبار ہی کیا؟

بعض کبوتر ایسے ہوتے ہیں جو دیر تک اڑ سکتے ہیں۔ کبوتر باز انہیں طرح طرح کی غذا کھلا کر تیار کرتے ہیں۔ پھر آپس میں شرطیں لگ جاتی ہیں کہ صبح کو ایک ساتھ کبوتر اڑائے جائیں۔ جس کا کبوتر پہلے اتر آئے وہ ہارا۔ یہ کبوتر سارے سارے دن آسمان کا تارہ بنے اڑتے رہتے اور دونوں وقت ملتے اترتے۔

ایک زمانے میں نامہ بر کبوتر بھی ہوتے تھے۔ ہمارے زمانے میں یہ کبوتر دلی میں نہیں تھے، البتہ جاپان کے ایک اخبار کے دفتر میں ان کا پنجرہ نظر آیا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ خبر رساں کبوتر ہیں۔ اور جب کسی واقعے کی خبر فوراً دینی ہوتی ہے تو ایک پرزہ لکھ کر کبوتر کے پاؤں میں باندھ دیتے ہیں۔ کبوتر سیدھا اڑ کر اپنے اخبار کے دفتر پہونچ جاتا ہے۔ ٹیلیفون کے زمانے میں بھی خبر رساں کبوتر سے کام لیا جاتا ہے۔ سنا ہے کہ کوئی شاہی کبوتر باز تھے جب بادشاہ جمعہ کی نماز کو قلعہ معلی

سے مولا بخش ہاتھی پر سوار ہو کر برآمد ہوتے تو شاہی کبوترباز کبوتروں کی ٹکڑی کو اس خوبی سے اُڑاتا کہ بادشاہ کے سر پر ان کا سایہ رہتا۔

خلیل خان کا بھی قصہ مشہور ہے کہ فاختہ اُڑاتے تھے۔ فاختہ کو ایک بہت کم عقل پرندہ سمجھا گیا ہے۔ اس لئے کہ اگر انہیں اُڑایا جائے تو پھر فاختہ اُڑتی ہی چلی جاتی ہے۔ واپس نہیں آتی۔ مگر اگلے وقتوں میں کوئی صاحب خلیل خان نامی تھے جنہوں نے فاختاؤں کو کبوتروں کی ٹکڑی کی طرح اُڑا کر دکھا دیا۔ یہ تو ہم نے بھی دیکھا کہ ایک صاحب سبک سے ٹھیلے پر ایک پنجرہ پدڑیوں کا لے کر نکلا کرتے تھے۔ جہاں چاہتے پنجرہ کھول کر پدڑیوں کو اڑا دیتے۔ اور جب چاہتے انہیں واپس بلا لیتے۔ یہ پدڑی وہی حقیر چڑیا ہے جس کے بارے میں کہاوت مشہور ہے کہ "کیا پدی کیا پدی کا شوربہ؟" یا ایک مثل اور ہے کہ "باپ نے نہ ماری پدڑی بیٹا تیر انداز"۔

بئے کے بارے میں جو مشہور ہے کہ اسے چھلا دکھا کر چھلا کنوئیں میں اچھال دیجئے۔ وہ چھلے کو پانی تک پہنچنے سے پہلے نکال لاتا ہے، یہ کوئی روایت نہیں بلکہ حقیقت ہے، ہم نے یہ ماجرا اکثر دیکھا ہے۔ بعض لوگوں نے بئے کو ایسا سدھایا کہ اس کی چونچ میں ایک الائچی دے دی اور اشارہ کر دیا، بیا اڑ کر اس کے منہ میں الائچی دے آتا تھا جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہو۔ فال نکالنے والے جو چڑیوں پر پنجرے لئے اور بہت سارے غافے لگائے بیٹھے رہتے ہیں، ان پنجرے میں بھی بیا ہی ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کام کے لئے طوطے کو بھی سدھالیا ہے۔

طوطے تو تقریباً ہر گھر میں پالے جاتے تھے۔ ٹوئیاں سے لے کر پہاڑی طوطے تک سب کو کچھ نہ کچھ بولنا سکھا دیا جاتا تھا۔ مٹھو بیٹے۔ نبی جی بھیجو۔ حق اللہ پاک ذات اللہ" تو ہر طوطا کہنے لگتا تھا۔ کاکتوا بھی صاف صاف بولنے لگتا تھا اور سیٹی تو بڑے زوروں میں دیتا تھا۔

بلبل صرف لڑانے کے لئے پالے جاتے تھے۔ ان کی لڑائی بڑی خوبصورت ہوتی ہے۔ لڑانے کے لئے کٹیرے بھی پالے جاتے تھے۔ انہیں گل دم بھی کہتے تھے۔

بٹیر تھیلیوں میں بند رہتے تھے۔ بٹیر بازوں کو جب بھی فرصت ملتی بٹیر کو مٹھی میں لے لیتے اور پان کی پیک سے اس کا سر رنگتے رہتے۔ شرطیں بد کے بٹیروں پر پالیاں جمائی جاتیں۔ جب آر پار کشتی دیکھنی ہوتی یعنی ایسی جس میں دو میں سے ایک زندہ جائے تو بٹیر کے پنجوں میں چھوٹے چھوٹے چاقو کے پھل باندھ دئے جاتے۔ چونچیں چلتیں اور لاتیں چلتیں یہاں تک کہ ایک کی لات ایسی پڑتی کہ دوسرے کا

پوٹا پھٹ جاتا۔ اس پر بھی زخمی بٹیر لڑتا جاتا، تا آنکہ بے دم ہو کر گر جاتا۔

لڑائی تو مرغوں کی ہوتی تھی اور مرغوں میں اصیل مرغ کی۔ یہ عجیب بے ہنگم مرغ ہوتے تھے۔ بڑے قد آور، گنجے آدمی کی طرح بے بال و پر۔ کلغی غائب۔ لمبی لمبی ٹانگیں۔ ان کی لات اتنی زوردار ہوتی تھی کہ کسی اچھے خاصے آدمی کے پڑ جائے تو ہڈی ٹوٹ جائے۔ کانڑے مرزا کو اکثر دیکھا ہے کہ مرغ کو بغل میں دبائے چلے جا رہے ہیں۔ لوگ کہتے تھے کہ مرزا کے باپ بھی بڑے مرغ باز تھے۔ کانڑے مرزا چند مہینے کے تھے کہ ان کی اماں انہیں کھٹولی پر لٹا کر کام سے دالان میں چلی گئیں۔ کچھ دیر گزری ہوگی کہ ایکدم سے بچے کے بلبلا کر رونے کی آواز سنائی دی۔ جلدی جلدی آکر جو دیکھا کہ بچے کا چہرہ لہولہان ہو رہا ہے اور ایک آنکھ غائب ہے۔ پاس ہی مرزا صاحب کا اصیل مرغ کھڑا دوسری آنکھ پر تاک لگا رہا ہے۔ ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ "ہے ہے میرا بچہ" کہہ کر بچے کو سینے سے لگا لیا اور سر پر برقعہ ڈال ننگے پاؤں ہی محلے کے جراح کی دکان پر جا پہونچیں۔ مرغ نے ایک ڈھیلا نکال کر پورا نگل گیا تھا۔ وہ تو اللہ نے بڑی خیر کی کہ دوسری آنکھ بچ گئی۔ جو مرزا صاحب کی بیوی ذرا چوک جاتیں تو دوسرا ڈھیلا بھی گیا تھا۔ اب تو مرزا کانڑے ہو کر ہی گئے جو اندھے ہو جاتے تو کیا ہوتا؟

اگن یا ہزار داستان پالنے کا بھی دلی والوں کو بہت شوق تھا۔ ان کے پنجروں پر بستیاں چڑھی رہتیں۔ جب اگن چہکتا تو گھنٹوں اس کی چہکار سنی جاتی۔ ہزاروں بولیاں بولتا تھا، اسی لئے ہزار داستان کہلاتا تھا۔ چوک پر اگن بکنے آتے تھے۔ ان کے پنجروں پر گیری کناؤ کے غلاف چڑھے ہوتے تھے۔ شوقین مزاج لوگ بڑی بڑی قیمتیں دے کر خرید لے جاتے تھے۔

کلکتہ کی کالی مینا جو بنگالے کی مینا اور آغا مینا بھی کہلاتی تھی طوطے سے زیادہ صاف بولتی تھی، اور زیادہ باتیں سیکھ جاتی تھی۔ اس کا بولنا بڑا بھلا لگتا تھا۔ چھوٹے بچے جب پیاری پیاری باتیں کرتے لگتے تو دلی کی عورتیں انھیں پیار سے "میری آغا مینا" کہہ کر ان کا منہ چوم لیتی تھیں۔

لال اور چنیاں بھی اکثر گھروں میں ہوتی تھیں۔ ان کی چہکار ایک خاص وضع کی ہوتی تھی۔ دلی والے کہتے تھے یہ صمٌ بکمٌ تلاوت کرتے رہتے ہیں اور اس سے گھر میں برکت رہتی ہے۔

دستکاروں میں سے اکثر کو تیتر پالنے کا شوق ہوتا تھا۔ وہ جڑواں پنجرے ہوتے تھے۔ ایک میں نر دوسرے میں مادہ۔ صبح شام انہیں دیمک چگانے اور ہوا کھلانے شہر سے کہیں باہر جاتے تو باری باری سے انہیں کھولتے۔ دونوں ایک ساتھ نہیں کھولتے تھے۔ ایک کے بولنے پر دوسرا بھاگا چلا آتا تھا۔ یہ

بھورے تیتر ے ہوتے تھے۔

کالا تیتر دیکھنے میں بھی بڑا خوبصورت ہوتا تھا۔ اس کی چہکار گورے تیتر سے مختلف ہوتی تھی۔ اس کی لگی بندھی آواز کو لوگوں نے طرح طرح کے معنی پہنا لئے تھے۔

دودھ بیچنے والے کہتے یہ کہتا ہے "شیر دارم شکرک"

بنیا کہتا ہے "نون تیل ادرک"

مذہبی خیال کے لوگ کہتے یہ کہتا ہے "سبحان تیری قدرت"

ہندو کہتے یہ کہتا ہے "سیتا، رام، دسرتھ"

بھورے تیتر کے بارے بھی روایت مشہور تھی کہ کہتا ہے "پدرم سلطان بود" دوسرا اس کے جواب میں کہتا ہے "ترا چہ؟ ترا چہ؟"

غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ سب اپنے اپنے مطلب کی سوچتے ہیں۔ چھومیاں کرخندار، اپنی سنجوگی اٹھاؤ اور گھر کی راہ لو۔

شکاری پرندے پالنے کا بھی دتی والوں کو شوق تھا۔ بہری اور شکرے کو چمڑے کا دستانہ پہن کر کلائی پر بٹھایا جاتا تھا۔ شکرے کی آنکھوں پر ٹوپی چڑھی رہتی تھی۔ جب شکار کرنا ہوتا تو ٹوپی آنکھوں سے اُتار دی جاتی اور شکار کی سمت اسے اُڑا دیا جاتا۔ پلک جھپکتے میں شکرا اپنے شکار کو دبوچ کر بیٹھ جاتا تھا۔ شہ باز کو ایسا سدھایا جاتا کہ خرگوش کو پکڑ لیتا تھا۔ شاہی زمانے میں سنا ہے کہ ایسے بھی شکاری پرندے ہوتے تھے جو جھپٹ کر ہرن کی آنکھیں پھوڑ ڈالتے تھے۔ ہرن اندھا ہو کر چوکڑی بھول جاتا اور شکاری دوڑ کر اسے پکڑ لیتے۔

دتی والوں کو چوپایوں میں سے بھیڑے اور دنبے پالنے کا بہت شوق تھا۔ دودھ پیتا بچہ لیکر پالتے تھے۔ روزانہ اسے کھلاتا پلاتا، نہلاتا دھلاتا، صبح و شام اسے پھراتا، چارے میں چنی اور بونٹ کے بوڑے سُتلی سے باندھ کر دیوار میں لٹکا دیے جاتے۔ دانا ضرور کھلاتے تھے۔ اس سے فربہی آتی تھی۔ جو اور زیادہ لاڈ پیار کرتے دودھ جلیبیاں بھی کھلاتے، چاہے خود بھی کھانے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں مگر جانور کو ضرور کھلاتے۔ بکرے اور بھیڑے کو خصّی کروا دیتے تھے۔ اس سے جانور کا قد بھی نکل آتا تھا اور جسم میں چربی بھی بڑھنے لگتی تھی۔ دنبے تو اس قدر فربہ ہو جاتے اور ان کی چکتیاں اتنی بھاری ہو جاتیں کہ اس بوجھ کو لے کر چلنا ان کے لیے ناممکن ہو جاتا۔ لہٰذا ہلکی پھلکی دو پہیوں کی چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بنوائی جاتیں جن پر ان کی چکتیاں رکھ دی جاتیں۔ تب کہیں ان کی پھرائی ممکن ہوتی۔ ان کی

اون ذرا بڑھی اور کتوائی گئی۔ جب یہ جانور جوان ہوتے تو دیکھنے دکھانے کے لائق ہوتے۔ چکنے ایسے کہ مکھی بیٹھے تو پھسل جائے۔ چھانٹ کر سفید رنگ کے لئے جاتے تھے۔ ان پر مہندی سے گل بوٹے بنائے جاتے۔ ان کے گلوں میں رنگ برنگے موٹے موٹے منکوں کی مالائیں اور چنبیل کی گھنٹیوں کے ہار پہنائے جاتے۔ کئی کئی سو روپے ایک ایک جانور پر لگ جاتے۔ یہ جانور بیچنے یا نفع کمانے کے لئے نہیں بقر عید اور شادی بیاہ کے لئے پالے جاتے تھے۔

بکری یا گائے بھینس پالنے کا رواج دلی والوں میں نہیں تھا۔ دودھ دہی سستا اور اعلیٰ درجے کا بازاروں میں مل جاتا تھا۔ لہٰذا ان جانوروں کا پالنا علت سمجھا جاتا تھا۔ ہر محلے کے قریب گھوسی بستے تھے۔ اپنے سامنے ان سے دودھ نکلوا لیا جاتا۔ دودھ ایسا گاڑھا ہوتا تھا کہ اس میں سیکھ کھڑی کر لو۔

دلی کی مہتر مینڈھے پالتے تھے اور انہیں دلی والوں ہی کی طرح تیار کرتے۔ بعض دفعہ یہ تیار ہو کر اس قدر خوفناک ہو جاتے تھے کہ آدمی کے بس کے نہیں رہتے تھے۔ گلے کے پٹے میں دو طرفہ باگ ڈور ڈال کر دو آدمی لے کر انہیں نکلتے تھے۔ یہ جانور لڑانے کے لئے پالے جاتے تھے۔ بڑی بڑی شرطیں لگائی جاتی تھیں اور ان کی ٹکریں دیکھ کر دل لرز جاتا تھا۔

دلی کے دستکاروں کو گھوڑا اور رہڑی رکھنے کا شوق تھا۔ بعض اوقات پیشوں میں اس کی ضرورت بھی ہوتی تھی۔ مثلاً قصائیوں کے کیلے سے راسیں لانے کے لئے۔ مگر زیادہ رہڑیاں محض نمود کے لئے رکھی جاتی تھیں۔ رہڑی ایک کھلا ہوا اونچا سا دو پہیہ ہوتا تھا۔ بیٹھنے کے ہموار مستطیل جگہ کے چاروں طرف بالشت بھر اونچا جنگلا لگا ہوتا تھا۔ اس میں چار چھ آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ دن بھر کے کام دھام سے فارغ ہونے کے بعد آئے، نہائے دھوئے، اجلے کپڑے پہنے اور یار دوستوں کو ساتھ لے کر کسی طرف سیر سپاٹے کو نکل گئے نظام الدین، اوکھلا، قطب صاحب کی سڑک اچھی تھی اور اس پر بھیڑ بھڑ کا بھی نہیں ہوتا تھا۔ دلی دروازے سے نکلنے کے بعد کوشش یہی ہوتی تھی کہ ہم سب سے آگے نکل جائیں، کوئی ہم سے آگے اپنی رہڑی نہ نکالنے پائے۔ چنانچہ ان منچلوں میں دوڑیں لگ جاتیں۔ راسیں ڈھیلی چھوڑ دی جاتیں اور گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگتے۔ جب کوئی رہڑی برابر سے ہو کر آگے نکلنے لگتی تو جیتنے والے خوشی سے بیری ہے بے بیری کے نعرے لگاتے اور منہ سے ہاتھ لگا کر عجیب عجیب آوازیں نکالتے۔ جو پھسڈی رہ جاتا وہ کھسیانا ہو کر اپنے گھوڑے کی کھال اُدھیڑنے لگتا۔ مگر وہ بیچارہ اپنی بساط سے زیادہ آخر کیسے بھاگے؟ لہٰذا مالک بھی "مخھوبے" کہہ کر راسیں کھینچ لیتا زندہ دل لوگ ایسی شکست سے بددل نہیں ہوتے "یار زندہ صحبت باقی۔" پھر سہی۔

OOO

دِلّی کی گرمی

اب سے دور دلّی میں ایک سال ایسا سوکھا پڑا کہ خلق خدا تراہ تراہ پکار اٹھی۔ جھلستا ہوا سورج، جھلستی ہوئی زمین، در و دیوار سے آگ برس رہی تھی۔ گرمی کے مارے یہ بُرا حال کہ پسینہ جو چوٹی سے بہا تو ایڑی تک جا پہونچا۔ پھلکر دا سے لال بھبکا ہوئے جاتے اور گلاب سے گال مرجھائے جاتے تھے۔ لو کی وہ شدت کہ زمین سے آسمان تک بھاڑ سا بھنسار بنا۔ بازار میں اچھا بھلا آدمی چلا جا رہا ہے کہ پٹ سے گرا اور دیکھتے ہی دیکھتے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ لو لگی، بیچارے نے پھنکا بھی نہیں کھایا۔ زمین کی تپش کا یہ حال کہ مٹر کے دانے پھینکو تو چٹخنے لگیں۔ شہر کے آس پاس کے تمام ندی، نالے، تالاب، جوہڑ سوکھ گئے تھے۔ رات کو حبس ایسا ہوتا کہ دم گھٹا جاتا۔ پنکھا جھلتے جھلتے ہاتھ ٹوٹے جاتے چارپائیاں ابھی بھگوئی ہیں ابھی دیکھو تو بان خشک پڑا ہے۔ کمر لگانا مشکل، کروٹ لینا دشوار۔ مگر دلّی کے زندہ دل ایسے سے بھی بھلا کب چوکتے ہیں؟ ایک صاحب لہک لہک کر یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔

کباب سیخ ہیں ہم، کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں
جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

اس پر سب اپنی پریشانی بھول کر ہنسنے لگتے ہیں۔ بھئی غضب کے منچلے ہوتے ہیں یہ دلّی والے! مرتے جائیں ملہاریں گائیں۔

ساون کا مہینہ آسمان تکتے گزر گیا۔ آسمان تانبا ہو رہا تھا۔ نام کو کوئی بدلی نہ آئی۔ دعائیں مانگتے مانگتے دانت گھس گئے۔ ایسا سوکھا بھلا کاہے کو سنا تھا؟ یہاں تو ساون ہی میں جل تھل ہو جایا کرتا تھا۔ دین داروں نے کہنا شروع کیا یہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔ لوگوں نے توبہ استغفار کا سہارا لیا۔ مسجدوں میں نمازیوں کی تعداد بڑھ گئی۔ گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگی جانے لگیں۔ نماز استسقا پڑھی

گئی، مگر دعاؤں میں شاید اثر نہیں رہا تھا، یا توبہ کے دروازے بند ہو گئے تھے کہ آسمان بخی کے دل کی طرح صاف ہی رہا۔

دن کو جوانسے اور خس کی ٹٹیاں لگائی جاتیں۔ ان پر پانی کے تیز تیزے پڑتے۔ فرش پر پانی چھڑکا جاتا۔ ہزارے چھوڑے جاتے۔ پرانی حویلیوں میں تہہ خانے تھے۔ جب سورج اونچا ہو جاتا تو گھر والے تہہ خانوں میں اُتر جاتے۔ شام کے لگ بھگ ان میں سے باہر آتے، نہاتے دھوتے، جوڑے بدلتے، شربت پیتے، پان کی گلوری منہ میں دباتے اور سیر کرنے نکل جاتے۔ ٹہلتے ٹہلتے بیگم کے باغ میں پہونچ گئے یا دلّی دروازے سے نکل فیروز شاہ کوٹلے میں۔ جو دور نہ جانا چاہتے تھے یادگار میں جا بیٹھتے یا چوک کی سیر کرتے۔

ساون میں آسمان سے ایک بوند بھی نہیں ٹپکی، بھادوں بھی آدھا گزر گیا۔ اب گلیوں میں منہ پر توے کی سیاہی ملے لڑکے ٹولیاں بنا کر پھرنے لگے۔ ذرا سنئے تو یہ کیا کہہ رہے ہیں۔

کالے ڈنڈے پیلے ڈنڈے
برسے گا برسائے گا
کوڑی کھیت لگائے گا
کوڑی گئی ریت میں
پانی آیا کھیت میں

لمبے لمبے دھوتر کے کرتے پہنے فقیروں کی ٹولیاں محلے محلے گھومنے لگیں۔ پہلے ایک کہتا ہے

اللہ کے نام پر بھنڈارا ہو گا

پھر سب مل کر کہتے ہیں

اللہ کے نام پر بھنڈارا ہو گا

پھر ان میں سے ایک صاحب جو اس ٹولی کے لیڈر ہیں چند خود ساختہ ناموزوں اشعار پڑھتے ہیں۔ وہ رکتے ہیں تو سب کے سب مل کر ٹیپ کا مصرعہ اٹھاتے ہیں ؎

اللہ کے نام پر بھنڈارا ہو گا

لوگ حسب توفیق انہیں دان دیتے ہیں۔ خدا جانے یہ بھنڈارا کب اور کہاں ہو گا؟ اور ہو گا بھی یا نہیں۔ خیر ہمیں اس سے کیا۔ دینے والوں کی نیت تو اچھی تھی۔ مطلب ثواب سے ہے۔ گھی کہاں گیا؟

کھچڑی میں۔ کھچڑی کہاں گئی؟ پیاروں کی پیٹ میں۔

اللہ کی شان کہ ایک دن شام ہوتے پچھم سے آندھی اٹھی اور یلغار کرتی سارے آسمان پر چھا گئی۔ بڑی بوڑھیوں نے کہا "اے لڑکیو، جھڑوسل کے نیچے دبا دینا، اور دالان ہی میں رہنا۔ خبردار جو آندھی میں باہر قدم رکھا۔"

"اے بی نانی، اس گھٹس میں بھلا کون اندر دم سادھے بیٹھا رہے گا؟"

"نوج بُوا، آج کل کی لڑکیوں نے تو نتھنوں میں تیر ڈال دیے ہیں۔"

"اچھی نانی اماں، یہ تو بتا دو کہ آخر باہر نکل کر ہم فرانٹے کی ہوا کیوں نہ کھائیں؟"

لوبُوا اور سنو! صاحبزادی آندھی میں فرانٹے کی ہوا کھانے چلی ہیں۔ اے بی اپنے حواسوں پر چیلیں چھڑواؤ۔"

"آخر حرج کیا ہے؟"

"اوئی بیوی، کیسی کترنی کی طرح زبان چلتی ہے! بس کہہ جو دیا تم سے کہ اندر ہی رہو۔"

"آخر کیوں، بتایئے نا۔"

"اے ہے نھی، تو تو بچے کے بچے نکالتی ہے۔"

"اچھی نانی اماں۔"

نانی اماں نے ادھر اُدھر دیکھ کر بڑی رازداری میں کہا۔

"بی آندھی میں جنوں کی برات ہوتی ہے۔"

اتنا سننا تھا کہ سب لڑکیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ نانی بگڑ گئیں۔ اور اپنی جوتی پیر میں سے نکال کر نھی کی طرف لپکیں۔

"ٹھیرتو موئی ہڑدنگی، میں نکالتی ہوں تیرا ہنسنا۔"

نھی ہنستی اور کدکڑیاں لگاتی اماں کے پیچھے جا دبکی۔ اماں بھی سارا ماجرا دیکھ رہی تھیں۔ دبی زبان سے بولیں "بری بات" اتنے میں نانی جوتی ہاتھ میں لئے آپہونچیں۔ بولیں

"کہاں ہے وہ قطہ شہکارا؟"

اماں نے کہا "اے بچی نادان ہے اماں۔ آپ غصہ تھوک ڈالیے۔"

"نا بو، مجھے یہ کھلی بازی پسند نہیں۔ نہ بڑوں کا دب نہ چھوٹوں سے لحاظ۔ جب دیکھو کھی

کھل کھل۔ کھل کھل کھل۔"

نانی کے کہنے کا کچھ انداز ایسا تھا کہ ننھی تو ننھی اماں بی کو بھی ہنسی آ گئی، مگر ضبط کر کے بولیں۔

"اے ننھی، تم نے نانی اماں کو ناراض کر دیا۔ جاؤ ان سے معافی چاہو"

ننھی سہمی سہمی سی اماں بی کے پیچھے سے نکلی اور نانی اماں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ نانی اماں کے ہاتھ سے جوتی چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ اور انہوں جھٹ ننھی کو کلیجے سے لگا لیا۔ پیار کیا اور بولیں:

"نا بیٹا، بُری بات، بڑوں کی ہنسی نہیں اُڑایا کرتے۔ ابھی تم بچہ ہو۔ سچ جانو، آندھی میں جنوں کی برات ہوتی ہے۔ تمہارا کوراپنڈا ہے۔ جاؤ اپنی اماں کے پاس بیٹھو۔"

آندھی ابھی اترنے نہیں پائی تھی کہ دور سے کڑک اور گرج کی آواز سنائی دی۔ سب اندر دالان میں آ بیٹھے۔ آسمان پر سہانی گھٹائیں جھومنے لگیں۔ زور کا ایک تڑاخا ہوا اور بجلی اس زور سے چمکی کہ سب نے اپنے گھٹنوں میں منہ چھپا لئے۔ پھر جو دھوسنا ل مینہ پڑا ہے تو گرمی کے سارے ولدر دھل گئے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگے اور گرمی کافور ہو گئی۔ اب بھلا لڑکیاں بالیاں نچلی کیسے بیٹھتیں؟ بارش میں باہر نہیں نکل سکتی تھیں۔ پیش دالان کی چھت میں دو قلابوں میں جو بیلن پڑا ہوا تھا اس میں دہرا جھولا فوراً ڈلوا دیا گیا۔ گنگا جمنی رسیاں اور لال سبز پٹریاں۔ دو لڑکیاں آمنے سامنے پیر جوڑ کر جھولوں میں بیٹھ گئیں اور دو جھلانے لگیں اور سب مل کر بادشاہ کا گیت گانے لگیں:

جھولا کن نے ڈالو رے امریاں
دو سکھی جھولیں دو ہی جھلاویں
چاروں مل گئیاں بھول بھلیاں
جھولا کن نے ڈالو رے امریاں

جھولے کا یہ گیت دلّی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا بنایا ہوا ہے۔ اس کی دھن بھی بادشاہ ہی کی بنائی ہوئی ہے۔ بہادر شاہ شاعری کے بھی بادشاہ تھے اور موسیقی کے بھی۔ شاعری میں ظفر تخلص کرتے اور موسیقی میں شوق رنگ۔ بڑے بڑے کلاونت راگ راگنیوں میں بندھی ہوئی ان کی چیزیں گایا کرتے تھے۔ اب بھی بڈھے ٹھڈے گویے بادشاہ کی چیزیں تبرکاً گایا کرتے ہیں۔ خیر، اس کا ذکر ہم پھر کبھی کریں گے۔

گیت ختم ہوا تو جھلانے والیوں نے کہا "اب ہماری باری ہے" دونوں جھولنے والیاں جھولوں میں سے اُتر آئیں اور جھلانے والیاں جھولوں میں جا بیٹھیں۔ ایک نے پاؤں جوڑے اور دوسری نے پینگ بڑھائی۔ انہوں نے ایک اور گیت شروع کیا اور سب مل کر گانے لگے۔

لڈاں آڑو جامن گھلے دھرے لڈاں میں نہیں کھاتی میری ماں
لڈاں بھائی بھاوج ملن کھڑے لڈاں میں نہیں ملتی میری ماں
لڈاں تتا پانی بھرا دھرا لڈاں میں نہیں نہاتی میری ماں
لڈاں دھانی جوڑا سلا دھرا لڈاں نہیں پہنتی میری ماں
لڈاں ساجن ڈولا لئے کھڑا لڈاں نہیں جاتی میری ماں

چھینٹا خوب زور کا پڑا تھا۔ گرمی ڈھل گئی تھی۔ رت کیا بدلی کہ گھر گھر خوشیاں پھیل گئیں۔ ہر گھر سے گانے کی آوازیں آنے لگیں۔

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے
میں جوگن تیرے ساتھ سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے
جوگیا بجائے بین اور بانسری جوگیا بجائے بین اور بانسری
جوگن گائے ملہار
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے
جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی
جوگن نے چھایا ہے بدیس سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے
جوگیا نے پہنے لال لال کپڑے جوگیا نے پہنے لال لال کپڑے
جوگن کے لمبے لمبے کیس
سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

کہیں چیش دالانوں میں جھولے پڑے ہیں۔ کہیں صحنوں میں کھم گڑے ہیں۔ مینہ کا زور کم ہو چکا ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ گرمی کی جھلسی ہوئی بچیاں بھلا کب کسے کے روکے رک سکتی ہیں؟ اس پھوار میں بھیگنے سے بدن کی گرمی چھنتی ہے۔ لو وہ اودبدا کر جھولوں میں جا بیٹھیں۔ بھیگ رہی

ہیں اور گا رہی ہیں۔

لمّاں میرے بھائی کو بھیجو جی — کہ ساون آیا

بیٹی تیرا بھائی تو بالا ری — کہ ساون آیا

لمّاں میرے باوا کو بھیجو جی — کہ ساون آیا

بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری — کہ ساون آیا

لمّاں میرے ماموں کو بھیجو جی — کہ ساون آیا

بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری — کہ ساون آیا

غرض بیٹی اسی طرح ایک ایک کر کے سارے عزیزوں کے نام لئے جاتی ہے مگر ماں کوئی عذر تراش کر اپنی معذوری کا اظہار کر دیتی ہے۔ سسرال سے نہ بلوانے میں کوئی مصلحت ہوگی۔ اس پر خوب ہنسی پڑتی ہے اور آپس میں چہلیں ہوتی ہیں۔ مغرب کے وقت تک لڑکیاں جھولا جھولتی رہیں، اور دھما چوکڑی مچاتی رہیں۔ اتنے میں نانی اماں کی آواز سنائی دی۔

''لو بیویو! اب جھولا ختم کرو اور اللہ کا نام لو۔ اس کا شکر ادا کرو کہ گرمی کے عذاب سے نجات ملی۔ اس دن کے لئے دعائیں مانگتے مانگتے دانت گھس گئے۔''

لڑکیاں کھل کھلاتی صحنچیوں کی طرف بھاگیں۔ ننھی نے چپکے سے کہا

''نانی لمّاں کے دانت ہی کہاں ہیں جو گھس گئے؟''

اس پر اور ہنسی پڑی۔ نانی لمّاں نے طرح دے کر کہا

''تم پر اللہ کی سنوار۔ یہ کیا کھی کھی لگائی ہے دونوں وقت ملتے؟ خبردار جو اب میرے کان میں کسی کی آواز آئی۔ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ ہاں!''

سب نے دم سادھ لیا۔ سناٹا ہو گیا، جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔

OOO

فالیز کی سیر

تو بے پر چھینٹ پڑے اور دلی کے منچلے گھر بیٹھے رہ جائیں؟ توبہ کرو! ہیر بہوٹیوں کی طرح ادھر ادھر باہر نکل پڑتے۔ دلی سات دن اور نو میلوں کا شہر تھا۔ دلی والوں کو تو صرف بہانہ چاہیے، دو چار بوندیں پڑیں اور نہوں نے سیر کی ٹھہرائی۔ عورت، بوڑھے، بچے سب ہی سیر کرنے پر تل جاتے۔ جو بے گھر والوں کے ساتھ نہ جاتے ٹولیاں بنا لیتے۔ کوئی ٹولی محلدار خاں جا رہی ہے، کوئی جمنا کے کنارے فالیز پر۔ کسی نے فیروز شاہ کوٹلہ کی راہ لی تو کسی نے دھوبے کنویں کی۔ چند ٹولیاں مدرسہ جا پہونچیں تو چند ہمایوں کے مقبرے میں جا براجیں۔ جو ٹولیاں ذرا سکون کی جگہ پسند کرتی ہیں حوض خاص سدھارتی ہیں۔ جنھیں مچھلی کے شکار کا شوق ہو یا پانی کا کنارہ پسند ہو اوکھلے میں دن گزارتی ہیں۔ جنھیں زیادہ فرصت و فراغت ہو وہ قطب صاحب پہونچ کر مہرولی میں بالا خانہ کرایہ پر لے لیتی ہیں۔ اور جب تک جی چاہے وہاں رہتی ہیں۔

یہاں کی آب و ہوا دلی کے مقابلے زیادہ صحت افزا ہے۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے بھی یہاں محل ہیں، ہیں کیا خاک، اب تو ان محلوں کے ڈھنڈار کھنڈر رہ گئے ہیں۔ کبھی ان محلوں میں بادشاہ اور اس کے لاؤ لشکر کے علاوہ ایک پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ اب یہ کھنڈر کھڑے عظمت رفتہ کی عبرتناک داستانیں سناتے ہیں۔ ساون بھادوں میں دلی میں سیلانی جیوڑوں کی وجہ سے یہ ویرانے آباد ہو جاتے ہیں، ورنہ ان میں چمگادڑیں رہتی ہیں اور الو بولتے ہیں۔ ہا! کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ ع

مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

سچ ہے، سب کو فنا ہے، سدا رہے نام اللہ کا۔

عبرت کی ان نشانیوں میں ہم پھر کسی دن چلیں گے۔ اس وقت ہم آپ کو ایک بے فکروں کی

ٹولی کے ساتھ جمنا کنارے فالیز پر لئے چلتے ہیں۔ مینہ برس کر کھل چکا ہے۔ موسم سہانا ہو گیا ہے، نشیلی رت ہے۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ پیا ہے باد پیائی

فالیز کی سیر صرف مردوں کی ہوتی تھی۔ اس میں گھر کی عورتوں کو شریک نہیں کیا جاتا تھا۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

یہ سیر عموماً رات کو ہوتی تھی۔ رات کا سماں کچھ تھا بھی اس کے لئے موزوں۔ جمنا کی ٹھنڈی ریت پر دری چاندی کا فرش ہو جاتا۔ روشنی کے ہنڈے ساتھ ہوتے۔ یہ گیس کے ہنڈے کہلاتے تھے۔ ہر ہنڈے کے ساتھ ایک پیپا مٹی کے تیل کا ہوتا تھا جس میں پمپ سے ہوا بھری جاتی تھی۔ ہوا کے دباؤ سے تیل نلکی میں سے ہو کر ہنڈے میں پہونچتا تھا اور مینٹل روشن کر دیا جاتا تھا۔ ہنڈے اور پیپے کو اٹھانے کے لئے ایک سالم مزدور درکار ہوتا تھا۔ اس سارے بکھیڑے کو مختصر کر کے اب پیٹرومیکس (گیس کی لالٹین) بنادی گئی ہے۔ ریڑھیوں میں زردہ بریانی کی دیگیں، کلچے، خمیری روٹیاں، باقر خانیاں، شیرمال، کھیر کے پیالے، برف کی سلیاں، آموں کے ٹوکرے بھر بھر کے شہر سے لے جاتے۔ فالیز والوں سے خربوزے دھڑیوں کے مول خریدے جاتے۔

ادھر چاند نے کھیت کیا اور ادھر کبڈی کے پالے جم گئے۔ جوڑیاں بٹنے لگیں:

اکڑ بکڑ بمبے بو
اسی نوے پورے سو

جوڑیاں ایک طرف کو جاتیں، اور فرضی نام رکھ کر واپس آتیں۔

"کوئی لے آم، کوئی لے خربوزہ؟"

ایک ٹولی کا سربراہ کہتا "خربوزہ"

خربوزہ اس کی طرف آجاتا اور آم دوسری ٹولی کے پاس چلا جاتا۔ اسی طرح دو ٹولیوں میں سب بٹ جاتے۔ ورزش کا شوق دلی کے سارے نوجوانوں کو تھا بھرے بھرے ڈنڈ قبضے، سینہ گوشت سے لپا ہوا۔ مچھلے ابھرے ہوئے لنگر لنگوٹے کس، جانگھیے پہن، خم ٹھوک کر میدان میں آگئے۔ ایک ٹولی پالے

کے اس طرف دوسری اس طرف جا کھڑی ہوئی۔ پھر ایک طرف سے ایک جوان ''کبڈی کبڈی'' کہتا ہوا پالا پھلانگ لگا کر دوسری طرف جا گھستا اور کوشش کرتا کہ دوسرے فریق میں سے کسی کو چھو لے، مگر وہ سب کے سب خوب پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ یہ زیادہ اندر بھی نہیں جا سکتا، اس خوف سے کہ پیچھے سے آ کر کوئی پکڑ نہ لے، یا واپسی میں کہیں سانس ٹوٹ نہ جائے۔ جب سانس ختم ہونے لگتا ہے تو واپس آ جاتا ہے۔ اب ادھر کا جوان ادھر آتا ہے اور اپنے زور میں گھستا چلا جاتا ہے۔ یہ تاک میں لگے ہوئے ہی تھے، دو نے پیچھے سے آ کر میاں کو اوپر اٹھا لیا۔ لیجیے یہ صاحب مر گئے۔ اگر ان سے پہلے ادھر کا کوئی آدمی مر چکا ہوتا ہے تو وہ ان کے مرنے سے جی اٹھتا ہے۔ یوں کسی کے مرنے سے دہرا نقصان ہوتا ہے۔ یہ کھیل یونہی باری باری جاری رہتا ہے یہاں تک کہ ایک فریق کے جب سب مر جاتے ہیں تو دوسرا فریق پالا مار لیتا ہے۔ گھنٹہ دو گھنٹے خوب دھما چوکڑی رہی، پھر سب نے پسینہ خشک کیا اور جمنا میں چھلانگ لگانے لگے۔ نہائے دھوئے چھینٹے اڑائے، اور پانی سے نکل کر اجلے کپڑے پہنے۔ اب بھلے آدمیوں کی طرح دری چاندنی کے فرش پر بیٹھتے جاتے ہیں۔ بھوک خوب عود کر آئی ہے۔ دو نے دسترخوان لگا یا چار نے کھانا چنا، اور سب نے ڈٹ کر کھایا۔ دسترخوان پر سے برتن ہٹ گئے تو خربوزوں کی ڈھیریاں لگائی گئیں۔ خربوزوں میں ہانکیاں لگائیں، میٹھے میٹھے کھائے باقی دریا میں اچھال دئے۔

اب آموں کی باری ہے۔ چونے کے آم ٹبوں میں بھر کے برف میں سرِ شام ہی لگا دئے گئے تھے۔ ہر ٹب کے گرد چھ چھ آٹھ آٹھ بیٹھ گئے۔ شرط یہ ٹھہری ہے کہ اتنے اتنے آم کھاؤ کہ گٹھلیاں ٹھوڑی تک آ جائیں۔ یہ بھی ہوا۔ یہ منچلے بھلا کب نچلے بیٹھنے والے تھے؟ ایک شرارت سوجھی، دوسری ٹولی والوں پر چپکے سے ایک گٹھلی اچھال دی۔ وہ کیا ان کے دبیل تھے؟ انھوں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ لیجیو اب دونوں طرف سے گٹھلیاں چلنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے ڈھیر صاف ہو گئے اور دو دو گا ر دل کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ سب کے کپڑے لت پت ہو گئے۔ جمنا کے کنارے جا منھ ہاتھ صاف کیا اور سب کپڑے بدل فرش پر آ بیٹھے۔ چاروں طرف گاؤ تکیے لگ گئے۔ یہ ان کے سہارے ہو بیٹھے۔ حقے اور پیچوان لگ گئے۔ گلاب چھڑکا گیا۔ موتیا کے گجرے اور کنٹھے گلوں میں ڈالے گئے۔ چنگیروں میں چنبیلی کے پھول اور عطر میں بھیگی ہوئی روئی رکھی ہے۔ اجلی اجلی قلعی دار تھالیوں میں لال لال قند کی صافیاں ہیں جن میں دیسی پان کی گلوریاں رکھی ہیں۔ الائچیاں، زردہ اور اقوام الگ ہے۔ پان کھائے گئے حقے کے کش لگائے گئے۔ آپس میں بولیاں ٹھولیاں ہوئیں،

آوازے کسے گئے، ضلع جگت اور پھبتی بازی ہوئی۔ چاند بھی خاصا اونچا ہوگیا۔ ایک صاحب نے، جو ان میں ذرا رُودار اور القربہ خواہ مخواہ مرد معقول ہیں اور صدر میں بیٹھے ہیں، کہا ''کیوں صاحب! اگر بیت بازی ہوجائے تو کیسا؟''

سب نے کہا ''ہاں ہوجائے''

اسی وقت دو فریق بن گئے۔ دلّی کے عام لوگوں کو بھی شعر و شاعری کا اچھا خاصا ذوق ہوتا تھا۔ بیت بازی شروع ہوگئی۔ جب تک حافظے کام دیتے رہے شعر چلتے رہے۔ جب نوبت بے تکے اور ناموزوں شعروں تک پہونچی تو القط القط کا شور مچنے لگا۔ آخر میں ایک فریق جوابی شعر نہ دے سکا تو اس فریق کو شکست ہوگئی۔

ایک صاحب نقلیں بہت اچھی اتارتے تھے۔ انہوں نے نقلیں سنا کر سب کو خوب ہنسایا۔ ایک اور صاحب نے جانوروں کی بولیاں سنائیں اور موقع میں اگر آپ انہیں نہ دیکھیں تو یہی سمجھیں کہ سچ مچ کے جانور ہی بول رہے ہیں۔ ایک اور صاحب نے استاد داغؔ کی غزلیں گا کر سنائیں۔ اور ایک دل لگی باز نے ان کے سامنے منھ سے طبلہ بجایا۔ کمال ہے صاحب! دائیں بائیں کی آواز اور ٹھاؤ دُون بھی کچھ منھ سے کر دکھایا۔ ایک منچلے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور گت بھر بھر کے تھئی تھئی ناچنے لگے۔ نرت بھاؤ بھی انہوں نے خوب دکھایا۔ اس پر خوب ہنسی پڑی، خصوصاً ان کے کولہا لگانے پر سب ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔

ابھی پو پھٹنے میں کچھ دیر تھی۔ رتجگا پورا کرنے کے لئے ایک صاحب نے داستان سرائی شروع کردی۔ دلّی کے آخری داستان گو میر باقر علی کی ہوبہو نقل اُتاری۔ میر صاحب داستان امیر حمزہ سنایا کرتے تھے جسے ساری عمر میں انہوں نے ایک دفعہ پورا کیا تھا۔ ان صاحب نے عمر عیار کی عیاریاں بیان کیں تو اس مزے سے کہ سننے والے پھڑک اٹھے۔ یہ داستان تو شیطان کی آنت ہے، بھلا ختم کیا ہوتی؟ ذکر مسجد اور اذان کا ہو رہا تھا کہ دور سے ہوا کے دوش پر اذان کی آواز آئی اور سب نے کہا ''جل شانہٗ جل جلالہٗ''۔ کسی نے استاد ذوقؔ کا یہ شعر پڑھا۔

مؤذن مرحبا بروقت بولا تیری آواز مکّے اور مدینے

صحبت شب ختم ہوئی۔ رات گئی، بات گئی۔

OOO

باغ کی سیر

دلی کی گرمی! الامان الحفیظ۔ وقنا ربنا عذاب النّار۔

بھلا جہاں چیل انڈا چھوڑے اور ہرن کالے ہو جائیں وہاں کی گرمی کا کیا ٹھکانا؟ آسمان سے آگ برستی ہے، زمین سے شعلے نکلتے ہیں، ہوا کے پردے میں آگ لگ جاتی ہے۔ لو کے تھپیڑے بھونے ڈالتے ہیں۔

مسلمان چونکہ ٹھنڈے ملکوں سے ہند کے تپتے ہوئے علاقوں میں سے آئے تھے اس لئے انھوں نے اس گرمی کا توڑ پانی کی افراط اور باغوں کی کثرت سے کیا تھا۔ شاہ جہاں نے جب شاہ جہاں آباد کی نیو ڈالی تو جمنا کے کنارے لال قلعہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ اب تو جمنا کچھ پرے ہٹ گئی ہے، مگر کوئی چار سو سال پہلے جمنا لال قلعہ کے پیروں میں لوٹا کرتی تھی۔ نہر سعادت خاں پورے شہر میں دوڑی ہوئی تھی۔ چاندنی چوک کے بیچوں بیچ بہتی تھی اور اس کے دونوں کنارے پر پھل دار درخت تھے۔ راہ چلتوں اور مسافروں کو ان سے بہت آرام تھا۔ درختوں کے گھنے سائے میں بیٹھتے، پھل کھاتے، نہر کا پانی پیتے، سستاتے اور آگے بڑھ جاتے۔ دلی پر فرنگیوں کا قبضہ ہوا تو یہ نہر رفتہ رفتہ پاٹ دی گئی۔ نئے حاکموں کا کہنا یہ تھا کہ اس نہر سے مچھر پیدا ہوتے ہیں، اور مچھروں کے کاٹنے سے ایک خاص قسم کا بخار پھیلتا ہے۔ جسے ملیریا کہتے ہیں۔ اس بخار سے ہمارے یونانی طبیب بھی واقف تھے اور اس کا علاج بھی کرتے تھے۔ ان کا نسخہ کبھی دو پیسے سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ طبیبوں کا کہنا یہ تھا کہ مچھر بند پانی میں ہوتا ہے، بہتے پانی میں نہیں۔ نہر خواہ مخواہ بند کر دی گئی۔ مجبوری کا نام صبر ہے۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ سات سمندر پار رہنے والوں کو بھلا کیا معلوم کہ دلی جیسے گرم شہر کے رہنے والوں کے لئے نہر سعادت خاں نہر بہشت ہے کہ اس سے یہاں کی گرمی معتدل ہوتی رہتی ہے۔

دلّی کے حکیموں کا تو خیر کہنا ہی کیا، جھاڑ پھونک کرنے والے تک باری کے بخار کا علاج بغیر کسی دوا کے کر لیا کرتے تھے۔ انہوں نے ٹھیکری پڑھ کر دی، آپ نے کلائی پر باندھ لی۔ بخار تو بخار اگلے دن پنڈا پھیکا تک نہ ہوتا تھا۔ یہ تو ہمارا آپ کا چشم دید واقعہ ہے۔ اب بھی آزما کر دیکھ لیجیے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ آج کل کے لوگ ناک بھوں چڑھا کر اسے ٹونکا کہہ دیتے ہیں۔ انہیں اختیار ہے جو چاہیں کہیں۔ ہٹ دھرمی کا کیا علاج؟ آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لو۔ وہ اور بات ہے۔ مگر چاند چڑھے گا تو کل عالم دیکھے گا۔

مغل ٹھنڈے ملک سے آئے تھے اس لئے پانی اور سبزے کے عاشق تھے۔ کنوئیں، باؤلیاں، تالاب، نہریں، دلّی کے ہر محلّے میں تھیں۔ لال قلعہ میں نہر بہشت بہتی تھی۔ ہر حویلی کے صحن میں حوض ضرور ہوتا تھا اور جب اس میں فوارہ چلتا تو عجب ساون بھادوں کی بہار دکھاتا۔ دلّی کے شاہی باغ اب تو بہت کچھ اجڑ گئے۔ شاہی زمانے میں دلّی باغوں کا شہر تھا۔ قدسیہ باغ، جہاں آرا باغ، روشن آرا باغ، شیدی گوہر کا باغ، چٹھی نویس کا باغ، رنڈی والا باغ۔ وہ باغ جو چاندنی چوک کے شمالی پہلو سے لگا موجودہ ریل کے اسٹیشن اور باغ دیوار تک عین شہر کے قلب میں ہے۔ یہ بھی شاہی زمانے کا باغ ہے۔ یہی شاہ جہاں کی چہیتی بیٹی جہاں آرا کا باغ ہے۔ دلّی والے اسے بیگم کا باغ کہا کرتے تھے۔ اس کا نام فرنگیوں نے بدل کر کمپنی باغ رکھ دیا تھا۔ اور چاندنی چوک کے رخ ملکہ وکٹوریہ کا ایک مجسمہ لگا دیا تھا۔ شاہی کے لٹنے کے بعد حکومت کمپنی بہادر کی قائم ہوئی تھی، ملک ملکہ کا تھا اور حکم کمپنی بہادر کا چلتا تھا۔ عجب بے تکا معاملہ تھا۔ ماموں کے کانوں میں انٹیاں، بھانجے اینڈے پھریں!

دلّی کے باغوں میں سبزہ اور پھول تو تھے ہی، ہمہ اقسام کے پھل بھی تھے۔ شاہی باغوں کے علاوہ امیروں اور رئیسوں کے باغ بھی تھے۔ مثلاً گل دار خاں کا باغ۔ بیگم شمرو کا باغ۔ یہ سارے باغ رعایا کے آرام کے لئے تھے۔ ان میں جانے میں کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ جس کا جی چاہے جائے۔ آنکھوں سکھ کلیجے ٹھنڈک۔ شہر والے جاتے، ہوا کھاتے، دل بہلاتے، یہ باغ ارائیوں کو ٹھیکے پر دیے جاتے تھے۔ ان کے مالی ان کی دیکھ بھال کرتے تھے مگر کسی کو باغ میں آنے سے نہیں روکتے تھے۔ شرط یہی تھی کہ باغ کو نوچیں کھسوٹیں نہیں۔ سیلانی خود اس کی احتیاط کرتے تھے۔ مگر عورتیں اور بچے بھلا کب چوکتے ہیں؟ ذرا مالی کی نظر بچی کہ انہوں نے ہاتھ صاف کیا۔ یہ کوئی ایسی چوری میں چوری نہیں۔ (جی ہاں، سینہ زوری ہے)۔

بادشاہ سلامت بیگمات کے ساتھ کسی باغ کی سیر کرتے۔ بارہ دری میں آرام فرماتے اور سب الے گھلے پھرتے۔ بیگمات اپنے اپنے پرے جماتیں خوب رول چول ہوتی۔ کہیں دیگیں چڑھی ہوئی ہیں، کہیں جھپا جھپ پکوان اُتر رہا ہے، کہیں آم کے گدے میں جھولے پڑے ہیں اور سلاطین زادیاں لہک لہک کر گارہی ہیں۔

لو اب رت آئی گوری بیجن کی

جس کے لمبے لمبے کیس

جس کے ماتھے پہ چاند

جس کا سیاں قربان

لو اب رت آئی گوری بیجن کی

بادشاہ کی چہیتی بیگم زینت محل گاؤ تکئے سے لگی ہزاروں من کی بیٹھی ہیں۔ حبشنیں، ترکنیں، قلماقنیاں، اردابیگنیاں حاضر خدمت ہیں دو خدمت گاریں پیچھے مؤدب کھڑی مورچھل کر رہی ہیں۔ چاندی کا جھنڈا سرپوش سے ڈھکا تخت پر رکھا ہوا ہے۔ سٹک بیگم کے بائیں ہاتھ میں ہے۔ سونے کی جڑاؤ سُنہال ہے ع

گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں

خمیرے کی لپٹیں اڑ رہی ہیں، فضا مہک رہی ہے۔ بادشاہ سلامت خراماں خراماں تشریف لاتے ہیں، بیگم اٹھ کر تعظیم دیتی ہیں، جھک کر سات سلام بجالاتی ہیں۔ بادشاہ سلامت گاؤ سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں تو بیگم کورنش بجالاتی ہیں اور پہلو میں دوسرے گاؤ تکیئے کے سہارے ہو بیٹھتی ہیں۔

حضور فرماتے ہیں ''اماں یہ سناٹا تو اچھا نہیں لگتا۔''

بیگم اشارے کو سمجھ جاتی ہیں۔ عرض کرتی ہیں ''ابھی حاضر کرتی ہوں جہاں پناہ سلامت۔''

چشم و ابرو کا اشارہ پاتے ہی ایک پیش خدمت اُلٹے قدموں لوٹ جاتی ہے اور آنکھ جھپکتے میں اپنے ساتھ موتی خانم کو لے آتی ہے۔ خانم کو گانے میں کمال حاصل ہے۔ لقوہ مار گیا ہے مگر ان کے ہنر میں اس سے کوئی فرق نہیں آیا۔ سرانچے کے پیچھے سازندوں نے ساز ملائے۔ خانم نے لب فرش تک پہنچتے پہنچتے سات سلام جھکائے اور بادشاہ کا بنایا ہوا شدھ ملہار کا خیال شروع کیا'

امرتن کے برہمن کے پاس

پریت بیچنال بوندن چھکے

امرتن کے برہن کے پاس

بول کہنے کے بعد بکھیری تانیں اڑیں تو حضور نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ خانم نے مجرا عرض کیا۔ بادشاہ نے فرمایا "ہم نے اس خیال میں قطب کا سماں باندھا ہے۔ تم نے اپنی ادائگی سے اس سے میں جان ڈال دی" خانم نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا "مہابلی سلامت کی کرامت ہے۔ بندی کس لائق ہے۔" بادشاہ متبسم ہوئے اور خانم نے بادشاہ کی غزل شروع کی۔ سب ہمہ تن گوش بنے سنتے رہے۔ جب خانم نے مقطع گایا۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا

جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

تو بادشاہ آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا:

"خانم تم نے ہماری غزل کو چار چاند لگا دیے۔"

خانم آداب بجالائیں اور ہاتھ جوڑ کر وہیں کھڑی رہیں۔

بادشاہ نے فرمایا "خانم، یہ آواز، اور آواز میں یہ سوز خداداد ہے۔ تم نے ہماری غزل گا کر ہمیں کسی اور ہی عالم میں پہنچا دیا۔"

بارہ دری کے ایک پہلو میں سے ایک لونڈی نمودار ہوئی۔ سر پر تھال تھا جس میں اشرفیاں اور روپے بھرے ہوئے تھے۔ بیگم کی آنکھ کا اشارہ پا کر لونڈی خانم کی طرف بڑھی۔

خانم نے روپے اور اشرفیوں کا تھال لے کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ اور عرض کیا:

"سرفرازی ہے، حضور کی ذرہ نوازی ہے، ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا۔"

بیگم نے کہا "کلام الملوک ملوک الکلام۔ ایسی غزل کے لیے ایسی ہی دھن بھی ہونی چاہیے تھی۔"

یہ کہہ کر پیچھے ہاتھ بڑھایا اور ایک زرکار دوپٹہ لے کر خانم کو دیا۔ خانم نے اسے بھی لیکر سر پر رکھ لیا۔ بادشاہ نے فرمایا۔

"اب ہم اور کوئی گانا نہیں سنیں گے، اسی غزل کا لطف لیں گے تم جا سکتی ہو۔"

خانم سلام جھکاتی ہوئی الٹے قدم لوٹ گئیں۔

شام تک خوب چہل پہل رہی۔ باغ سے روانہ ہونے سے پہلے بادشاہ کی طرف سے اجازت ہوئی کہ باغ لوٹ لیا جائے۔ بس کچھ نہ پوچھیے اس وقت کیا حالت ہوئی۔ تو مجھ پر، میں تجھ پر۔ اس افراتفری میں ایک شوخ دیدہ پیڑ پر چڑھ گئی۔ اور اب اس نے جو پیڑ کو ہلایا تو جامنوں کا مینہہ برس گیا۔ کالی کالی بھونرالی جامنوں پر لوٹ پڑ گئی۔ آم کے درخت دیکھتے ہی دیکھتے سب صاف ہو گئے، کیری تک نام کو باقی نہ رہی۔ درخت ننگے بچے رہ گئے۔

OOO

قطب صاحب کی سیر

عجب بے فکر تھے یہ دلّی والے بھی! اپنی جان کو کوئی غم نہ لگاتے تھے۔ کہتے تھے "فکر جان کا روگ ہوتا ہے۔ ہم غم کیوں پالیں؟ پالیں ہمارے دشمن، بیری۔ شکر خورے کو شکر اور موذی کو ٹکر۔ میاں اسی لئے کماتے دھماتے ہیں کہ آنند کے تار بجائیں۔ ان کی بھلی چلائی جو جوڑ جوڑ مر جائیں گے اور مال جنوائی کھائیں گے۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ مر گئے مردود جن کی فاتحہ نہ درود۔ جو صبح صبح ان کی صورت دیکھ لو تو دن بھر روٹی نصیب نہ ہو۔ اللہ پیسہ دے پیسے کی محبت نہ دے۔ ہاتھ کے میل سے محبت کیا؟ میاں ہم تو کوڑی کفن کو لگا نہیں رکھتے۔ اپنا آپ کیسا ہے؟ جان ہے تو جہان ہے۔ آپ زندم جہان زندم، آپ مردم جہان مردم کھائیں گے گھی سے نہیں تو جائیں گے جی سے۔"

ان دلّی والوں نے اپی قورس کا نام کاہے کو سنا ہوگا؟ انہیں فلسفیوں سے کیا کام؟ یہ تو سیدھی سی بات جانتے ہیں کہ کھاؤ پیو اور موج مارو۔ موت سر پر کھڑی ہے۔ جو دم گزر جائے غنیمت ہے۔ آج نقد کل ادھار۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

ہاں تو ہوا یوں کہ مینہ کا پہلا چھینٹا پڑنے کے بعد گرمی ڈھل گئی اور موسم سہانا ہو گیا۔ کیا امیر کیا غریب، سب کے دل ہرے ہو گئے ایسے سمے میں بھلا پاؤں توڑے گھروں میں دلّی والے کیسے بیٹھے رہتے؟ اسی دن کی تو آس لگائے بیٹھے تھے۔ گھر گھر سیر کا چرچا ہونے لگا۔

آغا نواب نے شام ہوتے گھر میں قدم رکھا۔ دالان میں جا کر انگرکھا اتارا۔ اتنے وہ کپڑے بدلیں بیگم نے صحن میں بچھی ہوئی چوکیوں پر بی مغلانی سے کہہ کر دری چاندنی کا فرش لگوا دیا۔ خود لپک کر مکھانوں کے ستو اور گڑ ھل کے شربت کا اہتمام کیا۔ ایک جھم جھماتے کٹورے میں ستو گھولے،

دوسرے میں شربت بنایا۔ ان میں برف کچل کر ڈالی۔ اور چاندی کی تھالی میں دونوں کٹورے لگا کر آغا نواب کے لیے سوزنی پر لگا دیے۔ پھر سلانی کو آواز دی۔ ''بوا مجھے پٹاری دے جانا۔''

آغا نواب گاؤ تکیے کے سہارے ہو بیٹھے تو بیگم پاس بیٹھ کر پنکھا جھلنے لگیں۔ آغا نواب نے کہا ''میں نے مختار کار صاحب سے کہہ دیا ہے کہ قطب صاحب میں ہمارے لیے بالا خانے کا انتظام کردیں۔ پھول والوں کی سیر کی تاریخ بھی مقرر ہو چکی ہے۔''

بیگم نے خوش ہو کر پوچھا ''تو خیر سے کب چلنا ہوگا؟''

آغا نواب نے کہا ''کل منھ اندھیرے''

بیگم نے چونک کر کہا ''کل؟ آپ بھی ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہیں بھلا اتنے جلدی سب کام ہو جائیں گے؟''

آغا نواب بولے ''کار خیر میں دیر کیسی؟ مختار کار نے مہرولی آدمی روانہ کر دیا ہے۔ ابھی تو پوری رات پڑی ہے۔''

بیگم نے کہا ''ہاں رات تو پڑی ہے پوری مگر کام بھی تو سمیٹنے ہیں۔ یہ تو نہیں ہے کہ منھ اٹھایا اور چل دیے۔ ماشاءاللہ بھرا پرا گھر ہے۔ پھر پاس پڑوس بھی دو چار گھر ہیں۔ یہ غریب بھی ہمارا آسرا تکتے ہیں۔''

آغا نواب بولے ''ہاں ہاں، انہیں ضرور ساتھ لے لینا۔ ان سے بڑی رونق ہوتی ہے۔ انہیں یہ ضرور بتا دینا کہ صبح گجر دم پالکی گاڑیاں اور بھار کس پھاٹک پر لگ جائیں گے۔ سورج نکلنے سے پہلے گھروں سے روانہ ہو جانا ہے۔''

بیگم کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ گھر کی چار دیواری میں گھٹے گھٹے دم بول گیا تھا۔ بولیں.

''تو میں بچیوں سے کہہ دوں صبح بیدار ہونا ہے۔ ویسے تو نماز کے لیے روزانہ اٹھتی ہیں، قدرے پہلے جاگ جائیں۔ صبح کے ناشتے کا بھی انتظام کروں اور ضروری برتن بھانڈا ایک بوری میں بھروا دوں۔ صندوقوں میں سے فرش بھی نکلواؤں۔ ہمسایوں کو اطلاع کراؤں کہ وہ بھی صبح چلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔''

آغا نواب نے کہا ''تمہیں اختیار ہے جسے چاہو نیوتا دو۔''

بیگم نے سب سے پہلے بڑی بیگم کو اطلاع دی۔ وہی اس خاندان کی بڑی بوڑھی ہیں۔ ان کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔

بڑی بیگم نے کہا "اس وقت تو میں کوئی اور ہی دعا مانگتی، قبولیت کی گھڑی تھی۔ میرے دل میں قطب صاحب کا خیال آیا ہی تھا کہ تم نے خیر سے یہ خبر سنائی۔ لو بی، بسم اللہ کرو۔ سودا سلف منگاؤ۔ ماشاء اللہ پورا محلہ ہی ساتھ جائے گا۔ نواب دولہا تو کہیں اکیلے جانے کے قائل ہی نہیں۔ جاؤ تم اپنے کام دیکھو۔"

سیر کی خبر سنتے ہی بچیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ سب کو اپنے اپنے کپڑوں اور جوڑوں کی فکر ہوئی۔

بڑی ننھی بولی "نانی اماں ہمارے پاس تو دھانی دوپٹہ کوئی نہیں ہے۔"

نانی اماں نے کہا "بیٹی تم اپنے دھلے ہوئے کپڑے ساتھ رکھ لو۔ قطب صاحب میں ایک رنگریز موجود ہے۔"

چھوٹی ننھی نے تنک کر کہا "جنگل میں دھرا ہے رنگریز۔"

نانی اماں بولیں "اے بیٹی ہوش کے ناخن لے۔ کیسا جنگل؟ رت بدلتے ہی جنگل میں منگل ہو گیا ہو گا۔ تم دیکھنا تو سہی وہاں کیسی بہار آ رہی ہو گی۔ آدھی دلی وہاں ڈھل چکی ہو گی۔"

صبح جانے کی خوشی میں بھلا نیند کسے آتی؟ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔

یہ برکھا رت بڑی اللہ آمین کی تھی۔ سارے شہر میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ جس کو دیکھو سیر کے لیے پر تول رہا ہے۔ کوئی سبزی منڈی کے باغوں میں جائے گا۔ کوئی کوٹلہ، پرانے قلعہ، مدرسہ، ہمایوں کے مقبرے یا اس سے آگے حوض خاص۔ مگر قطب صاحب کی بات ہی کچھ اور ہے۔ حضرت بختیار کاکیؒ کی برکت کہو کہ دلی والے سات کوس کھنچے چلے جاتے ہیں۔ اور وہاں تہوار کا سرا بھی تو ہے۔ تین دن کے بعد پھول والوں کی سیر ہے۔ یوں اور بھی خلقت ٹوٹی پڑتی ہے۔

یوں تو دلی سے قطب صاحب موٹریں اور بسیں چلتی ہیں مگر دلی کے سیلانی جیوڑے گیارہ میل کے راستے کا بھی لطف اٹھاتے ہیں۔ اس لیے تانگوں، اونٹ گاڑیوں، بیل گاڑیوں اور ٹھیلوں میں جانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جگہ جگہ ٹھیکیاں لیتے کچھ راستہ سواری میں اور کچھ پیدل طے کرتے ہیں۔ غریب غرباء پیدل جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہی لوگ سیر کا اصل لطف اٹھاتے ہیں۔ مٹکے میں ایک دو جوڑے رکھے اور مٹکا سر پر اوندھا لیا اور چل پڑے۔ یہ مٹکا صندوق کا کام بھی دیتا ہے اور چھتری کا بھی۔ خراماں خراماں شور مچاتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں چاہتے ہیں چھاؤنی چھا لیتے ہیں۔ کھاتے ہیں، پیتے ہیں، کھیلتے ہیں اور دوڑ لگاتے ہیں اور ہنستے کھیلتے اجالے اجالے قطب صاحب پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں بیسیوں ٹوٹی پھوٹی عمارتیں ہیں۔ کسی کھنڈر میں ڈیرا جما لیتے ہیں۔

فجر کی اذان کے وقت سے گلی گلی ڈیوڑھیوں اور چوراہوں پر سواریاں لگ گئیں۔ گٹھریاں، بوغبند، برتنوں کی بوریاں بھر رکسوں میں لادی گئیں۔ آغا نواب نے عورتوں کے لیے پالکی گاڑیوں کا انتظام کیا ہے۔ ان کی لین ڈوری لگ رہی ہے۔ ان میں محلے بھر کی عورتیں اور بچے ایسے ٹھنس کر بیٹھے کہ ہلنا تک محال ہوگیا۔ جہاں چار مردوں کا بیٹھنا مشکل ہوتا ہے وہاں آٹھ عورتیں آرام سے بیٹھ جاتی ہیں آغا نواب ہنس کر کہا کرتے تھے کہ عورتیں ربڑ کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔

گاڑیاں بھر بھر کے روانہ ہوتی رہیں۔ دلی دروازے سے باہر نکلے خونی دروازے سے آگے فیروز شاہ کوٹلہ آ گیا۔ جنہیں قطب صاحب پہنچنے کی جلدی نہیں ہے کوٹلے میں رک گئے۔ یہاں بھی چھوٹا سا میلہ لگا ہوا ہے۔ حلوائی کی دکان پر گرما گرم کچوریاں چھپا چھپ اتر رہی ہیں۔ حلوا مانڈہ بھی موجود ہے۔ ایک ایک پیسے یہ یہ بڑی کچوری لے لو۔ آلو کی ترکاری ہے جس میں گاجر اور آم کے اچار کی ایک ایک پھانک بھی ہے۔ چار پیسے کی بیوڑیوں پر حلوے کی لگدی بھی رکھ دی تھی۔ اس سے منہ میٹھا کیا۔ پھر منہ صاف کرنے کے لیے یک پیسے میں دو دیسی پانوں کا بیڑا بنوایا، کلہ تازہ کیا۔ اوپر چڑھ کر اشوک کی لاٹ دیکھی اور آگے روانہ ہو گئے۔

نیر کے تکئے سے ہوتے ہوئے پرانے قلعے پہنچے۔ شیر منڈل پر چڑھے۔ کسی نے بتایا کہ اسی پر سے ہمایوں بادشاہ کا پیر پھسلا تھا اور ایسا پھسلا کہ بادشاہ کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ مسجد میں سے جمنا کی سیر کی۔ کچھ لوگ قلعہ کے پہلو میں ہنڈیوں والے مزار کے ٹیلے پر چڑھے۔ خبر نہیں یہ کس زمانے کے بزرگ ہیں۔ لوگ منتیں مانتے ہیں اور جب مرادیں پوری ہو جاتی ہے تو ایک ہنڈیا میں شربت بھر کے مزاروں پر چڑھاتے ہیں سینکڑوں ہزاروں ہنڈے اور ہانڈیاں یہاں اوندھی ہوئی دیکھ لو۔ ان پر اللہ کے بندے سفیدی بھی کر دیا کرتے تھے۔ دور سے ایسا لگتا تھا جیسے اس ٹیلے پر کُکُر مُتّا کا جنگل کھڑا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب دلی میں کشامری پھیلی اور دلی کے مسلمان گھروں سے نکل کر ان کھنڈروں میں آن پڑے تو پرانے قلعے میں ایک لاکھ تھرے مسلمان تھے۔ ہم بھی انہیں میں تھے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ جب پانی بھرنے کے لیے برتنوں کی ضرورت پیش آئی تو انہی بزرگ کے مزار کے ہزاروں مٹکے ان مہاجروں کے کام آئے۔ خیر یہ ایک الگ قصہ ہے پھر کبھی آپ کو سنائیں گے۔

سیلانی دوپہر سے پہلے سلطان جی جا پہنچے۔ دلی والے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کا نام لینا بے ادبی سمجھتے ہیں، اس لیے انہیں سلطان جی کہتے ہیں۔

درگاہ میں داخل ہوئے۔ پہلے سلطان جی کے محبوب مُرید حضرت امیر خسرو کے مزار پر فاتحہ پڑھی، پھر سلطان جی کے مزار پر حاضری دی۔ پہلو ہی میں مسجد ہے۔ اس میں جا کر گنبد میں لٹکے ہوئے سونے کے کٹورے کو دیکھا۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہ نیچا تھا۔ کسی بدفطرت نے اسے چرانا چاہا تو اوپر کھنچ گیا۔ درگاہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے کا رخ کیا یہاں بھی سیلانی اترے ہوئے ہیں۔ چنگ بازوں کے ہاتھ لگ رہے ہیں۔ مقبرے کا چکر لگایا اور صفدر جنگ کے مقبرے جا پہنچے۔ یہ مقبرہ مدرسہ کہلاتا ہے۔ ساون بھادوں میں کچھ دیر آرام کیا۔ قطب صاحب میں جب چھڑیاں ہوتی ہیں تو دِلّی والے مدرسے میں ضرور ٹھہرتے ہوئے جاتے ہیں۔ دِلّی کی بعض برادریوں میں عورتوں کا ایک گانا بھی گایا جاتا ہے۔

چاہے سیاں مارو میں چھڑیوں میں جاؤں گی
اندرسے کی گولیاں مندرسے میں کھاؤں گی

مدرسے میں ستا کر سیلانی موسم کا لطف اٹھاتے۔ چہلیں کرتے حوض خاص جا پہنچے۔ یہ بڑے سُون کی جگہ ہے۔ تھوڑی دیر یہاں ٹھہرے، پھر قطب صاحب روانہ ہوئے۔ شام ہونے سے پہلے مہرولی پہونچ لیے۔ جن لوگوں نے کمرے یا بالا خانے کرایہ پر نہیں لیے ہیں وہ جنگلی محل، ظفر محل، مرزا بابر کی کوٹھی، اور بیسیوں پرانی عمارتوں میں جا اترے اور اپنی جھکّی صاف کر قبضہ جما بیٹھے۔ کوئی روک ٹوک نہیں، جس کا جہاں جی چاہے رہے۔ شام ہو رہی ہے اس لیے سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ کر سب سے پہلے کھانے کا انتظام کر رہے ہیں۔

مہرولی کا بازار سجا ہوا ہے۔ ہر چیز یہاں افراط سے ملتی ہے۔ تندور گرم ہیں، نان بائی حکم کے منتظر ہیں۔ اپنا گھی اور روا میدہ لائیے۔ اور اپنے سامنے پراٹھے لگوائیے۔ چنگیر میں ترتراتے پراٹھے رکھے، آم کا اچار سامنے کی دکان سے خریدا۔ آبخورے میں دودھ والے سے ربڑی لی۔ کان میں چرخی کے پنکھے کی آواز آئی، ادھر کا رخ کیا۔ کبابی سیخیں بھر بھر کے رکھتا جاتا ہے۔ جو سیخیں سنک گئی ہیں پانی کا ہاتھ لگا کر انہیں ڈھاک کے دونوں میں اتارتا جاتا ہے۔ اس سے حسب ضرورت گولے کے کباب خریدے۔ دوشاخہ جلائے آموں کے ڈھیر ٹھیلے پر رکھے پھیری والا آواز لگاتا سامنے سے گزرتا ہے "کیرانے کا لڈو ہے" ایک پنسیری آم اس سے خریدے اور لدے پھندے اپنے ٹھکانے پر لوٹے۔ سب نے مل کر کھانا کھایا اور پھر جوڑ کر ستائے تو صبح کی خبر لائے۔

صبح ہوئی منہ ہاتھ دھویا، ناشتہ کیا، بازار میں ہر نعمت موجود ہے۔ سب کو سیر کی سوجھی۔ پہلے جہاز پر گئے۔ شمسی تالاب کٹورے کی طرح پڑا جھلک رہا ہے۔ پانی بہت گہرا ہے۔ اس میں صرف تیراک ہی اُتر سکتے ہیں۔ وہاں سے اولیا مسجد پہنچے۔ نفل پڑھے۔ یہاں سے جھرنے گئے۔ سہ درے دالان کی چھت میں سے پانی اس طرح گر رہا ہے۔ جیسے بارش ہو رہی ہو۔ پرنالوں کا پانی تھجے پر سے چادریں بن کے گر رہا ہے۔ حوض میں بچے، جوان، بوڑھے، سبھی نہا رہے ہیں۔ سہ درے کی چھت پر سے پانی گر رہا ہے۔ پھسلنا پتھر جھرنے کی دیوار میں گڑا ہوا ہے۔ اب ٹوٹ چکا ہے۔ اس پر سے پھسلنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ مرد عورت سب اس پر سے پھسلا کرتے تھے اور خوب ہنسی ہوتی تھی۔

اس سے آگے امریاں ہیں۔ بڑے بڑے تناور آم کے درخت اس طرح سر جوڑے کھڑے ہیں کہ دھوپ کا گزر نہیں ہوتا۔ بیسیوں جھولے ان میں پڑے ہیں۔ چپے چپے پر سیلانی بیٹھے ہیں۔ انگیٹھیاں دہک رہی ہیں، کڑھائیاں چڑھی ہوئی ہیں۔ گلگلے، سہال اندرسے کی گولیاں، پھلکیں اور پتے تلے جا رہے ہیں۔ جھولوں میں مرد کھڑے پینگیں بڑھا رہے ہیں۔ بعض جھولوں میں پٹریوں کے نیچے دس دس پندرہ پندرہ سیر کے پتھر بندھے ہوئے ہیں۔ یہ اس لیے کہ جب جھولے کی پینگ خوب بڑھ جائے تو جھولا الٹنے نہ پائے، جھولے کا لنگر قائم رہے۔ دوستوں میں شرطیں لگی ہوئی ہیں کہ پینگ اتنی اونچی جائے کہ سامنے والے درخت کا پتہ توڑ لیا جائے۔ خاصا جان جوکھوں کا کام ہے۔ مگر جھونے والے جھولتے ہیں اور شرط جیتتے ہیں۔

امریوں میں دوسری طرف پورے پورے گھر اترے ہوئے ہیں عورتوں کے لیے دہرے جھولے پڑے ہوئے ہیں۔ دوان میں بیٹھی ہیں اور آمنے سامنے ہو کر جھولتی ہیں۔ اور جھولنے والیاں اور جھلانے والیاں سب مل کر گا رہی ہیں۔

چھا رہی ہے کاری گھٹا جیا مورا لہرائے ہے
سن ری کوئل باوری تو کیوں ملہار گائے ہے
آ پپیہا آ ادھر میں بھی سراپا درد ہوں
آم پہ کیوں جم رہا، میں بھی تو رنگ زرد ہوں
فرق اتنا ہے کہ اُس میں رس ہے، مجھ میں بائے ہے
چھا رہی ہے کاری گھٹا جیا مورا لہرائے ہے

اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ اسی وقت ایک زور کا چھینٹا آیا۔ اونٹتے تیل میں جو پانی کی بوند پڑی تو تیل چٹخا اور ''اوئی اوئی'' کہتی سب دور دور ہو بیٹھیں۔ جلدی سے کڑھائی پر تسلا ڈھانکا۔ چلتا ہوا ابر تھا، ذرا دیر میں کھل گیا۔ گرم گرم پکوان اترنے لگا۔ سب نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور جھول جھول کر اور گھوم پھر کر ہضم کیا۔ لڑکیوں نے آنکھ مچولی کھیلی۔ کسی بڑی بوڑھی کو دائی بنایا۔ چور کی آنکھیں میچی گئیں۔ جو چور بنی تھیں آنکھیں کھلنے پر اوروں کو تلاش کرنے لگی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس نے ایک تاک لیا اور اس کی طرف جھپٹی۔ اس نے چور کو اپنی طرف آتے دیکھ کر بھاگنا چاہا مگر چور لڑکی اس سے زیادہ تیز تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ چور سے بچنا مشکل ہے تو چیخیں مارتی دائی کی طرف بھاگی۔ اتنے میں برابر سے اور لڑکیاں بھی قہقہے لگاتی اپنی اپنی اوٹ سے نکل کر کڑے لگانے لگیں۔ چور لڑکی کبھی ایک کے پیچھے بھاگتی اور کبھی دوسری کا پیچھا کرتی۔ اگر ایک ہی کے پیچھے لگی رہتی تو شاید اسے پکڑ لیتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب نے کاوے کاٹ کر دائی کو چھو لیا اور یہ بچاری دوبارہ چور بنی۔

کہیں اندھا بھینسا کھیلا جا رہا ہے۔ ایک لڑکی کی آنکھوں پر دوپٹہ باندھ دیا گیا۔ باقی لڑکیاں چپکے چپکے آ کر اسے ستاتی ہیں۔ وہ غریب اندھوں کی طرح ہاتھ پھیلائے ان کی آواز پر دوڑتی ہے۔ مگر بھلا کون اس کے ہاتھ میں آتا ہے؟ سب خوب ہنستے ہنساتے ہیں۔

کہیں کوڑا جمال شاہی کھیلا جا رہا ہے اور بھاگتے بھاگتے چور کو کوڑے لگائے جا رہے ہیں۔

آج پورا دن امریوں ہی میں گزرا۔ خوب دھما چوکڑی رہی۔ جو کچھ کھایا پیا تھا سب ہضم ہو گیا۔ جب لوٹ کر اپنے ٹھکانے پر آئے تو بہت سے خربوزے اپنے ساتھ لیتے آئے۔ دھول کوٹ، دو ہی مزے، پھیکا یا میٹھا۔ چار آنے کی پنسیری۔ ٹانکیاں لگا لگا کر میٹھے میٹھے کھائے، پھیکے ایک طرف اچھال دیئے۔ قطب کا پانی بڑا ہاضم ہے۔ ابھی کھایا ابھی پھر بھوک لگنے لگی۔ دلی والے جتنے دن یہاں رہتے ہیں خوب ڈٹ کر کھاتے ہیں۔ سچ ہے، ایک داڑھ چلے، ستر بلا ٹلے۔ اچھا، اب انہیں یہیں چھوڑیئے۔ دن بھر کے تھکے ہوئے ہیں، لمبی تانیں گے، چل کر آپ بھی آرام کیجئے۔

OOO

پھول والوں کی سیر

امریوں میں پورا دن گزار کر آغا نواب مہرولی میں اپنے بالا خانے پر پہنچے تو سب تھک کر چور ہو رہے تھے۔ بڑے تو خیر بیٹھے سیر کو دیکھ کئے مگر بچوں نے کچھ کم اودھم مچائی تھی؟ جب رات کا کھانا کھا کر لیٹے تو ایسے گھوڑے بیچ کر سوئے کہ بس صبح کی خبر لائے۔ قطب صاحب میں ابھی بہت چیزیں دیکھنی باقی تھیں، اس لیے سب نے منھ ہاتھ دھو پوریوں ور کچوریوں کا ناشتہ کیا۔ دودھ کا ایک ایک پیالہ سب کو ملا۔ یہاں کا دودھ ایسا عمدہ اور گاڑھا ہے کہ جی چاہے تو اس میں سیک کھڑی کر لو۔ بھلا شہر والوں کو یہ دودھ کہاں نصیب؟ ایک ہی جوش میں اس پر موٹی موٹی ملائی آ جاتی ہے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر سیر کو نکل گئے۔ یہاں سواری کا نہیں پیدل پھرنے کا مزہ ہے۔ یہاں اکے دُکے تانگے، پالکی گاڑیاں سب موجود۔ اگر کہیں دور جانا ہو تو چند ٹکوں میں دم کے دم پہنچا دیتے ہیں۔

امریوں میں آج صبح ہی صبح رونق ہے۔ مور جھنگار رہے ہیں۔ پپیہا پی کہاں کی ٹیر سنا رہا ہے۔ کوئل کوک رہی ہے۔ دیگیں دندنا رہی ہیں۔ چیلیں ٹھنٹھنا رہی ہیں، کڑھائیاں چڑھی ہوئی ہیں۔ ان میں تیل اونٹ رہا ہے۔ پکوان کی تیاری ہو رہی ہے۔ جھولے پڑے ہوئے ہیں، پینگیں بڑھ رہی ہیں۔ آم کا ٹپکا لگ رہا ہے، جامنیں ٹپا ٹپ گر رہی ہیں۔ بکھیری آوازوں میں بادشاہ کا گیت فضا میں گونج رہا ہے۔

جھولا کن نے ڈالو ہے آمریاں
باگ اندھیرے تال کنارے
مرلا جھنگارے، بادر کارے
برسن لاگیں بوندیں پھٹیاں پھٹیاں

جھولا کن نے ڈالو ہے آمریاں
دو سکھی جھولیں، اور دو ہی جھولاویں
چاروں مل گئیاں بھول بھلیاں
بھولی بھولی ڈولیں شوخ رنگ سیاں
جھولا کن نے ڈالو ہے آمریاں

امریوں سے نکل کر گندھک کی باؤلی پر پہنچے، اس کا پانی ذرا سیاہی مائل ہے اور اس میں گندھک کی بو ہے۔ پھوڑے پھنسیوں والے اس میں نہاتے ہیں اور شفا پاتے ہیں باؤلی میں کودنے والے لڑکے لنگر لنگوٹ کسے تیار کھڑے ہیں۔ انہیں روپیہ، اٹھنی، چونی، حد یہ کہ چھوٹی دونی دکھا کر باؤلی میں پھینکیے، یہ اس کے ساتھ ہی چھلانگ لگائیں گے اور جب پانی میں سے ابھریں گے تو ان کے دانتوں میں آپ کا پھینکا ہوا سکہ ہوگا۔ یہ آپ کو سلام کر کے پھر باؤلی میں کھڑے ہو جائیں گے کہ کوئی اور سیلانی آئے اور ان کا کرتب دیکھے۔

سیلانی ناظر کے باغ میں گئے۔ اس کے چاروں حوضوں کی سیر کی۔ بارہ دری میں لیٹے بیٹھے۔ یہیں دن کا کھانا کھایا، بازار دور نہیں ہے۔ ہر نعمت مل جاتی ہے مگر جو مزہ ردے میدے کے پراٹھوں اور گولے کے کبابوں میں ہے وہ اور کسی کھانے میں نہیں ہے۔ بیسیوں تندور گرم رہتے ہیں۔ برابر والی دوکان سے رواسیدہ اور گھی خریدئیے اور نان بائی کے حوالے کیجئے۔ ایک کونے میں آٹا گوندھنے کا کونڈا اگڑا ہوا ہے۔ اس پر ایک گھبرو نوجوان ننگے بدن لنگوٹا پہنے کھڑا ہے۔ رواسیدہ لے کر کونڈے میں ڈالتا ہے، حسب ضرورت پانی اور گھی ڈال کر مکیاں لگاتا ہے اور چشم زدن میں گوندھ کا ندھ نان بائی کے حوالے کرتا ہے۔ آٹا ٹھہر جاتا ہے تو نان بائی سیر کے پانچ یا سیر کے چھ پیڑے توڑتا ہے اور پتھر کی سل پر رکھتا جاتا ہے۔ پھر ایک ایک پیڑا اٹھاتا ہے اور خشکی لگا کر پیڑے کو پھیلاتا ہے۔ گھی لگا کر اسے بیچ میں سے نصف چاک کر دیتا ہے اور اسے لپیٹ کر لمبا سا سانپ بنا لیتا ہے۔ اس سانپ کا پھر پیڑا بناتا ہے۔ یہ اس لئے کرتا ہے کہ پراٹھے کی کئی پرت بن جائیں اور اندر سے کچا نہ رہے۔ پراٹھا بڑھا کر رفیدے پر رکھتا ہے اور تندور کے کنارے پر بایاں ہاتھ رکھ کر دائیں ہاتھ سے جھک کر تندور میں پراٹھا لگا دیتا ہے۔ اتنے میں یہ تیار ہو دوسرا پیڑا اٹھا لیتا ہے اور اس کے ساتھ بھی یہی عمل کرتا ہے۔ ادھر دوسرا پراٹھا تیار کر کے تندور میں لگایا ادھر تندور میں دو کانٹیاں ڈال پہلا نکال لیا اور چنگیر میں ڈال دیا

دس منٹ میں دو سیر کے پراٹھے تیار کر کے آپ کے حوالے کر دیتا ہے۔ اگر آپ کے ساتھ بھنا ہوا قیمہ اور ہری مرچیں ہیں تو سبحان اللہ ورنہ نگوڑن کے لیے آم کا اچار، سیخ کے کباب، دہی یا ربڑی سامنے سے خرید لیجیے اور اللہ عزیز کیجیے۔ سیلانی شام تک ناظر کے باغ میں رہے اور آس پاس کے کھنڈروں کی سیر کرتے رہے۔ شام کو جھٹ پٹا ہوا تو اپنے اپنے ٹھکانوں پر جا پہنچے۔

اگلے دن قطب صاحب کی لاٹ پر گئے۔ جوانوں نے شرط لگائی کہ ایک سانس میں پانچوں کھنڈ طے کر کے اوپر پہنچیں گے۔ جو دم دار ہوتے ہیں وہ بغیر رکے سیڑھیاں طے کرتے چلے جاتے ہیں، باقی پھسڈی کہلاتے ہیں۔ لاٹ پر فراٹے کی ہوا کھائی، چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دن کی عمارتوں کو جانچا اور اتر آئے۔ آس پاس کے کھنڈروں میں گھومے پھرے، بھیم کی چھنگی پر پتھر کو ہلایا، کڑوا نیم چکھا، واپسی میں بھول بھلیاں میں تھکی لی۔ اس میں بھی سیلانی اترے ہوئے ہیں۔

تیسرے دن چہل تن چہل من پر پہنچے۔ ان کی چالیس قبریں کبھی پوری نہیں گنی جاتیں۔ تعداد یا تو گھٹ جاتی یا بڑھ جاتی ہے۔ بکاؤلی کے قلعے، جمالی کمالی کے مزار اور اندھیرے باغ کی سیر کی۔ لیجیے تین دن میں ساری سیر ہوگئی۔

ساون کی جھڑی ختم ہوئی اور بھادوں کی پھوار شروع ہوئی۔ اسی قطب صاحب میں پھول والوں کی سیر کے نام سے ایک بڑا اور صاف ستھرا میلہ ہوتا تھا۔ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کی درگاہ یہیں مہرولی میں ہے۔ اسی وجہ سے اس جگہ کا نام قطب صاحب پڑ گیا ہے۔ یہ ہمیشہ ایک صحت افزا مقام سمجھا جاتا ہے۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر نے اسی وجہ سے یہاں اپنے محل بنوائے۔ جب بھی معاملات و سلطنت سے انہیں فرصت ملتی قطب صاحب جا رہتے۔ یہ میلہ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں شروع ہوا۔ اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ اکبر شاہ ثانی کے ایک چہیتے بیٹے تھے مرزا جہانگیر۔ بادشاہ کے اصل ولی عہد تو تھے بہادر شاہ ظفر مگر کبر شاہ ثانی مرزا جہانگیر کو اپنا ولی عہد بنانا چاہتے تھے مگر فرنگیوں نے اسے نہیں مانا۔ بادشاہ فرنگیوں کے دست نگر تھے کیونکہ راج تو بادشاہ کا تھا مگر حکم فرنگیوں کا چلتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرنگیوں کے طرف سے دو لاکھ روپے ماہواری وظیفہ ملتا تھا۔ اور ایک ریزیڈنٹ قلعہ معلیٰ میں رہتا تھا جس کی مرضی بغیر بادشاہ کوئی حکم جاری نہیں کر سکتے تھے۔ مرزا جہانگیر کا لاڈ پیار میں ستیاناس ہوگیا تھا۔ ایک دن ریزیڈنٹ سے ان کا آمنا سامنا ہوا تو مرزا نے کہا "لُولُو ہے بے لُولُو ہے"۔ سٹین صاحب شہزادے کی بیہودگی کو سمجھ گئے مگر چندرا کے مرزا کے ساتھیوں سے پوچھا کہ "صاحب عالم کیا

کہتا ہے؟" ساتھیوں نے رفع شر کے لیے کہا "حضور صاحب عالم آپ کو لولو یعنی موتی کہتے ہیں۔" سٹین نے زہر خند کر کے کہا "ہم صاحب عالم کو لولو بنائے گا" صاحب عالم سمجھتے تھے اپنے باپ کی حکومت ہے۔ اس فرنگی کی یہ مجال کہ ہمیں لولو بنائے؟ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سٹین پر طمانچہ داغ دیا۔ زندگی تھی جو وہ بچ گیا سٹین نے اس واقعہ کی رپورٹ کمپنی بہادر کو کی اور مرزا جہانگیر کو نظر بند کر کے الہ آباد بھیج دیا اور بادشاہ سلامت سے عرض کیا کہ شہزادے کو تربیت کی ضرورت ہے۔ جب ان کی تربیت پوری ہو جائے گی تو الہ آباد سے واپس آ جائیں گے۔ زبردست کا ٹھینگا سر پر، چارو ناچار بیٹے کی جدائی گوارا کرنی پڑی۔ مرزا جہانگیر کی والدہ نواب ممتاز محل نے منت مانی کہ جب مرزا چھوٹ کر آئیں گے تو قطب صاحب میں حضرت بختیار کاکی کے مزار پر پھولوں کا چھپر کھٹ اور غلاف چڑھاؤں گی۔

خبر نہیں الہ آباد میں مرزا پر کیا گزری۔ بارے جب وہ الہ آباد سے چھٹ کر آئے تو الہ آباد سے دلی تک ہر شہر میں ان کا بڑا شاندار استقبال ہوا۔

اب خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی سے منت بڑھانے کا حال سنئے:

> "برکھا رت، ساون کا مہینہ، بادشاہی خیمے، مخملی، باناتی، اطلسی، سبز، سرخ، زرد، ریشمی، کلابتونی، سوتی طنابوں سے جکڑے کھڑے تھے۔ ان کے سنہری کلس اور شمسے سورج میں چمک رہے تھے۔ اوپر نیلا آسمان، نیچے زمین پر سبزے کا فرش۔ خیموں کا سلسلہ اور جا بجا پانی میں ان کا عکس طلسمات کا عام پیدا کر رہا تھا۔ بادشاہی خیمے سے لے کر قطب صاحب بندہ نواز کی درگاہ تلک جہاں مستورات جا سکتی ہیں دورویہ قناتیں کھڑی تھیں کیونکہ ملکۂ دوراں مرزا جہانگیر کو لے کر منت ادا کرنے کے لیے درگاہ میں حاضر ہوں گی۔ تیاری تو صبح سے ہو رہی تھی مگر دن کے تین بجے حضرت ظل سبحانی نے کہا "پنکھا چڑھانے کا وقت آ گیا۔" ملکۂ دوراں نے پچاس خوان اندرسے کی گولیوں اور پھینیوں کے آراستہ کئے۔ ایک چاندی کی کشتی میں سونے کا پنکھا، جس میں پنا، پکھراج، نیلم یاقوت اور سچے موتی جڑے تھے، جس کی بالشت بھر نیچی جھالر کو بیگم نے جوہی کی کلیوں سے خود گوندھا تھا۔ مرزا جہانگیر کو دولہا بنا کر سہرا پھولوں کا، بدھی طرہ عطر میں بسا کر، اس کے سر پر بندھوا کر وہ کشتی صاحب عالم کے سر پر بسم اللہ کہہ کر بیگم نے رکھی اور بادشاہ

زادے کی بلائیں لے کر کہا ''ماں میر منھ نہ تھا کہ فرنگیوں کے چنگل سے نکل کر شاہ جہاں آباد میں آئے اور میں تجھے دیکھوں۔ یہ سب حضرت کا صدقہ ہے۔ جانِ من منت کی کشتی سنبھالو اور سر ادب نیاز سے جھکا کر درگاہ کو چلو۔ آؤ''

''غلاف شریف کی سینی بادشاہ نے اپنے سر پر، اور صندل اور عطر دان بیگم نے اپنے سر پر، اور مٹھائی کے خوان بادشاہ زادوں نے اپنے سروں پر رکھ کر سب نے مل جل کر آستانہ پاک کی راہ لی۔ بیگمیں، بادشاہ زادیاں ٹھواں جوڑے پہنے تھیں۔ گوکھروں کے جال، سلمہ ستارہ، کلابتوں کی تمامی زری، لچکا، زربفت، کمخواب زری، ماچو، اطلس، دیدائی، بابر یشت، بنارس، گجرات، سورت، احمد آباد شریف، لاہور کے شاہی کارخانوں سے ریشمی، اور زریں کپڑوں کے لباس پہن کر آراستہ ہو رہی تھیں۔ لاکھوں روپے کا جڑاؤ گہنا ہاتھ گلے میں تھا۔ پور پور نارنول کی مہندی رچی ہوئی تھی۔ ڈھیلے پائنچوں کو دو دو لونڈیاں اٹھائے چلتی تھیں تو دو باندیاں پیچھے دوپٹہ سنبھالے چلتی تھیں۔ آگے آگے روشن چوکی، اور نفیری بجانے والیاں سب عورتیں تھیں۔ بیگموں کے جھانجن، چوڑیوں اور پازیب کی جھنکار سے زندوں اور مردوں کے دل کانپتے تھے۔ قنات در قنات یہ سب درگاہ شریف پہنچے۔ باجے گاجے سب آستانے کے باہر ہی تھما دئے۔ ملکہ جہاں اور سب عورتیں فرخ سیر والی جالیوں تک جا کر رک گئیں۔ اگرچہ ساری درگاہ کو زنانہ ہو رہا تھا عورتوں کے لیے ہمیشہ سے یہی حد ادب ہے۔ بادشاہ اور مرزا جہانگیر اور سب مرد مزار شریف پر گئے اور پہلے غلاف اور پھر صندل چڑھایا، اوپر سے عطر لگایا۔ پنج آیت پڑھی گئی۔ شیرینی تقسیم ہوئی نقد نذرانہ جھجری میں بھر دیا گیا۔ بادشاہ زادے کو قدم بوس کرایا، اور سب حاجتی دعا کر کے قنات کے اندر پٹ کر سراپردۂ شاہی میں داخل ہوئے۔''

رعایا نے بھی اسی خوشی میں بادشاہ کا ساتھ دیا۔ خوب خوشی منائی اور پھولوں کا ایک چھپر کھٹ حضرت بختیار کاکی کے مزار پر چڑھایا۔ پھول والوں نے پھولوں کا ایک بڑا سا پنکھا چھپر کھٹ میں لٹکا دیا تھا۔ یہ رسم و روایت بعد میں بھی قائم رہی۔ بادشاہ کو یہ تقریب اس قدر پسند آئی کہ یہ میلہ ہر سال ہونے

لگا۔ دربارِ شاہی سے پھول والوں کے دو سو روپے مقرر ہو گئے تھے۔ یہ میلہ "پھول والوں کی سیر" کہلایا۔ شاہی ختم ہوئی، فرنگیوں کا راج بھی ختم ہوا۔ مگر دلّی کے منچلے اب بھی ہر سال برکھا رُت میں یہ میلہ مناتے ہیں اور خواجہ صاحب کے مزار پر پھولوں کا چھپر کھٹ اور پنکھا چڑھاتے ہیں۔

پہلے یہ غریبوں امیروں سب کا میلہ تھا، بعد میں غریبوں کا رہ گیا۔ امیر اپنی موٹروں میں دلّی سے قطب صاحب جاتے اور دو چار گھنٹے دل بہلا کر چلے آتے۔ مگر دلّی کے غریب بڑے حوصلہ مند تھے۔ کچھ دنوں پہلے سے اس کی تیاری شروع کر دیتے، قرض دام سے بھی نہ چوکتے۔ انہوں نے اپنی آن کے پیچھے لاکھ کا گھر خاک کر دیا۔

لیجیے، میلے کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ دستکاروں نے کرخنداروں سے دھیا نگیاں اور پیشگیاں لیں۔ نئے جوڑے سلوائے۔ چکن کے کرتے، بیلوں بھرے، آڑے پاجامے جن میں آدھی پنڈلی تک چوڑیاں۔ پاؤں میں سلیم شاہی سر پر سلمہ ستارے کی گول ٹوپی بھنڈی باڑ کی، تیل پھلیل لگایا۔ منہ میں گلوری دبائی۔ الائچی کی خوشبو اُڑتی ہوئی۔ کندھے پر چادرہ یا شالی رومال۔ دائیں بائیں دیکھتے عجب شان سے چلے جاتے ہیں۔ کیوں نہ ہو دلّی کے دل والے ہیں۔ یہ صرف آج کے آرام کو دیکھتے ہیں، کل کی کل دیکھی جائے گی، جس نے دیا ہے تن کو وہی دے گا کفن کو۔

ہاں تو آج چودھویں تاریخ ہے۔ مہرولی کے بازاروں میں وہ ریل پیل ہے کہ کبھی تھالی پھینکو تو سروں ہی سروں پر جائے۔ کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ کمزور کے چلنے کا بھرم ہی نہیں۔ ابھی یہاں کھڑے تھے۔ ابھی جوریلا آیا دیں پہنچے۔ دکانیں روشنی سے بقعۂ نور بنی ہوئی ہیں۔ سقے کٹورے بجا رہے ہیں اور ہر آنے جانے والے سے پوچھتے ہیں۔ "میاں آبِ حیات پلاؤں؟" مشک میں کنویں کا پانی ہے جس میں برف پڑی ہے۔ جی چاہا تو پانی پیا اور پیسہ دو پیسہ ہاتھ پر رکھ دیا۔

گگڑ والے کی عجیب شان ہے۔ قدِ آدم حقے میں کئی گز لمبی نے لگی ہے۔ حقہ کیا ہے دولہا ہے کہ سر سے پاؤں تک پھولوں میں لدا ہوا ہے۔ چاندی کی زنجیریں اور لٹو آویزاں ہیں۔ نے نیچی ہوتی ہے تو بازار والے باری باری کش لگاتے ہیں، اور اوپر ہوتی ہے تو بالا خانوں پر برآمدوں میں بیٹھے ہوئے لوگ دو دو کش لیتے ہیں۔ خمیرے کی لپٹیں اٹھ رہی ہیں اور سارا بازار مہک رہا ہے۔

مغرب کے بعد جھرنے میں نفیری کی آواز آئی اور ساری خلقت ادھر ڈھل گئی۔ پنکھا جھرنے سے اٹھایا۔ یہ پھولوں کا بڑا سا پنکھا ہے جس میں مقیش اور پنّیاں لگی ہوئی ہیں۔ ہنڈوں کی روشنی میں پنکھا جگر جگر

کررہا ہے۔آگے آگے ڈھول تاشے والے۔ان کے پیچھے دلّی کے اکھاڑے۔ہر اکھاڑے کے استاد اور پٹھے ہیں جو اپنے اپنے کمالات دکھاتے چلے آتے ہیں۔کوئی لیزم ہلا رہا ہے۔کوئی تلوار کے ہاتھ دکھا رہا ہے، کوئی خنجر کے وار کر رہا ہے۔کہیں بانک، پٹہ بنوٹ کے کرتب ہیں۔اکھاڑوں کی ایک لمبی لین ڈوری چلی گئی ہے۔ان کے پیچھے نفری والے ہیں۔کٹورے بجانے والے سقّوں کی ٹولیاں بھی ہیں۔یہ سقّے موٹے برنجی کٹورے ایک ایک ہاتھ میں دو دو لے کر بجاتے ہیں اور بجانے میں لے کی ایسی تراش خراش کرتے ہیں کہ بے اختیار منھ سے سبحان اللہ نکل جاتا ہے۔ڈھول تاشے کے ساتھ مٹکتے اور پینترے بدلتے جاتے ہیں۔یہی کیفیت ڈنڈے والوں کی ہے۔بڑے ناز و انداز سے گھیرے میں گھومتے اور ایک دوسرے سے ڈنڈے ٹکراتے ہیں دیکھنے والے ان کے مٹکنے پر ریجھے جاتے ہیں۔

سب سے آخر میں پنکھا ہے جس کے آگے شہنائی بجتی آتی ہے۔اس کے پیچھے پھول والوں کے غول ہیں۔یہ جلوس آہستہ آہستہ بازار میں گزرتا ہے بالا خانوں سے پھول برستے ہیں، گلاب چھڑکا جاتا ہے۔ہنرمند فنکاروں کو لال سبز دوپٹے دیے جاتے ہیں۔

کوئی بارہ بجے تک یہ جلوس جوگ مایا کے مندر پہنچتا ہے۔ایک بجے تک پنکھا چڑھا کر لوگ واپس آتے ہیں۔اگلے دن اسی دھوم دھام سے حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کی درگاہ میں پنکھا چڑھتا ہے۔اس سے فارغ ہو کر سب کے سب شمسی تالاب پر پہنچتے ہیں۔یہاں آتش بازی چھوڑی جاتی ہے۔دلّی کے آتش بازوں کو اپنا ہنر دکھانے کا اس سے بہتر موقع بھلا کب اور کہاں مل سکتا ہے۔جھپ پر مہتابی کے چھٹتے ہی طرح طرح کی آتش بازی چھوٹنے لگتی ہے اور وہ روشنی ہوتی ہے کہ رات کو دن ہو جاتا ہے۔اور شمسی تالاب کا پانی پگھلا ہوا سونا بن جاتا ہے۔چار پانچ گھنٹے تک یہ آتشیں گل بوٹے کھلتے رہے۔آتش بازی کے ساتھ میلہ ختم ہوا اور تھکے ہارے سیلانی صبح ہوتے اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس آئے۔اتنے میں فجر کی اذان ہو گئی۔اب سونے کا بھلا کیا وقت رہ گیا؟ اپنے رب کا شکر ادا کرو کہ اس نے یہ بہار دکھائی۔نماز پڑھی، ناشتہ کیا اور سب کے ساتھ اپنی سواریوں میں دلّی روانہ ہو گئے۔

بڑی ننھی نے کہا: "نانی اماں، یہ سیر تو بڑے مزے کی رہی۔"

نانی اماں بولیں: "ہاں بیٹی غنیمت ہے"

چھوٹی ننھی تنک کر کہا "نانی اماں آپ کو تو آج کل کے زمانے کی کوئی بات نہیں پسند آتی۔"

نانی "بی ان آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے اور ان کانوں نے جو کچھ سنا ہے اس کے آگے آج کل کوئی

بات نہیں جچتی۔ اب اس سیر ہی کو لے لو جیسی ہمارے بچپن میں ہوتی تھی ویسی تو ہم نے بھی نہیں دیکھی۔

بڑی ننھی: "اچھا تو اگلے وقتوں میں اس میں کیا چار چاند لگے ہوئے تھے؟"

نانی: "ہاں بی چار چاند لگے ہوئے تھے۔ یہ میلہ بادشاہ کی سرپرستی میں ہوتا تھا، اور بادشاہ خود اس میں شریک ہوتے تھے۔ وہ دھوم دھام ہی کچھ اور تھی۔ لال قلعہ کی کوکھ ہری تھی، الغاروں دولت بھری پڑی تھی۔ لذ ونو سنا ہے تو بھورا بھورا سبھی کو پہنچتا ہے۔"

چھوٹی ننھی: "اچھا تو بتایئے نا آپ کے زمانہ میں سیر کیسی ہوتی تھی؟"

نانی: "یہ شہر آبادی کا ذکر ہے، غدر پڑنے سے پہلے کا۔ مجھے پورا ہوش بھی نہیں آیا تھا۔ ہاں ہمارے ہاں ایک مغلانی آیا کرتی تھیں۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں، گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں، منہ میں کوئی دانت نہیں تھا۔ سر پر روئی کے گالے سے بال، دھان پان سی آدمی تھیں، وہ سنایا کرتی تھیں اس سیر کا حال کہتی تھیں کہ ...

"مہینوں پہلے بادشاہ کے ہاں پنکھے کی تیاریاں ہو جاتی تھیں بادشاہی محل جھاڑ جھوڑ، فرش فروش، چلمنوں پردوں سے آراستہ کر دیا جاتا۔ ایک دن پہلے محل کا تانتا روانہ ہوتا۔ خاصگی رتھوں میں تورے داریں۔ تصرفی میں سب کارخانے والیاں، نوکریں، چاکریں، لونڈیاں، باندیاں ہوتیں۔ خواجے سپاہی ساتھ چلے جاتے۔ دوسرے دن بادشاہ سوار ہوتے۔ بیگمات اور شاہزادے پالکی اور عماریوں میں ساتھ ہوتے۔ شہر کے باہر سواری آئی، جلوس ٹھہر گیا، سلامی اتار کر رخصت ہوا۔ چھڑی سواری ہوا اور یا سایہ دار تخت یا چھ گھوڑوں کی بگھی میں خواجہ صاحب میں داخل ہوئے۔ سنہری بگھی اور پالکی نما بنگلہ، اور جھبہ، ان پر کلسیاں ہیں، کوچبان لال لال بانات کی قمریاں، پھندنے دار گردان ٹوپیاں کلابتونی کام کی پہنے ہوئے، گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھے ہانکتے جاتے ہیں۔ آگے آگے سانڈنی سوار، پیچھے سواری کا رسالہ آبدار جھنڈا لئے، چوبدار عصا لئے، گھوڑوں پر سوار، بگھی کے ساتھ ساتھ اڑے جاتے ہیں۔ بادشاہ محل سے لے کر تالاب اور جھرنے اور امریوں اور ناظر کے باغ تک زنانہ ہو گیا۔ جا بجا سراپچے کھنچ گئے، سپاہی اور

فوجوں کے پہرے لگ گئے کیا مقدور غیر مرد کے نام ایک پشہ بھی کہیں دکھائی دے جائے۔ محل کی جنگلی ڈیوڑھی سے بادشاہ ہوادار میں اور ملکہ زمانی تام جھام میں اور سب ساتھ ساتھ سواری کے جھرنے پر آئے۔ بادشاہ اور ملکہ زمانی بارہ دری میں بیٹھے اور سب ادھر اُدھر سیر کرنے لگے۔ کڑھائیاں چڑھ گئیں، پکوان ہونے لگے۔ امریوں میں جھولے پڑ گئے۔ سودے والیاں آ بیٹھیں۔

ایک کھڑی ایک کو ہلسا رہی ہے "اے بی زناخی، اے بی دشمن، اے بی جانِ من! اچھی چلو پھسلنے پتھر پر سے پھسلیں۔" وہ کہتی ہیں "اے بی ہوش میں آؤ۔ اپنے حواسوں پر سے صدقے دو۔ اپنے عقل کے ناخن لو، کہیں کسی کا ہاتھ منہ تڑوا دو گی۔" انا دوا سمجھانے لگیں "واری، کہیں بیویاں، بادشاہ زادیاں بھی پتھروں سے پھسلتی ہیں۔ لونڈیوں اور باندیوں کو پھسلواؤ اور آپ سیر دیکھو۔"

چلو بی، میں تمہارے پھلا سڑوں میں نہیں آتی۔ تم یوں ہی پھپھڑ دلالے کیا کرتی ہو۔ نہیں نہیں ہم تو آپ ہی پھسلیں گے۔"

شام ہو گئی، جسولنی نے آواز دی "خبردار ہو، بادشاہ سوار ہوئے۔"

وہ سب کچھ پھینک پھانک سواری کے ساتھ ہوئیں۔ نوکریں چاریں گٹھڑی مٹھڑی سمیت سنبھال پیچھے لتو پتو کرتی دوڑیں۔

پندرہ دن تک روز اسی طرح جھرنے اور تالاب اور لاٹھ کا زنانہ ہو گا۔

تین دن سیر کے باقی رہے، پھول والوں نے بادشاہ کو عرضی دی دو سو روپے جیب خاص سے ان کو پنکھے کی تیاری کے لئے مرحمت ہوئے۔ تاریخ ٹھہر گئی۔ شہر میں نفیری بج گئی۔ جھرنے کا زنانہ موقوف ہوا۔

اب شہر کی خلقت آنی شروع ہوئی۔ جمعرات کے دن سارے شہر کے امیر و غریب، دکاندار، ہزاری بزاری جمع ہو گئے۔ شہر سنسان ہو گیا۔

اب تیسرا پہر ہوا۔ ادھر شہزادوں کی سواری، اُدھر پنکھے کی تیاری ہونے لگی۔ شہر کے امیر و غریب اچھے اچھے رنگ برنگے کپڑے پہن کر بج دھج، نئی نرالی نوکھی انوٹ، انوکھی وضع سے اپنے اپنے کمروں، برآمدوں، چھجوں، کوٹھوں

اور چبوتروں پر ہو بیٹھے۔

آہاہا! دیکھنا، وہ پھول والوں کے پنکھے کس دھوم سے آئے۔ کیا بہار کے پنکھے ہیں! آگے پھولوں کی جھڑیاں، ہزارے چھوٹتے، نفیری والے مٹکتے ٹھنکاتے، روپے رولتے چلے آتے ہیں۔ پیچھے شہزادے ہاتھیوں پر سوار، آگے سپاہیوں کی قطار، تاشہ مرفہ بجاتے ہوئے، پیچھے خواص میں مختار بیٹھے مورچھل کرتے ہوئے، نقیب چوبدار پکارتے ہوئے "صاحب عالم پناہ" چلے آتے ہیں۔ ان کے پیچھے اور امیر امراء کے ہاتھی چلے آتے ہیں۔ اس دھوم دھام سے شام کو شاہی محلوں کے نیچے پنکھے آئے اب نفیری والوں کی سیر دیکھو، کیسی جان توڑ توڑ کر نفیری بجا رہے ہیں۔ خواجے اوپر سے ان کی جھولیوں میں چھنا چھن روپے پھینک رہے ہیں۔ انعام لے لے کر رخصت ہوئے۔ پنکھے جا جا کر درگاہ میں چڑھا دیئے۔

رات بھر ناچ رنگ کی محفلیں ہوئیں۔ ڈھولک، ستار، طنبورہ کھڑکتا رہا۔ صبح سونے چاندی کے چھلے، انگوٹھیاں، اِکے، نونگے، پوتھوں کے لچھے، موتیوں کے ہار، اور لال، سبز، اُودے، بجر نگے سوت کے دوڑے، پنکھیاں، پراٹھے، پنیر، کھویا، یہاں کی سوغاتیں لے لوا چلنا شروع کیا۔ شام تک سب میلہ بھرّی ہو گیا۔

بادشاہ ساری برسات یہیں گزاریں گے۔ سیر و شکار، کل سلطنت کے کاروبار سر انجام ہوتے رہیں گے۔ جو بیگماتیں سیر میں نہیں آئیں انہوں نے اپنے چھوٹوں کو قلاقند، موتی پاک، لڈو کی ہنڈیاں آنے سے منھ بند کر کے چٹھیاں لگا اور بٹوے میں اشرفیاں روپے ڈال کر چوبداروں اور خواصوں کو انعام میں دے اور اُن کے لئے سوغاتیں یہاں سے بھیجیں۔

لو صاحب! پھول والوں کی سیر ہو چکی۔"

(اقتباس از بزم آخر)

○○○

چوک کی بہار

دنیا میں بڑی بڑی مسجدیں بھی ہیں اور ایک سے ایک خوب صورت مسجد بھی۔ مگر دلّی کی جامع مسجد بڑی بھی ہے اور خوب صورت بھی۔ کہتے ہیں کہ شاہجہاں نے اس کا نمونہ خواب میں دیکھا تھا۔ اسے مسجد جہاں نما بھی کہتے ہیں۔ تعمیری نقطۂ نظر سے اس مسجد کی بے شمار خوبیاں گنائی گئی ہیں جنھیں بیان کرنے کے لیے پوری پوری کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ایک نمازی جو پابندی سے جامع مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے انھوں نے بتایا کہ مسجد کے اندر جہاں پیش امام صاحب کھڑے ہوتے ہیں سامنے ایک سنگ مرمر لگا ہوا ہے۔ اس دودھیا پتھر میں یہ خوبی ہے کہ جب مشرق میں کرنیں پھوٹتی ہیں تو یہ پتھر گلابی ہو جاتا ہے۔ ہمیں تو اس کا مشاہدہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ سنا ہی سنا ہے۔ البتہ ایسا سنگِ مرمر ہم نے دیکھا ہے جس میں سے روشنی چھنتی ہے۔ شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کے مزار کے سرہانے جو چراغ دان ہے اس کے طاقچوں میں چراغ جلائے جاتے ہیں تو دوسری طرف روشنی پھوٹتی رہتی ہے۔ آگرے کے قلعے میں جو حمام ہیں ان میں بھی ایک جگہ ایسا سنگِ مرمر ہے جس سے اجالا حمام کے اندر پہنچتا ہے۔

بعض روایتیں نہ جانے کیسے مشہور ہو جاتی ہیں؟ کہا جاتا ہے کہ جب جامع مسجد بن کر تیار ہو گئی تو بادشاہ نے آن کر اس کا معائنہ کیا۔ قطب نما رکھ کر جب قبلہ کو جانچا تو معلوم ہوا کہ کچھ فرق رہ گیا ہے۔ بادشاہ نہایت مایوس اور رنجیدہ ہوئے مگر ایک درویش رونما ہوئے اور انھوں نے پائے والوں کی طرف جو مسجد کا کونہ ہے اس سے پشت لگا کر مسجد کو سیدھا کر دیا اور فوراً ہی دم بھی دے دیا۔ بادشاہ نے ان بزرگ کی قبر اسی مقام پر بنوا دی۔ اتفاق سے آج بھی وہاں چند قبریں موجود ہیں۔ لہٰذا اس روایت میں اور بھی جان پڑ گئی۔ مگر کسی تاریخ کی کتاب میں اس عجیب و غریب کارنامے کا ذکر نہیں ملتا۔

ہاں تو دلّی کی جامع مسجد بہت اونچی کرسی دے کر بنائی گئی ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے نیچے

ایک پوری پہاڑی دبادی گئی ہے۔ شہر میں اور بھی کئی پہاڑیاں ہیں جن پر مکان بنتے چلے گئے ہیں۔ پہاڑی دھیرج، بھوجلہ پہاڑی۔ املی کی پہاڑی اور چڑے والی پہاڑی۔ یہ سب خاصے بڑے پتھریلے ابھار ہیں جن پر خوب گنجان آبادیاں ہیں۔ بڑے بڑے غدار محلے ہیں جن میں پیچ در پیچ گلیاں ہیں اور ہزاروں گھر بستے ہیں۔ ایسی ہی ایک پہاڑی جامع مسجد کے نیچے دبی پڑی ہے۔ مسجد کے جنوبی، مشرقی اور شمالی رخ بڑی بڑی چوڑی چوڑی سیڑھیاں ہیں جن پر لمبی لمبی پتھر کی سلیں جڑی ہوئی ہیں۔ جہاں سیڑھیاں اوپر جا کر ختم ہوتی ہیں وہاں خاصی بڑی کشادہ جگہ ہے۔ اس جگہ پر سیڑھیاں تین طرف سے آ کر ختم ہوتی ہیں۔ ہر دروازے کی سیڑھیوں کا یہی ڈھنگ ہے۔ مشرقی رُخ کی سیڑھیاں اور ان پر کی کھلی جگہ کا نام "چوک" پڑ گیا۔ یہ چوک ایک تاریخی مقام کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہی چوک دلّی کا دبستان اردو بھی تھا۔

شاہی کے زمانے ہی سے یہاں ایک انوکھی وضع کا بازار تھا۔ یہ مجھ کی جگہ تھی جہاں شام کو دلّی والے سمٹ آیا کرتے تھے۔ دھوپ سنولائی اور اس بازار کی رونق شروع ہوئی، دن ڈھلے سیلانیوں کی ریل پیل شروع ہو جاتی اور مغرب کے لگ بھگ یہاں کھوے سے کھوا چھلنے لگتا۔ پچھلی بڑی جنگ کے زمانے میں یہ بازار اجڑ گیا کیونکہ آرائشِ شہر کے محکمے نے اس بازار کو یہ کہہ کر اٹھوا دیا کہ اس سے مسجد کی خوشنمائی میں فرق آتا ہے۔ اردو بازار کے سنگھاڑے میں کچھ دکانیں اٹھ گئی تھیں۔ مگر صدیوں کا شیرازہ بکھر گیا اور چوک کی بہار لٹ گئی۔

دلّی والوں کو چوک سے عشق تھا۔ یہ صرف ہاٹ بازار ہی نہیں تھا، ایک ادارہ تھا تمدن کا۔ ایک اشارہ تھا تہذیب کا۔ میر باقر علی ہوتے تو اس چوک کی داستان سناتے۔ خواجہ ناصر نذیر فراق یا فرحت اللہ بیگ ہوتے تو اس چوک کا مفصل حال لکھتے۔ وہ پیاری پیاری زبانیں گنگ ہو گئیں اور وہ شاداب قلم سوکھ گئے۔ وہ جیتے رہتے تو موتی برساتے۔ میں صرف آنسو ٹپکا سکتا ہوں۔ ایلو! میں بھی کہاں سے کہاں بہک گیا؟! اچھا سنیے:

جیٹھ اساڑھ کی گرمی۔ آسمان تانبا ہو رہا ہے۔ سورج آشوبی آنکھ کی طرح سرخ، آگ برسا رہا ہے۔ لُو کے تھپیڑے لگ رہے ہیں زمین جھلس رہی ہے۔ بازار ویران ہو گئے ہیں۔ دکان داروں نے خس کی ٹٹیاں اور پردے لگا لیے ہیں۔ ان پر پانی چھڑکا جا رہا ہے۔ امیروں کی حویلیوں میں خس خانے اور برفاب کا اہتمام ہے۔ غریبوں کے کھنڈلوں میں بھی ہرے جوانسے کی ٹٹیاں اور گیلے پردے لٹکے

ہوئے ہیں۔ چارپائیوں پر سے بستر ہٹا دیے گئے ہیں اور ان پر پانی کا چھینٹا دے دیا ہے۔ بان گیلا ہو کر ٹھنڈا ہو گیا اور سوندھی سوندھی خوشبو دینے لگا۔ ذرا پنکھا جھلا کہ جھپکی آ گئی۔ حویلیوں میں تہہ خانے ہیں جن میں گرمی کا گزر نہیں ہوتا۔ جن کا دم تہہ خانوں میں گھٹتا ہے انھوں نے دالانوں کے کھلے رخوں پر خس کی ٹٹیاں چڑھوا دی ہیں ان پر پانی کے تڑیڑے پڑ رہے ہیں۔ ٹبوں میں برف کی سلیں رکھی ہیں۔ ان کے قریب بجلی کا فرشی پنکھا اس طرح رکھا ہوا ہے کہ ہوا کا فراٹا برف کی سل سے ٹکراتا ہوا آتا ہے۔ یخ بستہ جھونکے آ رہے ہیں۔ گلاب اور کیوڑا چھڑکا جا رہا ہے۔ ہزارے چھوٹ رہے ہیں، ہلکے ہلکے اندھیرے میں بھینی بھینی خوشبو پھیل رہی ہے۔ باہر آگ برس رہی ہے اور اندر ایسی خنکی کہ شملہ مسوری میں بھی کیا ہو گی۔

دوپہریوں گزری، دن ڈھلا۔ تکلفات برطرف کر دیے گئے۔ صحن میں تخت بچھے ہیں۔ ان پر دری چاندنی کا اجلا اجلا فرش ہے۔ چھڑکاؤ کا بھبکا نکل چکا ہے۔ گڑھل، صندل، فالسہ، انار کا شربت بڑے سے بڑے بادیے میں بنا رکھا ہے۔ اس میں کیوڑہ، بید مشک، تخم ریحان اور کچلی ہوئی برف پڑی ہے۔ اتنے یہ ٹھنڈا ہو جھٹ نہا دھو جوڑا بدل تیار ہو گئے۔ چاندی کے جھجھاتے ہوئے کٹوروں میں شربت پیا۔ پان کی گلوری منہ میں دبائی اور چوک کا رستہ لیا۔

ادھر غریبوں نے حسب حیثیت ستو، پنا، آبشورہ، افشردہ پیا کہ تونس سے بچے رہیں۔ دلی کے دل والے جنم کے سیلانی جیوڑے، کپڑے پہن کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ٹہلتے ٹہلتے جامع مسجد پہنچے۔ چوک پر میلہ سا لگ رہا ہے۔ کیوں نہ ہو؟ آٹھ دن تو میلوں کا شہر ہے۔ خوب ٹھیا گھیا ہے۔ چھنکار، کٹورا بجاتا چلا آتا ہے۔ "میاں! آبِ حیات پلاؤں؟ میاں صابر صاحب کے کنوئیں کا ہے۔" ذرا ٹھٹکے کہ اس نے برنجی کٹورے میں ٹھنڈا برف سا پانی پیش کر دیا۔ پانی پیا پیسہ دیا اور آگے بڑھ گئے۔ لو وہ گگڑ والا چلا آتا ہے، خمیرے کی لپٹیں اڑ رہی ہیں۔ کمر پر چمڑے کا تھیلا ہے جس میں تمباکو اور کوئلے ہیں۔ ایک ہاتھ میں بڑا سا حقہ ہے۔ خوب تازہ کیا ہوا۔ اس پر موتیا کے گجرے لپٹے ہوئے ہیں۔ چلم پر سرپوش جما ہوا ہے۔ نے کے سرے پر چاندی کی منہنال، جس میں چاندی کی زنجیروں کا گچھا لٹکا ہوا ہے۔ "میاں شربت کے سے گھونٹ آ رہے ہیں۔"

"ہاں بھئی کیوں نہ ہو؟ حقہ پیر دوزی کا" دو کش لیے۔ دھواں اڑایا۔ پیسہ اس کا ہاتھ پر رکھا اور آگے بڑھ گئے۔

سیڑھیوں کے قریب پہنچے۔ برف کی قلفیوں والا ہنڈا لیے بیٹھا ہے۔ ربڑی کی، پستے کی برف ہے۔ "آیئے ملائی کی قلفیوں میں، لوٹے ہو رہے ہیں ملائی کے۔" جی چاہا تو دو قلفیاں کھائیں۔ سامنے گرما گرم پکوان اُتر رہا ہے۔ بڑے سے کڑھاؤ میں تیل کھول رہا ہے۔ پھلکیاں، پالک کے پتے، قلمی بڑے جھپا جھپ اُتر رہے ہیں۔ لونگ چڑے، تی کے کباب، پانی کی پھلکیاں، قیمے کی گولیاں، مچھلی کے کباب الگ الگ قرینے سے لگے ہیں۔ گاہک پر گاہک گر رہا ہے۔ وار نہیں آتا۔ دونا بھر کر ایک ہاتھ سے گاہک کو تھما دیا اور دوسرے ہاتھ سے پیسے لے لیے۔ بیٹھنے کا انتظام بھی ہے۔ جی چاہے تو یہیں بیٹھ کر کھایئے۔ جی چاہے تو ساتھ لے جایئے۔

ایک کڑھاؤ میں سے گرما گرم میٹھی بھری کچوریاں اُتر رہی ہیں۔ ان کا مزہ آلو کی ترکاری ہی کے ساتھ ہے۔ برابر میں دہی بڑے والا بڑا سا لگن لیے بیٹھا ہے۔ قیمہ بھرے دہی بڑے ہیں۔ دہی میں بڑا ڈبویا اور نکال کر ایک طشتری میں رکھا۔ سفید نمک، کالا نمک، لال مرچیں، کالی مرچیں پسی ہوئی۔ ایک ایک چٹکی اوپر سے بُرک دی۔ اوپر سے دہی ڈال چمچا لگا گاہک کے حوالے کیا اور آواز لگائی۔ "یاد کروگے، یاد کروگے ہمارے دہی بڑوں کو۔ یہ دہی کی چاٹ ہے۔ پیاروں کی چاٹ ہے۔" ایک سرخ کپڑے پر دکان کی پیشانی پر لکھ کر لگا دیا ہے:

"دہی بڑے کا قیمہ اس کا جوہر شیریں ہے؟"

"ارے بھئی، اس کا کیا مطلب ہے؟"

"جی حضرت مطلب وطلب تو میں کچھ جانتا نہیں۔ پر بات اس کی یہ ہے کہ شیریں یعنی دودھ اور قیمے ہی کا یہ سارا کھیل ہے۔"

"بھئی واہ! کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔"

چٹ پٹے دہی بڑے جو کھائے تو آنکھ اور ناک سے پانی جاری ہو گیا۔ سُو سُو کرتے کھیر والے کے پاس پہنچے۔ مٹی کے پیالوں میں کھیر جمی ہے اس پر چاندی کا ورق لگا ہے اور پستے کی ہوائیاں پڑی ہوئی ہیں۔ انگشتِ شہادت سے کھیر نوش کی۔ منہ ٹھکانے ہوا۔

چرخ چوں، چرخ چوں کی آواز آئی۔ انگاروں پر کلیجی اور تکے کی سیخیں سنک رہی ہیں ان سے ذرا دور انہی کی طرح کا چرخی پنکھا لگائے میاں مسیتا گولے کباب والے اپنی گدی پر جمے ہوئے ہیں۔ دہکتے انگاروں پر سیخیں پلٹتے جاتے ہیں اور خالی سیخیں بھرتے جاتے ہیں۔ ان کے کباب

سارے شہر میں مشہور ہیں۔ یہ بڑے اصول کے آدمی ہیں۔ ایک تسلہ قیمے کا گھر سے بنا کر لاتے ہیں اور دو گھنٹے میں اپنا سودا بیچ باچ کر چل دیتے ہیں۔ گاہکوں کو نمبر سے کباب دیتے ہیں۔ لگے بندھے گاہک ان کی عادت سے واقف ہیں کہ "چچا" کسی کی دھونس میں نہیں آتے۔ اول تو بولتے ہی نہیں اور اگر کوئی انھیں چکارے تو وہ لچھے دار باتیں کرتے ہیں کہ مزہ آ جاتا ہے۔ بہت خرانٹ آدمی ہیں۔ جب تپا بڑھتا ہے تو دوسروں پر رکھ کر گالیاں تک دے جاتے ہیں، مگر ان کا خاص لہجہ اور دلی والوں کی عام بول چال کا انداز ایسا بھلا لگتا ہے کہ گاہک انھیں ادبدا کر چھیڑتے ہیں جب کسی دن کوئی نیا پکھیرو پھنس جاتا ہے تو چچا بہت جز بز ہوتے ہیں کہتے ہیں:

"دیکھا حضت آپ نے، یہ باہر والے کیسے گاؤدی ہوتے ہیں؟ ان کے کسی کام میں ذرا بھر رک نہیں ہوتی۔ ایک ساں بسر ہوئے جا ریا ہے کہ پہلے مجھے کباب دے دو۔ میں کے ریا ہوں کہ بیٹا ذرا چھری تلے دم تو لے۔ جب تیرا لبر آئے گا تو تیرے تیئں بھی دوں گا۔ مگر مارے زلدی کے اس کی۔ "

انہیں بکنے جھکنا چھوڑیے۔ وہ دیکھیے مجمع کیسا ہے؟ اوفوہ! ان کی تو تالو سے زبان ہی نہیں لگتی۔ ان کا تو تانتو اتو تا ہوا ہے۔

"دتم اتنگن، بوٹی رتن۔"

او ہو یہ تو سبزی منڈی والے حکیم جی ہیں۔ یہ صاحب چار پیسے کی پڑیا بنا کر دیتے ہیں جس میں ۳۲ دوائیں ہوتی ہیں۔ بتیسے کی یہ پڑیا دنیا بھر کی بیماریوں کو دور کرتی ہے۔ یہ بڑے نامی اشتہاری حکیم ہیں۔ انھیں ۵۰ سال ہو گئے، روزانہ شام کو اسی جگہ مجمع لگاتے ہیں ور دھڑلے سے اپنی پڑیاں بیچتے ہیں۔

انھیں دیکھیے یہ رمال ہیں۔ رمل کا حساب پھیلاتے ہیں، جفر بتاتے ہیں۔ ہاتھ بھی باچتے ہیں۔ قسمت کا لکھا ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر فر فر سنا دیتے ہیں۔ مگر نصیب کے ایسے بیٹے ہیں کہ اپنی بگڑی نہیں بنا سکتے۔ اللہ رزاق ہے۔ حیلے رزق بہانے موت۔ انھیں بھی دھیلی بارہ آنے مل جاتے ہیں۔

ان سے ذرا آگے ایک بزرگ دراز ریش ایک خوبصورت سا پنجرہ لیے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے ایک بیا اچھلتا پھر رہا ہے۔ پنجرے کے آگے لفافے چنے ہوئے ہیں۔ انھیں ایک پیسہ دیجیے یہ صاحب پنجرے کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ بیا باہر نکلتا ہے اور یک لفافہ نکال کر انھیں دیتا ہے۔ اس میں کیا لکھا ہے؟ آپ خود نکال کر پڑھ لیجیے۔

"عن قریب تمہیں کوئی بڑی خوشی ہونے والی ہے۔" ایک پیسے میں یہ خوش خبری مہنگی نہیں ہے۔ آیئے اب اوپر سیڑھیوں پر چلیں۔

کھانچوں اور پنجروں میں دنیا بھر کے پرندے ہیں۔ کبوتر بہت ہیں۔ لال بند، نیل بند، نگوے، لوٹن، لقہ، سراج مکھی، شیرازی، گولے، کلسرے، للسرے، نسادرے، بیسیوں قسم کے کبوتر ہیں۔ اصیل مرغ ہیں۔ بطخیں ہیں۔ بلبل، کنیرے، بئے، طوطی، دیئو، ہزارداستاں، اگن بستیوں جڑے خوشنما پنجروں میں بند۔ تیتر کے جوڑے نخچیوں میں۔ بٹیر، لال، پدڑیاں، طوطے، کاکتوے، شکرے، بہری، باز، پہاری، مینائیں، بنگالی مینائیں، قمریاں غرض ہر قسم کے پرندے موجود۔

ان صاحب کو دیکھیے، پدڑیاں کیسی سدھائی ہیں کہ دو ڈھائی سو کا غول پنجرہ کھول کے چاہے جہاں اُڑا دیتے ہیں اور دور دور تک چکر کاٹ کر پدڑیاں پھر پنجرے میں واپس آ جاتی ہیں۔ خلیل خاں کو فاختہ اُڑاتے نہیں دیکھا تو کیا غم۔ پدڑیاں اُڑاتے تو ہم نے بھی دیکھ لیا۔ یہی حال کبوتروں کا ہے۔ غول کے غول اُڑائے جاتے ہیں۔ دوسری ٹکڑیوں میں مل جاتے ہیں۔ اور پھر اپنے اپنے کھانچے پر اُتر آتے ہیں۔

اچھا اب ذرا سیڑھیوں کے دوسرے رخ پر چلیے۔ ادھر کاٹ کباڑ کی تھڑیاں لگی ہوئی ہیں۔ ان میں پرانی اور نایاب چیزیں بھی ہیں۔ رسالوں اور کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ کتابوں کا سودا جلد پر ہوتا ہے اس لیے بعض دفعہ کوئی بڑی قیمتی کتاب کوڑیوں کے مول یہاں سے مل جاتی ہے۔ ان سے آگے پرزے بیچنے والے ہیں۔ یہ جو بھی مشین کباڑ میں خرید کر لاتے ہیں اس کے انجر پنجر الگ کر دیتے ہیں اور خریداروں سے ایک پیسے کا ایک روپیہ وصول کرتے ہیں۔ دلی کے بعض کباڑیے اسی وجہ سے لکھ پتی ہو گئے تھے۔

سیڑھیوں کے پہلو میں تہہ بازاری ہے جس میں کپڑے والوں کی دکانیں ہیں۔ یہاں سستا کپڑا بڑی افراط سے ملتا ہے۔ چند دکانیں جوتے والوں کی ہیں۔ یہ اپنی چھوٹ کے لیے مشہور ہیں۔ گاہک سے مول تول کرنا کوئی ان سے سیکھے۔ تیس روپے کا جوتا پانچ روپے میں دے دیتے ہیں۔ دلی والے تو خیر ان کے ہتھکنڈوں سے خوب واقف ہیں مگر باہر والے بڑی بری طرح ان میں منڈتے ہیں۔ گاہک کو جوتا دکھا کر کہتے ہیں:

"دوں؟"

جب وہ نہیں لیتا تو کہتے ہیں'

''کیوں اچھا نہیں لگا؟''

اور اگر خرید لیتا ہے تو کہتے ہیں

''جا چودھری تو بھی کیا یاد کرے گا۔ تجھے ہم نے گھاٹے سے دے دیا۔ اب بڑا سستا پڑ گیا تجھے۔''

سیڑھیوں کے سامنے ہرے بھرے صاحب اور سرمد شہید کے مزار ہیں۔ ہرے بھرے صاحب کے مزار پر سبز رنگ کا غلاف ہے اور سرمد کے مزار پر سرخ رنگ کا۔ ان کے سامنے سقے مشکیں بھرے کھڑے رہتے ہیں اور آوازیں لگاتے ہیں:

''بھر دے خواجہ کے مشکوں میں بھر دے۔ پیاسے پئیں گے دعائیں دیں گے۔''

جمعرات کے جمعرات یہاں قوالی ہوتی ہے۔ حال قال کی محفل ہوتی ہے اور خوب حال اور وجد آتے ہیں۔

ان مزاروں کے بائیں جانب ایک بڑا مجمع لگا ہوا ہے۔ ذرا دیکھیں تو یہاں کیا ہو رہا ہے؟ ایک صاحب کالے بھجنگ زلفیں کھولے جھاج سی ڈاڑھی پھیلائے کھڑے ہیں۔ ان کے گلے میں سانپ گجروں کی طرح پڑے ہوئے ہیں۔ ایک ہاتھ میں کوڑیالا بل کھا رہا ہے۔ دوسرے ہاتھ میں ایک آنکرا ہے۔ سامنے سینکڑوں منہ بندھی ہنڈیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ان سب میں وضع وضع کے سانپ ہیں۔ ایک کالا ناگ زمین سے ہاتھ بھر اٹھا ہوا لہرا رہا ہے۔ دو سانپ جیبی بنے اندر ہی اندر بل مار رہے ہیں۔ ان سے ذرا ہوشیار رہیے۔ یہ اڑ کر چمٹ جاتے ہیں۔ استاد کلن نے ہاتھ کا سانپ تو ایک ہنڈیا میں بند کیا اور دوسری ہنڈیا میں سے ایک خاکی رنگ کا بڑا بے جین سا سانپ نکالا۔ بتا رہے ہیں کہ یہ دھامن ہے۔ گھوڑے سے تیز بھاگتی ہے اور بھینس کے پیروں میں لپٹ کر دودھ پی جاتی ہے۔ دس بیس سانڈے بے حس و حرکت پڑے ہیں۔ ایک خاموش گیند بنا پڑا ہے۔ دو بڑا گوئیں ہیں۔ بھاری بھاری پتھروں سے بندھی ہوئی۔ فرماتے ہیں کہ

''کسی زمانے میں کمند ڈالی جاتی تھی تو گوہ کی کمر میں رسہ بندھا ہوتا تھا۔ اسے گھما کر عمارت پر پھینک دیا جاتا تھا۔ یہ جہاں گرتی وہاں چپک جاتی بس پھر رسے پر سے چڑھ جایا کرتے تھے۔''

''ور بھلا یہ موڑ کے ناگ یہاں کیوں ڈال رکھے ہیں؟''

''میاں صاحب یہ تار نہیں ہیں اژدھے ہیں۔ یہ یونہی بے حس و حرکت پڑے رہتے ہیں۔''

''اماں چلو یہاں سے۔ یہ تو سانپوں کا جہنم ہے۔ یہ صاحب ان سانپوں کا کیا کرتے ہیں؟''

''تماشہ دکھاتے ہیں۔ ہنڈیوں میں سے طرح طرح کے سانپ نکال کر دکھاتے ہیں۔ لوگ خوش ہو کر پیسے پھینکتے ہیں۔ سانپ کاٹے کی دوا دو چار پیسے میں دیتے ہیں۔ سانپ کاٹے کو جھاڑتے بھی ہیں اور گھروں میں جو سانپ نکل آتے ہیں انھیں بھی پکڑتے ہیں۔ دن بھر جنگلوں میں گھوم پھر کر سانپ پکڑتے ہیں اور شام کو ان کا تماشہ دکھاتے ہیں۔

ان کے پیچھے ایک اور ہجوم ہے۔ ڈگڈگی اور بانسری کی آواز آرہی ہے۔ یہ مداری ہے جو شعبدے دکھا کر پیسے جمع کرتا ہے۔ مزے مزے کی باتیں کرتا ہے۔ ایک جمہورا سامنے بٹھا رکھا ہے۔ یہ گویا معمول ہے۔ جادو وادو انھیں خاک نہیں آتا۔ لیکن ہاتھ کی صفائی اچھی ہے۔ سوکھی گٹھلی سے آم کا پودا چشم زدن میں پیدا کر دیتے ہیں۔ ذہت بندی کے اچھے خاصے تماشے دکھاتے ہیں۔ ساتھ کے ساتھ سارے مجمع کا چکر کاٹ کر اپنے کشکول میں پیسے جمع کرتے جاتے ہیں۔ ہر پھیرے میں کچھ نہ کچھ آ ہی جاتا ہے۔ کوئی ایک پیسہ دیتا ہے تو کہتے ہیں:

''جو اس کا جوڑ بنائے گا اللہ اس کا جوڑا بنائے گا۔''

دوسرا پیسہ کسی نہ کسی طرف سے آجاتا ہے۔

آخر میں سانپ اور نیولے کی لڑائی دکھانے کے وعدے پر سارے مجمع کو روک رکھا ہے۔ مغرب کے لگ بھگ شعبدے ختم ہوتے ہیں۔ دیکھنے والے اصرار کرتے ہیں تو یہ اپنا کشکول گھماتے ہیں اور روپیہ سوا روپیہ جمع ہو جاتا ہے۔ مگر اتنے سے پیسوں میں وہ بھلا اپنا سانپ نیولے سے مروا دیں؟ چنانچہ سارے مجمع کو برا بھلا کہتے جاتے ہیں اور اپنا سامان سمیٹتے جاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنا جھورا اور ڈنڈا اٹھا یہ جا وہ جا!

OOO

شام کی چہل پہل

جامع مسجد کے جنوبی سیڑھیوں پر کوئی باز نہیں تھا۔ اکثر فقیر اور کنگلے ان پر پڑے رہتے تھے۔ ایک مجذوب ہیں مادر زاد ننگے، نابینا ہیں، حافظ جی کہلاتے ہیں۔ خاک میں لوٹتے رہتے ہیں۔ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا حافظ جی کو ایک سا دیکھا۔ انہیں دلّی والے بڑا جلالی بتاتے تھے۔ طرح طرح کی روایتیں ان کے بارے میں مشہور ہیں۔ پولیس نے انہیں کئی بار جیل میں بند کیا مگر سنتے ہے کہ وہ باہر نکل آتے ہیں۔ ابھی کلکتہ میں موجود اور ابھی دلّی میں آگئے۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا کرتے ہیں۔ ضرورت مند اور عقیدت مند انہیں گھیرے رہتے ہیں۔ کوئی دودھ کا آبخورہ ہاتھ میں لیے انہیں پلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کوئی دونے میں مٹھائی لیے حاضر ہے۔ مگر حافظ جی نہ تو کچھ کھاتے ہیں اور نہ پیتے ہیں۔ سب کو دھتکارتے ہی رہتے ہیں۔ شہر کے بعض رئیس بھی ان کے معتقد ہیں۔ جو بات ان کے منھ سے نکلتی ہے ہو کر رہتی ہے۔ جواری اور سٹے باز انہیں گھیرے رہتے ہیں۔ ان کی بڑبڑ سے اپنے مطلب کی بات نکال لیتے ہیں۔ لگ گیا تو تیر ورنہ تکا۔ دو کہار انہیں ڈولی میں ڈال کر مقررہ گھروں پر لے جاتے ہیں اور صاحب خانہ کہاروں کو دو دو روپے دیتے ہیں۔ حافظ جی کے آنے کو یہ لوگ باعث برکت سمجھتے ہیں۔ ہم نے ان کی کوئی کرامت تو دیکھی نہیں البتہ یہ ضرور دیکھا کہ دلّی کی بربادی سے پہلے حافظ جی خاک بہت اُڑانے لگے تھے۔ مٹھیاں بھر بھر کے خاک اُڑایا کرتے تھے۔ لوگ پوچھتے:

"حافظ جی، یہ کیا کر رہے ہو۔"

وہ کہتے "اب تو خاک ہی اڑے گی۔"

اور ۱۹۴۷ء میں جیسی خاک اڑی وہ ہم نے بھی دیکھی اور آپ نے بھی۔ دلّی کو لوکا ہی لگ گیا۔

ان سیڑھیوں کے مغربی پہلو میں تہہ بازاری ہے۔ سامنے ٹرام کا ٹکٹ گھر ہے۔ سارے شہر کی

نرامیں یہاں آکر دم لیتی ہیں۔ ایک بوڑھا نابینا فقیر خواجہ میر درد کی غزل۔

جس لیے آئے تھے سو ہم کر چلے
تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے

بڑی دردناک دھن میں سناتا رہتا تھا۔ اس کی آواز دور ہی سے سنائی دینے لگتی ہے۔ اس نے مطلع میں خاصی تحریف کرلی ہے۔ مگر اس تصرف میں مزہ آگیا۔

کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے
تہتیں چند اپنے ذمے دھر چلے

خواجہ میر درد کے جانشین خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی اس فقیر کو ایک روپیہ دے کر یہ غزل سنا کرتے تھے۔ مؤدب بیٹھ جاتے تھے اور ہر شعر پر جھومتے رہتے۔ جب وہ یہ شعر پڑھتا۔

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

تو ان کی ایک آنکھ ساون اور ایک بھادوں بن جاتی۔ عجب کیف کا عالم ان پر طاری ہو جاتا تھا۔ فراق مرحوم نے اس مطلع کی تحریف پر نابینا کو کبھی متوجہ نہیں کیا۔ اس کی صدا سنتے اور آنکھیں چھلکنے لگتیں۔

☆ ☆ ☆

کباب آہو۔

چوک کے شور کو چیرتی ہوئی ایک آواز گونجی۔ اس آواز میں کوہ ندا کی سی کشش ہے۔ دیکھیے یہ صاحب جو بجلی کے ہنڈے کے نیچے اپنا خونچہ لیے بیٹھے ہیں یہ آواز انہی کی ہے۔

''کیوں بھئی تم کیا بیچتے ہو؟''

''حضور، کباب آہو۔''

یہ کہہ کر انہوں نے جو منہ اوپر کو اٹھایا تو ان کی کوڑیوں جیسی آنکھیں ہنڈے کی روشنی میں چمکیں۔

''ارے یہ بے چارا تو اندھا ہے۔''

خوانچے والے نے سن لیا۔ بولا:

''بچپن میں سیتلا نکلی تھی، آنکھیں جاتی رہیں۔''

''اچھا تو تم ہی کباب بناتے ہو۔''

''جی نہیں حضور۔ سودا سلف بازار سے لے آتا ہوں۔ گھر والی کباب تیار کر دیتی ہے۔ ہم بس دو ہی دم ہیں۔ اللہ کی مہربانی سے گزارہ ہو جاتا ہے۔''

''بھئی تم بڑے ہمت والے غیرت مند آدمی ہو۔ کوئی کم ہمت ہوتا تو بھیک مانگنے لگتا۔''

''جی حضور چلتے ہاتھ پاؤں کسی کے آگے ہاتھ پسارنا اچھا نہ لگا''

''اچھا اپنے کباب تو کھلاؤ۔''

اندھے نے دو طشتریوں میں دو دو شامی کباب رکھ کر ایک طرف چٹنی کی ٹکڑی رکھ دی۔ اوپر سے پیاز کا لچھا ڈال گاہکوں کے حوالے کیا۔ بولا:

''حضور آج واقع میں ہرن ہی کے کباب ہیں۔''

''اچھا! ہرن کا گوشت تم کہاں سے لائے؟''

''جی ہمارے پڑوس میں ایک شکاری رہتے ہیں۔ ان سے مجھے ہرن کا گوشت مل جاتا ہے۔''

''اور جب نہیں ملتا تو؟''

''تو حضور، بازار سے بکری کا گوشت لے لیتا ہوں اور شامی کباب کی آواز لگاتا ہوں۔''

''بھئی تم ایماندار آدمی ہو۔ یہ لو''

''گاہکوں نے ایک روپیہ دیا اور چلنے کو ہوئے تو اندھے نے کہا ''بابو جی ٹھہرئے۔'' اور خوانچے میں ٹٹول کر بارہ آنے انہیں واپس دے دیئے۔''

''نہیں نہیں، تم یہ بارہ آنے بھی اپنے پاس رکھو۔''

نہیں حضور، یہ نہیں ہو سکتا۔ چار کبابوں کے چار آنے ہی ہوتے ہیں۔''

''مگر ہم تو خوشی سے تمہیں ایک روپیہ دے رہے ہیں۔''

اللہ آپ کو خوش رکھے۔ یہ مجھ سے نہ ہوگا۔''

بہت کہا مگر اندھا نہ مانا۔ بارہ آنے اس سے واپس لینے پڑے۔

بھئی یہ دلی ہے۔ یہاں بڑا بڑا شوھ مغز اپڑا ہے۔ بھلا وہ کسی کی خیرات زکوۃ کیوں لینے لگا؟ چلو اپنی راہ ہو۔

☆☆☆

جہاں اب ہم کھڑے ہیں وہ ایک چھوٹا سا چوراہا ہے۔ جامع مسجد کے جنوبی رخ ہماری پشت ہے۔ دائیں ہاتھ کو ایک راستہ سنگھاڑے سے لگا لگا چاوڑی بازار کو چلا جاتا ہے۔ یہ وہی چاوڑی ہے جس کے بارے میں راسخ نے کہا ہے۔

چاوڑی قاف ہے یا خلد بریں ہے راسخ
جمگھٹے حوروں کے، پریوں کے پرے رہتے ہیں

تیس پینتیس سال پہلے تک چاوڑی کے سارے بالا خانے آباد تھے اور تیسرے پہر ہی سے بجنے شروع ہو جاتے تھے۔ ادھر شام کا جھٹ پٹا ہوا اور اُدھر اندر کا اکھاڑا چاوڑی میں اترا۔ پیشہ ور عورتیں بن سنور کر بالا خانوں کے برآمدوں میں آبیٹھیں۔ یہ عموماً باہر والیاں ہوتی تھیں، پاتریں کہلاتی تھیں۔ خاندانی یا ڈیرے دار طوائفیں سر بازار نہیں بیٹھتی تھیں۔ ان کے علیحدہ کمرے ہوتے تھے، یا مکان ہوتے تھے۔ ان کے ہاں ایرے غیرے نتھو خیرے جا بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ پیشہ بھی نہیں کماتی تھیں۔ کسی ایک رئیس کی پابند ہوتی تھیں، البتہ جانے پہچانے شرفاء ان کے ہاں جایا کرتے تھے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھتے، شائستہ گفتگو ہوتی۔ شعر و شاعری، بولی ٹھولی، ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں، گانے کی محفل ہوتی۔ خیال ٹھمری، دادرا، غزل گائی جاتی۔ ڈیرہ داریوں میں شرفا کے گھروں کا ماحول ہوتا تھا۔ کوئی بیہودگی، کوئی بدتمیزی روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ جبھی تو دلی کے اگلے شرفا اپنے بچوں کو تمیز و شائستگی سیکھنے کے لیے ان کے ہاں بھیجا کرتے تھے۔

غروب آفتاب کے بعد چاوڑی کے بالا خانے بقعۂ نور بن جاتے۔ طبلے کھڑکنے لگتے، تانیں اُڑنے لگتیں، تھئی تھئی ناچ ہوتا۔ شوقین مزاج منچلے کمروں میں جا کر گانا سنتے، ناچ دیکھتے اور حسب توفیق پان کی تھالی میں روپے رکھ کر چلے آتے۔ یہ گانے ناچنے والیاں اچھے استادوں سے فن سیکھتی تھیں۔ گھر گھران کے مجرے ہوتے تھے۔ کئی کئی سو کی پشوازیں پہن کر ناچتی تھیں۔ ان کی کسی محفل کا حال بھی ہم کبھی آپ کو سنائیں گے۔ یہ بازار چونکہ جامع مسجد کے مغربی رُخ پر تھا اس لئے دیندار مسلمانوں کو اس پر اعتراض تھا۔ برسوں اسے یہاں سے اٹھوانے کی کوشش کی گئی مگر اس بازار میں جائداد ہندوؤں کی زیادہ تھی اور میونسپل کمیٹی میں بھی ہندو ممبروں کی تعداد زیادہ تھی اس لیے یہ بازار مدتوں تک جما رہا۔ مگر جب لاہوری دروازے سے اجمیری دروازے تک دونوں طرف کے پہلوؤں کی زمین نیلام ہو گئی اور ایک نیا بازار بن گیا تو اسے آباد کرنے کے لیے کرایہ داروں کی ضرورت پیش آئی۔ اب جو مسلمانوں نے

چاوڑی سے رنڈیوں کو ہٹانے کا مطالبہ پیش کیا تو ہندوؤں نے بھی ایک نئی تحریک چلائی کہ شہر کے وسط میں رنڈیوں کا رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے، لہذا انہیں اٹھا دینا چاہیے۔

یہاں سے اٹھا کر انہیں کہاں جگہ دی جائے؟

نئے بازار میں۔

لو صاحب، چاوڑی خالی ہوگئی اور نیا بازار آباد ہوگیا۔ اس کا نام نئی چاوڑی پڑ گیا تھا۔ سڑک کا نام برن بیچین روڈ تھا۔ اس لیے آگے چل کر یہ نیا رنڈی بازار صرف ''روڈ'' کہلانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جنگل میں منگل ہوگیا۔ سارے کرشمے پیسے کے ہیں۔

جامع مسجد کے جنوبی چوراہے کے سامنے والا راستہ مٹیا محل کا بازار ہے۔ بائیں ہاتھ کو مچھلی والوں کا بازار ہے۔ اس میں پہلے صرف انڈا، مرغی، مچھلی ور گوشت کی دکانیں تھیں۔ کوئی چالیس سال سے اس میں کتابوں کی دکانیں کھلنی شروع ہوگئی تھیں۔ رفتہ رفتہ اس بازار میں کتابوں کی دکانوں کی کثرت ہوگئی۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے بھی اسی بازار میں ایک بہت بڑا کتب خانہ ''دی حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی'' کے نام سے قائم کیا تھا۔ خواجہ صاحب کی سرکردگی میں تمام کتب فروشوں نے کوشش کر کے اس بازار کا نام پلٹوا کر ''اردو بازار'' رکھوایا۔ شاہی زمانے میں اسی کے قریب ایک اردو بازار تھا بھی جو خانم کے بازار وغیرہ کے ساتھ کھد گیا اور ان بڑے بڑے بازاروں کی جگہ پریڈ کا میدان بن گیا۔

اردو بازار کی بڑی بڑی دکانوں میں کتابوں کی ایک بڑی دکان ''کتب خانہ علم وادب'' کہلاتی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں دلّی کے اجڑنے تک مغرب اور مغرب کے بعد اس کتب خانے پر شہر کے اکثر شاعر اور ادیب جمع ہوتے تھے۔ کتب خانے کے مالک سید وصی اشرف صاحب ادیب دوست اور متواضع آدمی تھے۔ شام کو اپنا کاروبار چھوڑ کر اہل علم وادب کی خاطر تواضع میں لگ جاتے تھے۔ شاہ جہانی دیگ کی کھرچن بھی شام کو یہیں مل سکتی تھی۔

وہ دیکھیے استاد بیخود دہلوی اپنی ہزارہ تسبیح دونوں ہاتھوں میں گھماتے خراماں خراماں چلے آتے ہیں۔ مٹیا محل سے یادگار تک ٹہلنے جاتے ہیں واپسی میں کتب خانے پر کچھ ضرور لیتے ہیں۔ انہیں روزانہ ایک ناول پڑھنے کے لیے چاہیے ہوتا ہے کتب خانے سے ان کی یہ ضرورت پوری ہوتی رہتی ہے۔ ٹکسالی زبان اور ٹنتالی محاورے بولتے ہیں، خاص دلّی والوں کے لہجے میں۔ ان کی گالیوں میں بھی ایک چٹخارہ ہوتا ہے۔

نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی بھی روزانہ جامع مسجد اور اردو بازار کا پھیرا کرتے ہیں۔ عجیب شاندار بزرگ ہیں۔ چوگوشیہ، انگرکھا، آڑا پاجامہ اور پاؤں میں انگوری بیل کی سلیم شاہی۔ سائل صاحب کو دیکھ کر منھ سے بے اختیار سبحان اللہ نکل جاتا ہے۔ آخر عمر میں کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ چلنے پھرنے سے اپاہج ہو گئے ہیں مگر شام کو اردو بازار میں اپنی رکشا میں بیٹھ کر ضرور آتے ہیں۔ بیخود صاحب اسی سال سے اوپر ہو گئے ہیں اور سائل بھی اسی ہی کے پیٹے میں ہیں۔ یہ دونوں بزرگ استاد داغ کی یادگار ہیں۔ دلی کی شاعری کا وقار ان ہی دونوں کے دم قدم سے قائم ہے۔

ایک اور اسی سال کے بزرگ میر ناصر علی "صلائے عام" والے ہیں۔ فراش خانے سے روزانہ چوک تک پیدل آتے ہیں اور پرانی چیزیں دیکھ بھال کر چلے جاتے ہیں۔ پیدل چلنا ان کی وضعداری میں داخل ہے۔ پیچھے پیچھے ایک ملازم حاضر رہتا ہے۔ کچھ خریدتے ہیں تو اس کے حوالے کرتے ہیں۔

ان بزرگوں سے کم عمر والوں میں علامہ راشد الخیری ہیں، قاری سرفراز حسین ہیں، واحدی صاحب ہیں اور عارف ہسوی ہیں۔ ان کا جی چاہتا ہے تو کبھی چوک پر بھی آجاتے ہیں ورنہ ان کی نشست شام کو یادگار میں رہتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی بستی نظام الدین میں رہتے ہیں مگر روزانہ شہر ضرور آتے ہیں۔ اور اردو بازار میں سے ضرور گزرتے ہیں ان کی لٹریچر کمپنی تو کبھی کی ختم ہو چکی مگر ایک چھوٹی سی دکان میر قربان علی بسمل کی ہے۔ میر صاحب خواجہ صاحب سے کچھ بڑے ہی ہیں، صرف خوجہ صاحب کی کتابیں بیچتے ہیں۔ کبھی ایک رسالہ دلی سے "اردوئے معلیٰ" نکالتے تھے۔ خواجہ صاحب نے ان کی دوستی کو آخر تک نبھایا۔ خواجہ صاحب کا ایک بہت اچھا مکان اردو بازار کے پرلے سرے پر ہے جس کا نام انہوں نے "اردو منزل" رکھا ہے۔ اس مکان کے لیے انہوں نے اپنے ٹائل الگ بنوائے ہیں جس پر "ہر گھر اردو" اور "گھر گھر اردو" لکھوایا ہے۔ دلی کی آخری بہار انہی بزرگوں کے دم سے تھی۔ ان کا مفصل حال بھی انشاء اللہ آپ کو کبھی سنائیں گے۔

لیجئے وہ مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔ نمازی جامع مسجد میں داخل ہونے لگے۔ چوک کی رونق چھٹنے لگی۔ خوانچے والوں نے دو شاخے روشن کر لیے۔ تہ بازاری میں بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے۔ سیلانی جیوڑے تو ابھی کہیں اور ہوا کھائیں گے۔ اڈے پر سے تانگے کریں گے، دلی دروازے کی سڑک پر دوڑ لگائیں گے۔ فراٹے کی ہوا کھائیں گے۔ چٹورپن سے پیٹ تو بھرا ہوا ہے ہی، رات گئے گھر آئیں گے۔ جنہیں جلدی گھر پہنچنے کی عادت ہے انہوں نے گھر کا رخ کیا۔ ٹمیا محل کے بازار

کے نکڑ پر پہنچتے ہی خوشبو کا بھپکا آیا۔ سامنے پھول والوں کی دکانیں ہیں۔ بڑی بڑی چھبڑیوں اور چنگیروں میں لال لال گیلا قند بچھا ہوا ہے، اس پر چنبیلی کا ڈھیر پڑا مسکرا رہا ہے۔ ایک طرف گجرتی موتیے کی لپٹیں آ رہی ہیں۔ چھبڑی میں کھلنے سے پہلے ہوئے ہیں۔ جوہی کی ڈالیاں قرینے سے بھری رکھی ہیں۔ مولسری کی لڑیاں ہیں منھ بند کلیوں کی چمپا کلیاں ہیں۔ پھولوں اور مقیش کے جھومر ہیں۔ کلیوں اور بادلے کی سرا سریاں ہیں، کرن پھول ہیں، جھمکے ہیں، مانگ پٹیاں ہیں، بسس جال ہیں، طرّے ہیں، بدھیاں ہیں، کنگن ہیں، کلیوں کی چوہے دنتیاں ہیں، پہونچیاں ہیں، آرسیاں ہیں، ہار ہیں، گجرے ہیں، چمپا کی گنڈیاں ہیں۔ ایک طرف ٹوکرے میں گلاب اور گیندے کے پھول بھرے ہیں۔ بیلا، موگرا، ورزرد چنبیلی کی کچھ اور ہی بہار ہے۔ ہرے ہرے ڈھاک کے پتوں کے دونوں میں تول تول کر پھول ڈالے جا رہے ہیں۔ پھولوں کے گہنے اکواں بکتے ہیں۔ دن والے تیل پھلیل اور پھولوں کے عاشق ہیں۔ منوں کے موں پھول تلتا اور بکتا ہے۔ منڈیوں اور دکانوں کے علاوہ پھیری والے چھبے بھرے محلے محلے اور گھر گھر پھول بیچتے پھرتے ہیں، اور سب پھول بک جاتے ہیں۔

پھول لے کر آگے بڑھے کہ حلوائیوں کی دکانیں شروع ہو گئیں۔ سجی سجائی دکانوں میں مٹھائیاں تھالوں میں چنی ہوئی ہیں۔ حلوائی کے ہاں سے دو ایک ٹوکریاں بندھوائیں اور لدے پھندے گھر پہنچے۔ بچے دوڑ کر پٹ گئے۔ بیوی کی باچھیں کھل گئیں۔ سچ ہے "ہنستے ہی گھر بستے ہیں۔"

○○○

چٹورپن

دلّی والے بڑے چٹورے مشہور تھے۔ انہیں زبان کے چٹخاروں نے مار رکھا تھا۔ کچھ مردوں ہی پر موقوف نہیں، عورتیں بھی دن بھر چرتی رہتی تھیں۔ اور کچھ نہیں تو پان کی جگالی ہوتی رہتی تھی۔ بنگلہ پان تو غریب غربا بھی نہیں کھاتے تھے۔ جب دیسی پان افراط سے ملتا ہو تو موٹے پتے کون چبائے؟ دو ڈھائی آنے میں ڈھولی ملتی تھی۔ یہ بڑے بڑے پان، اور ایسے کرارے کہ پان اگر ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرے تو اس کے چار ٹکڑے ہو جائیں۔ ۱۹۴۲ء تک چھالیا پرانی رول کی روپے کی چار سیر آتی تھی۔ کتھا کلکتہ کا دو روپے سیر۔ چونے کی کلھیاں پان والوں کے پاس رکھی رہتی تھیں۔ چونے کے دام نہیں لیے جاتے تھے۔ پان خریدیے اور چونا مفت لیجیے۔ پان والے گلی گلی پھر کے بھی پان بیچا کرتے تھے۔ ایک پیسے کے چھ، ایک پیسے کے آٹھ۔ پٹاری ہر گھر میں ہوتی تھی۔ فوری خاطر پان ہی سے کی جاتی تھی۔ پان کی تھالی میں عموماً کوئی شعر کندہ ہوتا تھا۔ مثلاً

دست نازک بڑھایئے صاحب
پان حاضر ہے، کھایئے صاحب

یا

برگِ سبز است تحفۂ درویش
چہ کند؟ بے نوا ہمیں دارد

اتنے اچانک آجانے والا پان ختم کرے بازار سے مٹھائی، کچھ سلونا اور موسم کا میوہ آجاتا۔ پھر مہمان کی خوب خاطر تواضع کی جاتی۔ دلّی والے متواضع بھی بہت تھے۔ قرض کریں دام کریں مہمان پر اپنا بھرم کھلنے نہیں دیتے تھے۔ دلّی کے غریب کماتے بھی خوب تھے مگر اپنی عادتوں کے پیچھے محلے کے

بنئے کے قرض دار اکثر رہتے تھے۔ گروی گانٹھ بھی یہی بنیا کرتا تھا۔ اصل چیز اس کے پاس رکھنے کے بعد پھر ہاتھ نہیں آتی تھی۔ سود در سود میں برابر ہو جاتی تھی۔ یہ گھونس اکثر امیروں کے گھروں میں لگی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی بڑی بڑی حویلیاں بنیوں نے چپ چپاتے ہڑپ لی تھیں، مگر خوش باشوں اور بے فکروں کو اس کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ ہم نے اکثر لاکھ کے گھر خاک ہوتے دیکھے۔ لال کنوئیں پر ایک مسلمان رئیس کا بے مثل کتب خانہ برسوں کوڑیوں کے مول بکتا رہا۔

جزرس اور کنجوس آدمی کو دلی والے منحوس سمجھتے تھے اور اس کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ جو کبھی صبح ہی صبح کسی ایسے کی شکل اتفاقاً دکھائی دے جاتی تو کہتے "خدا خیر کرے، دیکھئے آج کیا افتاد پڑتی ہے۔" اکثر ہوتا بھی یہی تھا کہ ان کے وہم کی وجہ سے کوئی نہ کوئی پریشانی پیش آتی۔

کہتے ہیں کہ بادشاہ کے زمانے میں ایک ایسا ہی منحوس شہر میں تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کی صورت دیکھ لی جائے تو دن بھر روٹی نہیں ملتی۔ شدہ شدہ بادشاہ تک اس کی شکایتیں پہنچیں تو بادشاہ نے کہا "نہیں جی، کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے؟" شکایت کرنے والوں نے کہا "حضور ہوتا ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، تجربہ کر دیکھئے۔" چنانچہ ایک دن صبح کو بادشاہ برآمد ہوئے تو لگانے والوں نے اس شخص کو بادشاہ کی نظر سے گزار دیا۔ اللہ کی شان اس دن دو مقدمے آکر ایسے اڑے کہ دن کا تیسرا پہر ہو گیا اور خاصا تناول فرمانے کا وقت نکل گیا۔ بادشاہ سلامت کو جب جتایا گیا تو انہوں نے فرمایا۔ "ہاں ہاں، یہ شخص تو واقع میں منحوس ہے۔ پیش کرو اسے ہمارے حضور میں"۔ حکم کی دیر تھی اس غریب کو عصا برداروں نے پکڑا اور کشاں کشاں لے آئے۔

بادشاہ نے فرمایا "اماں تم بڑے منحوس ہو۔ جو تمہیں دیکھ لیتا ہے اسے روٹی نہیں ملتی۔ لہٰذا تمہیں موت کی سزا دی جاتی ہے۔"

آدمی تھا حاضر جواب۔ بولا "حضور والا، میں تو اتنا منحوس ہوں کہ مجھے جو دیکھ لیتا ہے اسے روٹی نہیں ملتی۔ مگر میں نے آج حضور کے دیدار کیے تو اپنی جان ہی سے چلا۔"

بادشاہ ہنس پڑے، اور اس کی جان بخشی فرمائی۔

دلی والوں کی ایک کہاوت تھی کہ "ایک داڑھ چلے، ستر بلا ٹلے۔ کھانے کا تھک جانا ہی روگ کی جڑ ہے۔" دلی والے گھر میں بھی اچھا کھاتے تھے اور باہر بھی۔ غریبوں میں تو سبھی گھر والیں کھانا خود پکاتی تھیں۔ البتہ روٹی ڈالنے کے لیے ماما رکھی جاتی تھی۔ بغیر گوشت کے غریبوں کے حلق سے بھی روٹی نہیں

اُترتی تھی۔ اور گوشت ہی کونسا مہنگا تھا؟ چھوٹا گوشت چار آنے سیر اور بڑا چھ پیسے سیر۔ جمعہ کو گوشت نہ ہونے کے باعث دال پکتی تو اس پر بھی دو دو دانگل گھی کھڑا ہوتا۔ خالص گھی روپے سیر تھا۔ اڑد کی دال اور کھچڑی پر گھی کا ڈلا رکھ دیا جاتا۔ سادی ترکاری کو ہندوؤں کا کھانا بتایا جاتا۔

اس زمانے میں دلّی میں ہوٹلوں اور چائے خانوں کا رواج بالکل نہیں تھا۔ بھٹیار خانے البتہ ہوتے تھے۔ جن میں پائے اور اُجھڑی پکائی جاتی تھی۔ دو پیسے میں پیالہ بھر کے ڈھب ڈھب شوربہ مل جاتا تھا۔ دو پیسے کی خمیری روٹیاں لے کر اس میں چُوری جاتیں اور غریب مزدور چار پیسے میں اپنا پیٹ بھر کر کام پر سدھار جاتا۔ مگر دلّی کے دست کار یا محنت کش ان چیزوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ پوریوں، کچوریوں، مٹھریوں اور حلوے مانڈوں کا ناشتہ کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ ''میاں جب ہمارے ہی دھڑ میں کچھ نہیں پڑے گا تو پھر کمائے گا کون؟''

شام ہوتے ہی چوک کی بہار شروع ہو جاتی۔ جامع مسجد کے مشرقی رخ جو سیڑھیاں ہیں ان پر اور ان کے پہلوؤں میں ہر قسم کا سودا بکتا تھا۔ یہیں شام کا چٹورپن بھی ہوتا تھا۔ سستے سے تھے، ایک پیسے میں چار سودے آتے تھے۔ دستکار شام کو دھیا نگیاں لے کر آتے، دھیلی پاؤلا گھر میں دیتے، باقی اپنی انٹی میں لگاتے۔ کارخانے یا کام پر سے گھر آنے کے بعد میلے کپڑے اُتارتے اور نہا دھو کر اُجلا جوڑا پہنتے اور چھیلا بن کر گھر سے نکلتے۔

میاں شبّو کی سج دھج تو ذرا دیکھئے! سر پر چنی ہوئی دوپلی، بالوں میں چنبیلی کا تیل پڑا ہوا، خس کا پھویا، بیچ کی مانگ نکلی ہوئی، چکن کا کرتہ، اس کے نیچے گلابی بنیان۔ سیدھے بازو پر سرخ تعویذ بندھا ہوا کرتے میں سے جھلک رہا ہے۔ چست پاجامہ، لاہور کا ملاگیری ازار بند، ڈھکا چھپا ہونے پر بھی اپنی بہار دکھا رہا ہے، پاؤں میں انگوری بیل کی سلیم شاہی، ٹھمک چال، اپنے ڈنٹر قبضوں کو دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ دن بھر لنگوٹ کسے ہتھوڑا چلاتے ہیں تو شام کو دو روپے پاتے ہیں۔ مگر نیتیں اچھی تھیں اس لئے پیسے میں بھی برکت تھی۔ شب برات پر پیدا ہوئے تھے، یوں نام شبراتی رکھا گیا تھا جو مخفف ہو کر شبو رہ گیا۔

ہاں تو میاں شبو سلام جھکاتے اور سلام لیتے ''میاں والیکم سلام، میاں جیتے رہئے، میاں سلامت رہئے۔'' کہتے سوئی والوں سے چتلی قبر اور ٹیا محل کے بازار میں سے نکلتے ہوئے چوک پر پہونچ گئے۔ یہاں ان کے دو چار یار مل گئے۔ انہیں دیکھ کر ان کے چہرے پر شفق سی پھول گئی بولے ''ابے

خوب ملے۔ میں تو دل میں گھے ہی رہا تھا کہ اپنا کوئی یار مل جائے تو مزہ آجائے۔"

یاروں کی ٹولی ہنستی بولتی آگے بڑھی تو سامنے میاں سبحانہ قیمے کی گولیاں بنا بنا کر کڑھاؤ میں اوپر رخ سے ڈالتے جاتے ہیں۔ جب آٹھ دس اکٹھی ہو جاتی ہیں تو ایک ڈنڈی سے انہیں اونٹتے ہوئے تیل میں کھسکا دیتے ہیں۔ یاروں نے میاں سبحانہ سے صاحب سلامت کی۔ میاں شبو نے کہا" استاد کیا موتے ہو رہے ہیں؟"

سبحانہ بولے" میاں آؤ جی کرخندار۔ آج تو کئی دنا پیچھو تم نے صورت دکھائی۔ خیر تو ہے۔"

شبو بولے" کرخندار نے ناواں نکس دیا تھا، ورنہ اب تو ڑی تو تمہارے ہاں کے کئی پھیرے ہو جاتے۔ اچھا لاؤ، چار دونے تو بنا دو۔"

گولیاں ہی لو گے یا کچھ اور بھی رکھ دوں؟"

"اماں تم دیتے پر آؤ گے تو بھلا کیا رہنے دو گے۔"

اس ضلع جگت کے بعد میاں سبحانہ نے ڈھاک کے ہرے پتوں کے دونے بنا بنا کر دینے شروع کئے۔ قیمے کی گولیاں، مچھلی کے کباب، لونگ چڑے، تکہ کباب، پانی کی پھلکیاں۔ ان پر چٹنی کا چھینٹا مارا اور بولے" آج بڑا توفہ مال ہے، مزا آ جائے گا۔" اور واقع میں مزا آگیا۔ آنکھ اور ناک دونوں سے پانی ساون بھادوں کی طرح بہنے لگا۔

شبو سی سی کرتے ہوئے بولے" اماں استاد، آج تو تم نے آگ لگا دی۔ دیکھتے ہو کیا حال ہو رہا ہے؟"

سبحانہ نے کہا" کرخندار، یہ نزلے کا پانی ہے نزلے کا۔ اس کا نکل جانا ہی اچھا۔ میاں سو بیماریوں کی جڑ ہے نزلہ۔"

اتنے میں سقہ کٹورا بجاتا ہوا آگیا۔" میاں آب حیات پلاؤں؟ صابر صاحب کے کنوئیں کا ہے۔"

سب نے کہا" بھئی اچھے وقت آ گئے۔ لاؤ۔"

برف جیسا ٹھنڈا پانی چمک کے موٹے موٹے کٹوروں میں ڈب ڈب کر دیا۔ سب نے ڈگڈگا کر پیا تو منہ کی آگ بجھی۔ پیسے دو پیسے سقے کو دے کر آگے بڑھے تو کھیر والا دکھائی دے گیا۔ ان بڑے میاں کی کھیر بھی سارے شہر میں مشہور ہے۔ بھئی واہ! ان کی ہر چیز سپید ہے! بڑے میاں کے بال،

بھنوئیں پلکیں، داڑھی، کھیر، لنگن پوش، سب سفید بڑاق۔ ایک ایک دو دو پیالے سب نے کھائے۔ جو سوندھ پن اور داغ کا مزا ان کی کھیر میں آتا ہے کسی اور کے ہاں نہیں آتا۔

آگے بڑھے تو پہلوان کو دیکھا کہ سنگھاڑے کے کونے پر ایک موڑھے پر بڑا سا ہنڈا دھرا ہوا ہے۔ ہنڈے پر لال کھاروا پانی میں تر بتر پڑا ہوا ہے اور پہلوان آواز لگا رہے ہیں۔ ''آنے والا دو دو پیسے۔''

یاروں کی ٹولی ان کے پاس پہنچی۔ ''کیوں پلوان کیا سارے گاہکوں کا مول دو دو پیسے لگا دیا ہے؟''

پہلوان بولے ''میاں میرے، میں تو اپنی قلفیوں کی آواز لگا رہا ہوں تمہارے تئیں کچھ نہیں کہ رہا۔''

شبو نے کہا ''اماں ہم سمجھے تم نے ہماری بھی وقات ٹکے کی سمجھ لی۔''

پہلوان بولے ''جی بھلا میں ایسی غستاخی آپ کی شان میں کر سکتا ہوں؟ آؤ بیٹھو۔ موڑھا لو۔ آج میں تمہیں پستے کی کھلاؤں گا۔''

یہ کہہ کر پہلوان نے ہنڈے میں ہاتھ ڈالا اور ٹٹول کر ایک بڑی سی مٹی کی قلفی نکالی، چلو سے اس کے منھ پر سے آٹا ہٹایا اور ڈھکنا الگ کر کے برف میں ایک چمچہ کھڑا کر دیا اور بولے ''لو تم یہ انخورا لو'' چاروں کو انہوں نے انخورے کھول کھول کر تھما دئے۔ بولے ''نرے پستے ہیں دودھ میں گھٹے ہوئے۔''

بہت عمدہ برف تھی، سچ مچ ہونٹ چاٹتے رہ گئے سب کے سب۔ چلتیوں کو جب دام پوچھے تو ایک روپیہ! شبو بولے ''آ کا یہ کیا؟ تم تو دو دو پیسے کی آواز لگا رہے تھے؟''

پہلوان نے کہا ''میاں میرے، دو پیسے والی بھی ہے میرے کنے، شربت کی۔ بھلا وہ تمہارے لاق ہے؟ رئیسوں کے کھانے کی یہی پستے کی ہوتی ہے۔ سارے شہر میں ہو آؤ جو ایسی کہیں مل جائے تو اپنے پیسے واپس لے جانا۔'' شبو اور ان کے یار بھلا اپنے آپ کو غریب کیسے تصور کر لیتے؟ بولے ''سچ کہتے ہو۔ تم جیسا مجاز دان اور ہم جیسا قدر دان بھی کم ملے گا۔ لو، تھامو یہ روپیہ۔''

چھنکتا ہوا روپیہ پہلوان کی گود میں آ پڑا۔

شبو نے آگے بڑھ کر کہا ''بھئی اب منھ سلونا کرنا چئے۔''

ایک ساتھی نے کہا "چچا پائے والے کے ہاں چلو۔"

دوسرا بولا "اماں کل ہی تو میں نے وہاں کے ہاں کے تکے کھائے تھے، آج کہیں اور چلو۔"

تیسرے نے کہا "اچھا تو چچا کے ہاں چلو۔"

یہ وہی چچا ہیں جن کا ذکر خیر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ چلئے ان کرخنداروں کے ساتھ بھی چل کر دیکھیں ان پر کیا گزرتی ہے۔

چچا کبابی پائے والوں کے رخ جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پہلو میں اکیلے بیٹھے تھے۔ پرانے زمانے کے آدمی تھے، بڑے بد دماغ، منہ پھٹ، یار لوگوں کو چھیڑ کر ان سے گالیاں کھانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ یاروں کی چوکڑی نے ادھر کا رخ کیا۔ شام کا جھٹ پٹا ہو چکا تھا۔ چچا کے تختے پر دو شاخہ جل رہا تھا۔ چچا سیخیں بھر بھر کر رکھتے جا رہے تھے اور ان کا لڑکا بندو پنکھا جھل رہا تھا۔ پانچ سات گاہک کھڑے تک رہے تھے اور چچا کو ذرا دم لگی ہوئی تھی۔ میاں شبو کو شرارت سوجھی، آگے بڑھ کر روپیہ چھنکا کر چچا کی طرف اچھالا۔ "بڑے میاں ایک روپے کے کباب دے دو زلدی سے۔"

چچا نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا، روپیہ اٹھایا اور اسی طرح سڑک پر اچھال دیا۔ پھر بغیر ان کی طرف دیکھے بولے "میاں، بھائی، بنے، تمہیں زلدی ہے تو کہیں اور سے لے لو۔ میں تو لبرے دوں گا۔ پہلے ان میاں کی دوتی لگی ہوئی ہے، انہیں نہ دوں تمہیں دے دوں؟ کل بھی تم سری کے ایک حرامی آئے تھے، میں نے ان سے کہا "دیکھو میاں، وہ دھر میرا بھائی اے وز بیٹھتا ہے، وہں سے لے لو۔ پیٹ بھی بھاری بھرتا ہے، فائدے میں رہو گے۔ بلکہ کوئی اور چیز نہ کھا لو بنے۔ یہ آگ کا کام ہے، گرم چیز ہے، تمہیں نقصان کرے گی۔" کوئی باہر والے تھے ان کی سمجھ میں آ گئی۔ روپیہ اٹھا کر چل دئے۔"

شبو بولے "مگر چچا ہم تو مریمو تسلیم نہیں۔ تم ہی سے کھا کے جائیں گے۔

"اے میرے میاں، میں کب کہتا ہوں کہ جاؤ؟ مگر ذرا چھری تلے دم تو لو، تم ہی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو اور میں زلدی کا کام کرتا نہیں۔ ان گاہکوں کو پہلے بھگتا دوں۔ اے لمڈے، قالین بچھا دے ان کے لئے چین سے بیٹھو، ہمیشہ کے آنے والے ہو پھر بھی ایسی نئے والی کی بات کرتے ہو۔ چپ بیٹھو۔"

لمڈے نے چھپے ہوئے ٹاٹ کا ٹکڑا چچا کے تختے کے پیچھے بچھا دیا۔ ٹاٹ میلا اور گندہ تھا،

چاروں اس پر اکڑوں ہو بیٹھے۔ کچھ دیر بعد چچا نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔ بولے "میاں بھائیوں، تنک کر بیٹھو اشرافوں کی تریوں یوں اٹھا دُچولہا کب تک بیٹھو گے؟ کیا آگ لینے آئے ہو؟ ہاں بولو کیا کیا دوں؟"

"چچا تم تو جانتے ہو چار آدمیوں کے لیے بنا دو اپنا نسخہ۔"

"بس تو چار سیخیں، چار بھیجے اور چار گھی کئے دیتا ہوں۔ چل بے لمڈے دو پیسے کی برف لے آ لپک کے، اور لا کر بالٹی میں پانی بنا دے۔ ابے آ گیا؟ سالے ابھی یہیں اینڈ رہا ہے۔ ابے تیتری ہو جا۔" اور بندہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔

چچا کے باپ دادا سب اسی جگہ بیٹھتے تھے۔ ان کے کباب بادشاہ کے دستر خوان پر جایا کرتے تھے۔ انہی کا نسخہ سینہ بہ سینہ چچا کو پہنچا تھا۔ قیمے میں کچھ اس حساب سے مسالے ملاتے تھے کہ جو بات ان کے کبابوں میں ہوتی تھی دلی کے کسی اور کبابی کے ہاں نہیں ہوتی تھی۔ چچا نے نسخے میں یہ اور اضافہ کیا کہ جو بیٹھ کر یہیں کھانا چاہیں ان کے لیے بھیجے اور گھی کا انتظام بھی کر لیا۔ بھیجا بکری کا ہوتا تھا۔ سیخیں جب سنک جاتیں تو انہیں غوری میں اُتار کر ان کے ڈورے نکال دیتے۔ پھر ایک بادیے میں چار کٹوریاں گھی ڈالتے۔ جب پیاز سرخ ہو جاتی تو چاروں سیخیں اور چاروں بھیجے اس میں ڈال کر گھونٹ دیتے۔ چنگیر میں خمیری روٹیاں رکھ کر کبابوں کی غوری انہوں نے میاں شبو کو تھما دی۔ پھر ایک چھوٹی سی غوری میں پیاز کا لچھا، ہری مرچیں، پودینہ، کیری کا لچھا، ادرک کی ہوائیاں رکھ دیں۔ ایک طرف نیبو اور گرم مسالہ رکھ دیا اور بولے "میاں یاد کرو گے چچا کو۔ ہم تو چلنہاروں میں ہیں۔ ایک دن سنو گے کہ چچا لد گئے۔ پھر تمہارے تئیں معلوم ہو گی قدر چچا کی۔

شبو بولے "چچا ایسے دل پھٹنے کی باتیں مت کرا کرو۔"

چچا نے کہا "نہیں میاں، میں سچ کہتا ہوں۔ بہت گئی تھوڑی رہی۔ اب تو میرے میاں چپلی کو اب کا زمانہ ہے کدی نام بھی سنا تھا اس کا؟ دلی والے اب گوبلے کے کباب نہیں جوتیاں کھائیں گے جوتیاں۔"

اس کے بعد چچا کا ناریل چٹخا اور مغلظات کا ایک دریا ان کے منھ سے رواں ہو گیا۔ میاں شبو اور ان کے ساتھیوں نے آپس میں اشارے کیے اور چپکے سے وہاں سے کھسک آئے۔

○○○

دلّی کے حوصلہ مند غریب

میاں شبو اور ان کے دوست جب چچی کے ٹھیے سے چلے تو شبو بولے "میاں یہ بڈھا بڑا وضعدار ہے۔ تم اس کے میلے کپڑوں اور مفلسی کو نہ دیکھو۔ اس نے اپنی ضد کے پیچھے لاکھ کا گھر خاک کر رکھا ہے۔ اس کے آس پاس کوئی دکان نہیں ہے مگر بڈھا ہے کہ جما ہوا ہے۔ گنے بندھے گاہک ہیں۔ مشکل سے تین چار روپے دن بھر کی دھیانگی ہوتی ہوگی، اسی میں خوش ہے۔ مسیتا میرٹھ والے کو دیکھو، کباب کیا بیچتا ہے لونگ چڑے بیچتا ہے۔ مگر وہ کیا کہ دکان، جیسی سجا رکھی ہے۔ بیس پچیس روپے روز نہ اٹھتا ہے۔ یہ سامنے دیکھتے ہو کس کی دکان ہے۔ یہ ہاتھی دانت محل کہلاتا ہے۔ اس کا مالک دلّی کا بہت بڑا جوہری ہے۔ چچا کو اس نے ہزاروں روپے اس بات کے دینے کیے کہ یہاں سے اٹھ جائیں، مگر چچا نے کہا "میں اپنے بزرگوں کی ہڈیاں نہیں بیچتا۔ ہزار کیا لاکھ روپیہ بھی، گر وہ تب بھی میں اپنے باپ دادا کا ٹھیا نہیں چھوڑوں گا۔" میاں ہم تو چچی کی انہیں اداؤں پر مرتے ہیں۔ چچے نے سچ کہا، ان کے بعد دلّی والے چلمیں ہی کھایا کریں گے۔"

یہی باتیں کرتے چاروں یار ہرے بھرے صاحب کے سامنے پہنچ گئے۔ یہاں دو قبریں تھیں۔ ایک قبر ہرے بھرے صاحب کی ہے اور ایک سرمد صاحب کی۔ ایک پر سبز چادر دوسری پر سرخ چادر پڑی رہتی ہے۔ یہاں فاتحہ پڑھنے کے بعد میاں شبو نے کہا "یہ لال قبر والے بزرگ بڑے جلالی تھے۔ انہیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہا تھا اور دین دنیا سے غافل ہو گئے تھے۔ بادشاہ نے ان کا سر اتروا دیا تو یہ اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر مسجد کے سامنے والی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ جو یہ پوری سیڑھیاں چڑھ جائیں تو قیامت ہی آ جاتی۔ وہ تو کہو کہ ہرے بھرے صاحب نے روک لیا یہ کہہ کر فقیر کو اتنا غصہ نہیں کرنا چاہیے۔ بس وہیں گر گئے۔"

ایک ساتھی نے کہا "اماں اُستاد، تم بھی ایسی بات کہتے ہو جو دھری جائے نہ اُٹھائی جائے۔ بھلا کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کا سرتن سے جدا ہو جائے اور وہ اپنا سر لے کر چلنے لگے؟"

میاں شبو یہ سن کر جھنجھلائے۔ بولے "ابے میں کوئی وہاں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ جو بزرگوں سے سنا تمہیں بتا دیا۔ تم لگے ہیچے کے بچے کرنے، اماں نہیں مانتے تو جہنم میں جاؤ۔ لو چلو۔ آگے بڑھو۔"

نیا محل کے بازار کے نکڑ پر بائیں ہاتھ کو پان والے کی دکان تھی۔ اس میں بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے تھے اور دکان بجلی کے قمقموں سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ سامنے برف کی ایک سلی رکھی ہوئی تھی جس پر لگے ہوئے پان دھرے تھے۔ یہ پان والا بھی عجب آن کا تھا۔ صرف دیسی پان ان کے ہاں ہوتے تھے۔ پرانا دیسی۔ چونے میں کیوڑا اور کتھے میں گلاب ملا ہوا تھا۔ یہ صاحب ایک پان بھی نہیں بناتے تھے، دو اوپر تلے رکھ کر بناتے تھے۔ لونگ، الائچی، جوتری، جائفل، بنارس کا مسالہ اور خدا جانے کیا کیا پان میں ڈال کر بیڑا بناتے تھے۔ اس پر چاندی کا ورق لپیٹتے اور خود اپنے ہاتھ سے گاہک کے منہ میں دیتے۔ گاہک کی چٹکی کیوں خراب ہو؟ ان کی یہ ادا سب کو بھاتی تھی۔ چاروں یاروں نے اس دکان سے پان کھایا۔ اتنے میں گلگو والا اپنا بڑا سا حقہ لئے آگیا۔ خمیرے کی خوشبو سے بازار مہک گیا۔ ان سے نہ رہا گیا۔ دو چار کش لئے۔ پیسے دیے اور آگے بڑھ گئے۔

سامنے پھول والے اپنی دکان سجائے بیٹھے تھے۔ ان کی سریلی آوازیں گونج رہی تھیں "لپٹیں آرہی ہیں موتیا میں۔ گجرات کے مکھانے۔" میاں شبو نے کہا "یار میں گھر والی کے لئے جوہی کی بالیاں لے لوں، ورنہ جاتے ہی ٹانگ لے گی کہ اتنی اوبر کیوں آئے؟" یہ کہہ کر پھول والے کی دکان کا رخ کیا۔ لال لال گیلے قند پر موتیا کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔ دوسری طرف چنبیلی کی ڈھیری مسکرا رہی ہے۔ پھولوں کے گہنے بنے رکھے ہیں۔ میاں شبو نے جوہی کے بالیاں لیں۔ پھول والے نے ہرے ڈھاک کے پتوں کو دونا بنایا۔ اس میں بالیوں کا جوڑا رکھا۔ دو چار پھول موتیا کے اور ایک آدھ زرد چنبیلی کا بھی ڈال دیا۔ چار پیسے ہی میں کام ہو گیا۔ چتلی قبر کے چوراہے پر پہنچے تو کلن حلوائی کی دکان پر مٹھائیوں کے تھال سجے ہوئے نظر آئے۔ بجلی کی تیز روشنی میں ورق لگی مٹھائیاں دمک رہی تھیں۔ میاں شبو نظر بچا کر نکلے جا رہے تھے کہ کلن کی نظر ان پر پڑ گئی۔

اماں خلیفہ، بات تو سنو۔ ارے بھئی ایسی بھی کیا بے مروتی کہ منہ پھیر کے نکلے جا رہے ہو؟"

میاں شبو چونک کر دکان کی طرف بڑھے۔ سلام کیا۔

"سلاولیکم"

کلّن بولے "والیکم سلام۔ لو ذرا یہ قلاقند چکھو۔"

قلاقند کا ایک ٹکڑا چھری سے کاٹ کر دیا۔ شبو نے منہ میں ڈالا تو بتاشے کی طرح گھل گیا اور کیوڑے کی خوشبو سے منہ مہک گیا۔

بولے "بھئی واہ، کیا کہنے کلّن استاد کے۔ لاؤ آدھ سیر باندھ دو۔"

کلّن نے پیچھے سے ٹوکری اٹھائی، اس میں کاغذ بچھایا۔ آدھ سیر قلاقند تول کر کچے سوت سے ٹوکری کو باندھ بوندھ شبو کے حوالے کیا۔ چھ آنے سیر مٹھائی بکتی تھی۔ تین آنے کلّن کو دے، یک ہاتھ میں پھولوں کا دونا اور ایک ہاتھ میں قلاقند کی ٹوکری لے کر چل پڑے۔ سوئی والوں کے نکڑ پر پہنچ کر یاروں سے رخصت ہوئے۔ گھر پہنچے تو دروازہ بند پایا۔ رات خاصی آگئی تھی۔ دونا ٹوکری پر رکھ کر کنڈی بجائی تو اندر سے بڑبڑانے کی آواز آئی اور کھٹ سے اندر کی کنڈی گری۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ گھر والی بپھری ہوئی کھڑی ہے۔ اس سے پہلے وہ سواتیں سنائے اور دانتا کل کل ہو میاں شبو نے کہا "اری یہ تو لے۔ کھڑی کیا گھور رہی ہے؟" بیوی کا غصہ ہوا ہوگیا اور باچھیں کھل گئیں۔ جھٹ دونا اور ٹوکری سنبھالی۔ اتنے میاں شبو کپڑے اتاریں اور تہمد باندھیں بیوی نے دونا کھول بالیں کانوں میں ڈال لیں۔ اور تلے دانی میں سے سوئی تاگہ نکال پھولوں کی یک لڑی بنا گلے میں ڈال لی پھر چھینکے پر سے روٹیوں کی ڈلیا اتاری اور دسترخوان بچھانے لگی۔ میاں شبو نے آواز دے کر کہا "اری رہنے دو۔"

بیوی نے ہنس کر کہا "باہر کھائی آئے۔ میں بھی تو کہوں اتنی دیر کہاں لگائی۔ راہ تکتے تکتے نندھ آگئی۔ چٹورپن کی عادت نہیں جاتی تمہاری، باہر کی چکوتیاں منہ کو لگ گئی ہیں۔"

"اری کدی برسوں کی برسات میں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ لے دھرے۔ یہ تاواں سنبھال۔" دھیانگی کے بچے ہوئے پیسے بیوی نے لے کر ازار بند میں باندھے۔

اری وہ ٹوکری تو کھول۔ دیکھوں میں کیا لایا ہوں تیرے لئے"

"اب ان میاں بیوی کو میٹھی میٹھی باتیں کرنے دیجئے۔ آیئے ہم آپ چلیں یہاں سے۔ رات ریرے چڑھتی آرہی ہے۔

صبح سویرے ہی کاریگروں اور دستکاروں کو اپنے اپنے کام پر پہنچنا ہوتا ہے۔ گھر میں ناشتہ یا کھانا تیار کرنا گھر والیوں کے لئے مشکل ہوتا ہے، اس لئے ناشتہ بازار ہی سے آتا تھا۔ جو ذرا آسودہ حال تھے

حلوے مانڈے اور پوری کچوریوں کا ناشتہ کرتے تھے۔ بچوں کے لئے مٹریاں منگائی جاتی تھیں، ان کے ساتھ روکن میں حلوہ ملتا تھا۔ چائے کا رواج تو اب ہوا ہے۔ پہلے طرح طرح کے شربت پئے جاتے تھے۔ جاڑوں میں گرم دودھ پیا جاتا تھا۔ بعض گھروں میں کشمیری چائے اور قہوے کے فنجان چلتے تھے۔ مگر غریب غربا، نہاری روٹی کھا کر کام پر سدھارتے تھے۔ نہاری سوائے دلّی کے اور کسی شہر میں نہیں پکتی تھی۔ دوسرے شہروں میں پائے پکتے تھے، ورانہی کو نہاری کہا جاتا تھا۔ دلّی کی نہاری ایک قسم کا قورمہ ہی ہوتا تھا۔ اس میں بڑے گوشت کے صرف پارچے ہی ڈالے جاتے تھے، ہڈیاں گُدیاں نہیں ڈالی جاتی تھیں۔ ان مسالوں کے علاوہ جو قورمے میں پڑتے ہیں شوربے کو گاڑھا کرنے کے لئے آٹا بھی ڈالا جاتا تھا۔ نہاری کی ایک دیگ چولہے میں جمی ہوئی تھی جب دیگ میں پیاز سرخ کرنے کے بعد تمام مال مسالہ پڑجاتا تو دیگ کے منہ پر کونڈا رکھ کر آٹے سے جما دیا جاتا تھا۔ دیگ کے نیچے موٹے موٹے کندے لگا کر آگ جلادی جاتی اور میاں بھٹیارے نچنت ہو، دکان بند کر گھر چلے جاتے۔ صبح منہ اندھیرے دکان پر پہنچ کر دیگ کھولتے تو نہاری پکی پکائی ملتی۔ گاہکوں کا ہجوم موجود ہوتا۔ جھپا جھپ برتنوں میں نکال کر دینی شروع کردیتے۔ خمیری روٹیوں کے لئے برابر میں تندور لگا ہوتا۔ گرم گرم روٹیاں تندور میں سے نکلتی رہتیں۔ کام پیشہ لوگ دو پیسے کی نہاری لیتے اور دو پیسے کی دو روٹیاں۔ روٹی کا آدھا پونا ٹکڑا بچ ہی رہتا اور چار پیسے میں ان کا پیٹ بھر جاتا۔ بس اب دن کو انہیں کھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، شام کو گھر آ کر ہی روٹی کھائیں گے۔ یہ تھی نہاری دلّی کے غریبوں کا من بھاتا کھاجا۔ مگر نہاری کے مخصوص ذائقے کی وجہ سے جو گھر کے پکانے میں پیدا ہی نہیں ہوتا امیروں اور رئیسوں نے بھی نہاری کھانی شروع کردی تھی۔ پیسے کے نخرے اور چونچلے نہاری میں بھی در آئے۔ رات ہی کو برتن اور پیسے دکان پر بھجوادئے اور صبح کسی کو بھیج کر نہاری منگوالی۔ مگر جو زیادہ شوقین ہوتے صبح صبح دکان پر پہنچ لیتے اور بالا خانے میں جا براجتے۔ لڑکا آکر پوچھ جاتا۔ تھوڑی دیر میں دہکتی ہوئی انگیٹھی آجاتی۔ اس کے بعد بڑے سے بادیے میں نہاری آتی جس میں بھیجے اور نلیاں پڑی ہوتیں۔ ایک پیالے میں داغ ہوتا، یعنی پیاز ڈال کر کڑکڑایا ہوا خالص گھی۔ ایک رکابی میں ہری مرچیں، ہرا دھنیا، ادرک کی ہوائیاں، گرم مسالہ اور نمک کی پیالیاں ہوتیں اور ایک کٹا ہوا کھٹا۔ کم مرچیں کھانے والے نہاری کا روغن اتار کر الگ کردیتے اور اس کے بدلے میں داغ کیا ہوا گھی ڈالتے۔ اس سے مرچیں کم ہوجاتیں۔ اور کھانے والے خوب جی لگا کر کھاتے۔ نہاری ذرا ٹھنڈی ہوئی اور غوری انگیٹھی پر رکھی گئی۔ نہاری کھانے کا مزہ

جاڑوں ہی میں آتا ہے۔ جب چلنے کا جاڑا پڑ رہا ہو اور دانت سے دانت بج رہے ہوں تو دانتوں پسینہ آجاتا ہے۔ نہاری کھانے کے بعد گاجر کا حلوہ لازم و ملزوم سا ہو گیا تھا۔ دلی کے مختلف محلوں میں نہاری والے تھے جن کے ہاں کی نہاری مشہور تھی۔ کراچی کے بعض بیچھے ہوٹلوں میں کچھ اور نزاکتیں بھی پیدا کر لی گئی ہیں۔ مثلاً چھوٹے گوشت کی نہاری پکاتے ہیں، بلکہ مرغ کی نہاری بھی پکاتے ہیں، اور جب آپ کے سامنے آتی ہے تو اس میں ابلے ہوئے انڈے بھی پڑے ہوتے ہیں۔ خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ دولت کے ساتھ نفاست آ ہی جاتی ہے مگر جو مزہ سنڈے کے گوشت کی عام نہاری میں ہوتا ہے وہ کسی اور گوشت کی نہاری میں نہیں ہوتا۔ گر آپ کو مرغ ہی کھانا ہے تو مرغ مسلم کھائیے۔ چرغا کھائیے۔ غریب نہاری کو اس کے حال پر چھوڑیئے۔ غریب اور امیر کا میل ہی کیا ہے؟

دلی میں بعض ایسے منچلے نہاری والے بھی تھے جو گھر لے جانے کے لئے نہاری نہیں دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ غریبوں کا کھاجا ہے، غریب ہی یہاں آ کر کھاتا ہے۔ اگر ہم امیروں کی پتیلیاں بھرنے لگیں تو غریب بیچارے کیا کھائیں گے؟ جاؤ میاں جاؤ، کوئی اور دکاں دیکھو۔ یہاں امیروں کے لیے نہاری نہیں پکتی۔ مگر اب ایسے وضعدار لوگ کہاں؟ سب کے سب پیسے کے میت ہو گئے۔ نہاری والے کے ہاں نہاری لینے جائیے تو معلوم ہوگا کہ بک گئی۔ "اماں اتنے سویرے ہی بک گئی؟" "جی ہاں، ایک میاں جی آئے تھے، وہ پوری دیگ ڈیوڑھے دام دیکر خرید لے گئے۔"

دلی کے غریبوں میں بھی یہ بات تھی کہ وہ کسی نہ کسی ہنر میں یکتا ہونا چاہتے تھے، چنانچہ جو ہنر یا فن انہیں پسند آتا اسے اس فن کے استاد سے باقاعدہ سیکھتے تھے۔ استاد اپنے شاگردوں سے پیسہ کوڑی نہیں لیتے تھے، اس لئے بڑے بے نیاز ہوتے تھے۔ شاگرد خدمت کر کے استاد کے دل میں گھر کر لیتا تھا، اور کسی بات سے خوش ہو کر اُستاد شاگرد کو دو چار گُر بتا دیا کرتا تھا۔ دراصل خدمت لینے میں یہ گُر پوشیدہ تھا کہ اُستاد شاگرد کی خو بو سے اچھی طرح واقف ہو جاتا تھا۔ استاد کو اندازہ ہو جاتا کہ شاگرد اس فن کا اہل بھی ہے یا نہیں۔ اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہے یا نہیں، جو کچھ ہم کہیں گے سے مانے گا یا نہیں؟ اگر ہم نے بتایا اور اس نے نہ کیا تو تو ہماری بات نیچی ہو گی اور شاگرد کا کچا پن ہماری بدنامی کا باعث ہوگا۔ لہٰذا خوب کس لیتے تھے۔ کوڑی پھیرا بازار کا کراتے، برتن منجھواتے، گھر کی جھاڑو دلواتے، ہاتھ پاؤں دبواتے۔ جوان ناگواریوں کو گوارہ کر لیتا اسے اس کے ظرف کے مطابق اپنا فن یا ہنر سکھا دیتے۔ نااہل کو کبھی کوئی استاد کچھ نہ دیتا تھا۔ اناڑی کے ہاتھ میں تلوار دینا یا بندر کے ہاتھ میں استرا دینا ان

کے نزدیک گناہ تھا۔

معمولی سی بات ہے پنجہ لڑانا مگر دلّی میں اس کے بھی استاد تھے۔ پنجہ لڑانا بھی ایک فن تھا اور اس کی بھی کچھ رکاوٹیں تھیں جنہیں استاد سے سیکھا جاتا تھا۔ دلّی کے میر پنجہ کش کا نام بہت مشہور ہے۔ عام خیال ہے کہ پنجہ لڑانے والوں کا خط خراب ہو جاتا ہے، مگر میر پنجہ کش نہ صرف پنجہ کشی کے استاد تھے بلکہ اپنے زمانے کے اچھے خوش نویس بھی تھے۔ ان کی لکھی ہوئی وصلیاں دیکھ کر آج بھی آنکھوں میں نور آتا ہے۔ اٹھارہ سال پہلے تک دلّی میں بعض نامی پنجہ کش تھے جو اپنے شاگردوں کو زور کراتے اور پنجے کے داؤ پیچ بتاتے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ دبلا پتلا سا نوجوان ہے جو ایک قوی ہیکل دیہاتی سے پنجہ پھنسائے بیٹھا ہے۔ دیہاتی کا چہرہ زور لگا لگا کر سرخ ہوا جا رہا ہے مگر نوجوان کا ہاتھ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ اس نے کچھ اس انداز سے انگلیاں چڑھا رکھی ہیں کہ اس کی ساری طاقت بیکار ثابت ہو رہی ہے۔ جب دیہاتی کامیاب نہیں ہوتا تھا تو کہتا تھا ''نہیں جی یوں نہیں، میری انگلی اتر گئی تھی۔'' پھر خوب انگلیاں جما کر کہتا ہے ''ہاں اب لو۔'' مگر اب کے بھی اس کے پیش نہیں جاتی۔ ''میاں جی، اب تم موڑو۔'' نوجوان اس کا پنجہ ایسے پھیر دیتا ہے جیسے موم کا ہو۔ دیہاتی حیران ہو کر کہتا ہے ''ٹھیرو میاں جی، مجھے اپنی انگلیاں تو جما لینے دو۔'' ''لے بھئی چودھری، تو بھی کیا یاد کرے گا، خوب گانٹھ لے۔ اچھا اب ہوشیار ہو جا۔'' اور پھر چودھری کا پنجہ نہیں رکتا اور پھرتا چلا جاتا ہے۔ دراصل ہنر اور فن میں گاؤ زوری نہیں چلتی۔ جبھی تو رستم زماں گاما پہلوان اپنے سے دگنے پہلوانوں کو مار لیا کرتا تھا۔

لکڑی یا بنوٹ کا فن بھی ایک ایسا ہی فن ہے جس کا جاننے والا قوی سے قوی حریف کو نیچا دکھا سکتا ہے۔ یہ دراصل ''بن اوٹ'' ہے، یعنی اس کی کوئی روک نہیں ہے۔ استاد گھنٹوں اس کے پینتروں کی مشق کراتے ہیں۔ بنوٹیوں میں مچھلی کی سی تڑپ ہونی چاہیے۔ اگر چستی پھرتی نہیں ہوگی مار کھا جائے گا۔ لدھڑ آدمی کا کام نہیں ہے۔ یہ اتنا بڑا فن ہے کہ اس پر پوری پوری کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر یہ فن سرتاپا عمل ہے، اس لیے کسی استاد سے سیکھے بغیر نہیں آتا۔ دلّی کے ۱۹۲۴ء کے فسادات میں یہ تماشہ بھی دیکھا کہ جب ہندو لٹھ بندوں نے کسی محلے پر حملہ کیا تو چند مسلمان لونڈے لکڑیاں لے کر باہر نکلے اور کائی سی پھٹتی چلی گئی، لٹھ دھرے کے دھرے رہ گئے اور ہجوم دیکھتے ہی دیکھتے بکھری ہو گیا۔ اپنی آنکھوں تو نہیں دیکھا، ہاں کان گنہگار ہیں کہ ایسے ایسے بھی بنوٹیے ہو گزرے ہیں جو تلوار یے سے تلوار چھین لیتے تھے اور اس کی گٹھڑی بنا کر ڈال دیتے تھے۔ البتہ یہ کمال ہم نے ضرور دیکھا ہے کہ چارپائی کے نیچے کبوتر چھوڑ دیجیے،

کیا مجال جو بنوٹیا اسے نکل جانے دے۔ یہی کیفیت بانک، پٹہ، گتکہ، چھری اور علی مدد کے ہنرمندوں کی تھی۔ بجلی سی چمکی اور حریف ختم۔

تیر اندازی کے تو ہم نے صرف قصے ہی سنے ہیں البتہ بعض بڈھوں کی غلیل بازی دیکھی ہے۔ وہ غلیل یہ آج کل کی دوشاخہ والی کی شکل کی غلیل نہیں ہوتی تھی۔ یہ کوئی دو ہاتھ لمبے لچک دار بانس کو چھیل کر بنائی جاتی تھی۔ اس کے دونوں سروں کے درمیان دُہرا تانت کھینچ کر باندھا جاتا تھا جس کی وجہ سے اس کی شکل کمان جیسی ہو جاتی تھی۔ دہرے تانت کے بیچوں بیچ دو انگل چوڑا کپڑا غلہ رکھنے کے لئے ہوتا تھا۔ جب غلیل استعمال میں نہ ہوتی تو اس کا چلہ اتار دیا جاتا تھا تاکہ بانس کے جھکاؤ کا زور قائم رہے۔ غلے خاص طور سے چکنی مٹی کے بنائے جاتے تھے۔ اگر زیادہ مضبوط درکار ہوتے تو چکنی مٹی میں روئی ملائی جاتی تھی۔ اور گیلے غلوں کو دھوپ میں سکھا لیا جاتا تھا۔ دلی میں غلیل کا سچا نشانہ لگانے والے آخر وقت تک باقی تھے۔ چور کے پاؤں کی ہڈی غلے سے توڑ دیتے تھے۔

جس زمانے میں مکہ سے مدینہ اونٹوں پر جایا کرتے تھے تو دلی کے ایک غلیل باز بھی حج کو گئے تھے۔ انہوں نے سن رکھا تھا کہ بعض دفعہ بدو قافلے کو لوٹ لیتے ہیں۔ یہ صاحب اپنے ساتھ غلیل بھی لیتے گئے تھے۔ سو اتفاق سے ان کے قافلے پر بدوؤں نے حملہ کر دیا۔ بڑے میاں نے اپنی غلیل کچھ فاصلے پر پھینک دی اور سب کے ساتھ کجاوے سے اتر آئے۔ جب بدو قافلے کو لوٹ کر گٹھریاں باندھنے میں مصروف ہوئے تو بڑے میاں نے لٹیروں کے سردار کی پیشانی پر ایسا تاک کر غلہ مارا کہ وہ چکرا کر گر پڑا۔ اب جو بھی چونک کر دیکھتا کیا معاملہ ہے اس کی کنپٹی پر غلہ لگتا اور وہ ڈھیر ہو جاتا۔ جب کئی جوان لوٹ گئے تو بڑے میاں نے للکار کر کہا۔

"خیریت چاہتے ہو تو مال چھوڑ دو اور اپنے آدمیوں کو اٹھا کر لے جاؤ، ورنہ تم میں سے ایک بھی بچ کر نہیں جا سکے گا"

بدوؤں نے کچھ توقف کیا تو انہوں نے اتنی دیر میں دو ایک کو اور لٹا دیا۔ لہٰذا لٹیروں نے جلدی جلدی اپنے زخمیوں کو اٹھایا اور وہاں سے چمپت ہو گئے۔

دلی میں ایک ایسے غلیل کے نشانہ باز بھی تھے جو ایک غلہ ہوا میں اوپر مارتے اور جب وہ غلہ واپس آنے لگتا تو دوسرا غلہ اس پر مارتے اور دونوں غلے ٹوٹ کر ہوا میں بکھر جاتے۔

○○○

دلّی والوں کے شوق

دلّی والوں کو اپنی جان بنائے رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لیے ورزش کیا کرتے تھے اور ورزشی کھیلوں میں شریک ہوتے تھے۔ ہر گھر میں بگ ڈڑ اور مگدروں کی جوڑی ضرور ہوتے تھے۔ بعض لوگ بگ ڈڑ کا کام گنا اینٹوں سے لیتے تھے۔ دیسی ورزش سے سینے چوڑے اور کمر چھلا سی ہو جاتی تھی۔ توند نکلنے نہیں پاتی تھی اور پیٹ چپاتی سا ہو جاتا تھا۔

ورزش کا شوق دلّی کے امیر و غریب سبھی کو تھا۔ باریک اور چست لباس پہننے کا رواج تھا، اس لئے اپنے جسم کو سڈول بنانے کی دھن سب کو لگی رہتی تھی۔ پھنسے ہوئے انگرکھے اور چست پاجامے اسی وقت اچھے لگتے ہیں جب ڈنڑ قبضے اور پنڈلیاں بھری بھری ہوں۔ سرکنڈے سے ہاتھ پاؤں بھلا چکن اور ململ میں کیسے بھلے لگ سکتے ہیں، بلکہ ایسے سوکھے سہمے لوگوں پر تو "کاغذ کے پٹے باز" کی پھبتی کسی جاتی تھی۔

گلی گلی اکھاڑے کھلے ہوئے تھے۔ ہر اکھاڑے کے لیے ایک استاد رکھا جاتا تھا جو عموماً کوئی بوڑھا پہلوان ہوتا تھا۔ شہر میں کئی تعلیمی اکھاڑے تھے جن میں فنِ کشتی کے ماہر اپنے پٹھے تیار کرتے تھے اور جمعہ کے جمعہ موتیا کھان میں دنگل ہوتا تھا۔ اس دنگل میں ان اکھاڑوں کے تربیت یافتہ پہلوانوں کی کشتیاں ہوا کرتی تھیں۔ چالیس پچاس سال پہلے دلّی میں یہ اکھاڑے مشہور تھے۔

گوندی شاہ والے۔ شیخو والے۔ بھوری والے۔ میراں شاہ والے۔ پیرو والے اور تیلی والے۔

محلوں میں جو اکھاڑے تھے ان کے استاد اکھاڑے میں آنے والوں کو طرح طرح کی ورزشیں بتایا کرتے تھے۔ یہ نہیں کہ اندھا دھند ڈنڑ پیلنے پر لگا دیا۔ جی نہیں، کسی کا اوپر کا دھڑ کمزور ہے تو اُسے کچھ ورزش بتائی اور کسی کا نیچے کا دھڑ کمزور ہے تو اسے کچھ اور۔ جسم کی خوبصورتی یہ ہے کہ سر سے پاؤں تک

سڈول ہو۔ تمام اعضاء یکساں طور پر تیار ہوں۔ یہ نہیں کہ سینے پر تو گوشت آ گیا مگر ٹانگیں پھچیاں سی دھری ہیں یا پٹیں تو بھر گئیں مگر بازو سر کنڈے سے رہ گئے۔

صبح شام کو اکھاڑے میں رونق ہوتی ہے۔ دیکھیے کوئی بگ ڈنڑ پر ڈنڑ پیل رہا ہے، کوئی سپا نے سے بیٹھکیاں نکال رہا ہے۔ ایک سنتولا اٹھا رہا ہے تو دوسرا الیزم سے زور آزمائی کر رہا ہے۔ کوئی عشق اللہ لگا رہا ہے تو کوئی ڈھیکلیاں کھا رہا ہے۔ کوئی مگدر پھرا رہا ہے تو کوئی موگریوں کے ہاتھ نکال رہا ہے۔ اکھاڑے کی مٹی میں تیل ملا کر اکھاڑے کو دونوں وقت ہرا کیا جاتا ہے۔ اکھاڑہ کشادہ بنایا گیا ہے ایک ہی وقت میں کئی کئی جوڑیں چھوٹی ہوئی ہیں۔ پہلے صرف زور ہو رہے ہیں۔ یہ اسے ریلے ہوالے جاتا ہے اور وہ اسے پیلتا ہوا لے آتا ہے۔ جب تک سانس نہ پھول جائے یہی ریل پیل رہے گی۔ دم لینے کے بعد ان کی پکڑ ہوگی۔ اتنے میں دوسری جوڑ لنگر لنگوٹا کس کر سامنے آ گئی۔ استاد نے کہا "ہاں بھئی بسم اللہ۔" آمنے سامنے ہو کر دونوں نے ہاتھ ملائے، پھر اپنی اپنی ران پر تھپکی دے دونوں گتھ گئے۔

استاد کبھی ایک سے کہتے ہیں "ابے سانٹیاں نکال۔" کبھی دوسرے سے کہتے ہیں "ابے پڑا کا پڑا رہ گیا؟ ابے گدھا لوٹ لگا۔" لو وہ نیچے سے نکل آیا۔ دونوں پھر آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔

استاد نے کہا "ابے پٹھا باندھ کر دھوبی پاٹ پر کھینچ لے۔"

داؤں کچھ ادھورا رہا تو دوسرے سے بولے "کھچڑے چڑھا لے"

اس نے ایسی قینچی ڈلی کے بے بس کر دیا۔

استاد نے چیخ کر کہا "ابے اس قنف کو کہنی کی کنجی سے کھول اور قلا جنگ لگا۔"

لو میاں دیکھا؟ ابھی تو بالکل بے بس ہو رہا تھا یا اب دوسرے کے سینے میں چڑھا بیٹھا ہے۔ ہاں بھئی، جس کا داؤں لگ جائے۔ یہ تو پھرتی کا کام ہے۔ نری طاقت بھلا کیا کرے گی؟ غرض پور پور داؤں ہو رہے ہیں۔ آپ چند نام سن لیجیے:

رک لنگڑی، چپڑاس، سکی، اندری باہر کی، اندری اندر کی، دکھنی اندری، کھسوٹا، دھوبی پاٹ، کھوکھا، غاز بند، گھسا، کھڑا گھسا، مغدا، جھولی۔ دھڑ مارنا، ردم مارنا، سانڈھی، الٹی پنچھی، سیدھی پنچھی، گل لپیٹ، ٹانگ لگانا، قینچی، کنگھی، پھرکی، لپیٹ، ڈھاک، مہرہ، کیلی، گدھا لوٹ، غوطہ، گوہ کھے، اچھال، طبق پھاڑ، سواکری، قلا جنگ، ڈھیکلی، دیو بند، جھکائی، اکھیڑ میں بیٹھنا، بوجھا دینا۔

اکھاڑے ہی میں ایک طرف تو پرانے وقتوں کا کنواں ہے۔ ڈول کھینچنا بھی ایک ورزش ہے۔ پسینہ خشک کرتے جاتے ہیں اور باری باری نہاتے جاتے ہیں۔ ایک پانی کھینچ کر ڈول پر ڈول ڈال رہا ہے۔ جب وہ نہا چکا تو اسی طرح دوسرے کو نہلایا۔ جانگئے اُتار کر کپڑے پہن، استاد کو سلام کر اکھاڑے سے باہر نکلے اور سیدھے دودھ والے کی دکان پر جا کر سیر سیر بھر اونٹا ہوا دودھ پیا۔ پھر ٹہلتے ٹہلتے جامع مسجد چلے گئے اور چوک کی بہار دیکھی۔ یوں جسم اور صحتیں بنی رہتی تھیں۔ جوان تو جوان بڈھوں تک کے چہروں پر چُلّوؤں خون نظر آتا تھا۔ سینے گوشت سے لپے ہوئے ڈنٹر قینچے بنے ہوئے، رانوں کے مچھلے اُلٹے ہوئے، پنڈلیاں کچالوسی بنی ہوئیں۔ اپنے پرائے کو دیکھ کر جی خوش ہوتا تھا۔ یا اب جوانوں کا یہ حال ہے کہ جس کو دیکھو کانپ ٹھنڈے ٹوٹے ہوئے، کمان بنا کر قبر کے لئے جگہ تلاش کر رہا ہے۔ یہ جوانی اور ماںجھا ڈھیلا!

ورزشی کھیلوں میں کبڈی ایک ایسا کھیل تھا جس میں کچھ بھی خرچ نہیں ہوتا تھا۔ ہر محلے میں کہیں نہ کہیں تھوڑی کھلی جگہ ہوتی تھی۔ اس میں کبڈی کا پالا جمتا۔ جوڑیاں بٹی جاتیں۔ دس بارہ نوجوان ایک طرف۔ دس بارہ دوسری طرف ہو جاتے۔ بیچ میں پالا کھنچ جاتا۔ اب ایک طرف کا ایک جوان ''لل کبڈی'' کا نعرہ لگا کر پالے سے آگے بڑھا۔ اِدھر والے دور دور ہو گئے کہ یہ کسی کو چھو نہ لے۔ یہ ''کبڈی کبڈی'' کہتا ایک ایک کی طرف لپکتا ہے مگر کوئی ہاتھ نہیں آتا۔ اسے یہ بھی خیال ہے کہ کوئی پیچھے سے آ کر نہ پکڑ لے، یا بیچ میں سانس نہ ٹوٹ جائے۔ چوکنا ہو کر لپکتا پھرتا ہے اور جب سانس ختم ہونے لگتا ہے تو واپس آ جاتا ہے۔ اس کے پیچھے دوسری طرف کا ایک نوجوان لپکتا ہے تاکہ پالا پھلانگتے ہی اسے چھو لے، مگر وہ تیتری بنا ہوا ہے، ہاتھ نہیں آتا۔ یہ صاحب گرم جوشی میں کچھ زیادہ بڑھ آئے۔ اِدھر نوجوان اُس کی اس چوک سے فائدہ اٹھا کر اس کے پیچھے آ جاتے ہیں اور کولی بھر کے اسے اُدھر اٹھا لیتے ہیں۔ یہ بہتیرے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، بھلا وہ کب چھوڑتے ہیں، ایک کی دو ادو۔ اس کا سانس ختم ہو جاتا ہے اور وہ مر کر الگ جا بیٹھتا ہے۔ جب دوسری طرف کا کوئی کھلاڑی مرے گا تو یہ جی اٹھے گا۔ دونوں طرف کے مرتے جیتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایک فریق کے سارے کھلاڑی مر جاتے ہیں اور وہ فریق ہار جاتا ہے۔ مغرب کی آندھی میں جہاں اور بہت سی کام کی چیزیں اُڑ گئیں کبڈی بھی اُڑ گئی۔ اس کی جگہ فٹ بال اور رگبی نے لے لی۔

گیڑیاں کھیلنا بھی سستا اور ورزشی کھیل تھا۔ روپے کی چار من جلانے کی لکڑیاں آتی تھیں۔ من من بھر کے دونوں فریق میدان میں آ جاتے۔ بیچ میں پالا کھنچ جاتا۔ چھوٹی لکڑیاں پنچیاں کہلاتی تھیں۔

ایک فریق دوسرے فریق والوں کے آگے اپنی پنجیاں ڈالتے جاتے اور اس فریق کا ایک کھلاڑی دنچہ سے جو ایک موٹی بھاری لکڑی ہوتی ہے، پنجیوں پر اس طرح تاک لگا کر ضرب لگاتا ہے کہ پنجی پالے کے پار چلی جاتی ہے۔ جب پنجی اوچھے وار کی وجہ سے پار نہ ہوتی تو دوسرے فریق کے پاس آجاتی۔ آخر میں ستنا پہنایا جاتا اور ہارنے والوں کی ڈولیاں ہو جاتیں۔ اب گیڑیاں کہاں؟ اب تو بیر تھرو ہے۔

گلی ڈنڈا گلیوں میں نہیں کھیلا جاتا تھا۔ قریب کے میدان میں گچی کھود لی جاتی۔ کھیلنے والوں کی دو ٹولیاں بن جاتیں۔ ایک ٹولی کھیلتی اور دوسری کھلاتی۔ گچی پر ڈنڈے رکھ کر سیدھے گلی اچھالی جاتی۔ اگر کھلانے والوں میں سے کوئی لپک لیتا تو کھیلنے والا مر جاتا، ورنہ گچی کے پاس ڈنڈا رکھ دیا جاتا اور گلی تاک کر ڈنڈے کی طرف پھینکی جاتی۔ اگر ڈنڈے سے چھو جاتی تو کھلاڑی مر جاتا، ورنہ کھلاڑی تین ٹُنس لگاتا اور جہاں گلی پہنچ جاتی وہاں سے گچی تک اندازے سے لال مانگے جاتے۔ ایک لال ڈنڈے کے برابر ہوتا تھا۔ فریق مخالف یا تو اس کے مطابق منظور کر لیتا یا نا منظور کر کے گلی سے گچی تک ڈنڈے سے فاصلہ ناپا۔ اگر لال کم رہ جاتے تو کھلاڑی مر جاتا۔ پھٹو کی تعداد مقرر کر لی جاتی کہ سو لال کا ایک پھٹو ہوگا جس کے پھٹو زیادہ ہوتے وہ فریق جیت جاتا۔ گلی ڈنڈا مغرب کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اب تو کرکٹ ہے اور اسکواش جب بلے ٹوٹ جاتے ہیں اور گیندیں پھٹ جاتی ہیں تو گردش ایام ماضی کی طرف لوٹ جاتی ہے اور میدانوں میں بچے گلی ڈنڈا کھیلتے نظر آتے ہیں۔

گھروں میں گنجفہ، شطرنج، چوسر، تاش، نو کنکرا کھیلا جاتا تھا۔ شطرنج کے بعض ایسے کھلاڑی بھی تھے جو غائب کھیلتے تھے۔ ان کے سامنے شطرنج کی بساط اور مہرے نہیں ہوتے تھے۔ انہیں صرف یہ بتا دیا جاتا کہ حریف نے یہ چال چلی ہے۔ یہ فوراً کہہ دیتے ہماری طرف سے فلاں مہرا چل دو۔ ان کے ذہن میں شطرنج کا پورا نقشہ جما رہتا تھا۔ ادھر کئی کئی کھلاڑی لگے رہتے اور ادھر یہ صرف اکیلے ہوتے، اور پھر جیت بھی انہیں صاحب کی ہوتی۔

شطرنج کے کھلاڑیوں کو بازیوں میں اس قدر انہماک ہوتا کہ انہیں دین دنیا کی خبر ہی نہ رہتی۔ ایک صاحب گھر سے اپنے بیمار بچوں کی دوا لینے چلے۔ راستہ میں پڑ جما ہوا دکھائی دے گیا۔ پہلے کھڑے دیکھتے رہے، پھر خاموش نہ رہ سکے تو چالیں بتانے لگے۔ اس کے بعد بھی ضبط نہ ہو سکا تو ہارنے والے کھلاڑی کو "اماں ہٹو" کہہ کر ایک طرف کر دیا اور خود کھیلنے لگے۔ ایک بازی ختم ہوئی تو دوسری اور دوسری ختم ہوئی تو تیسری۔ غرض کے دوپہر ہونے کو آئی تو محلے والوں نے آ کر بتایا کہ بچے

کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی ہے، دوا کا انتظار ہو رہا ہے" "ابھی آتا ہوں" کہہ کر پھر چالوں میں گم ہو گئے۔ شام ہوتے اطلاع ملی کہ بچے کا انتقال ہوگیا۔ اناللہ کہہ کر نظر اٹھائی۔ بولے "اچھا بھئی، کفن دفن کا انتظام کرو۔ بس یہ بازی ختم کر کے میں آیا۔" "وہاں جنازہ تیار ہوگیا۔ بولے" تم لے کر چلو، میں آیا" پھر اطلاع ملی کہ دفنا بھی آئے بولے "چلو اچھا کیا۔ بچہ را بہت تکلیف میں تھا" لوگوں نے کہا "میاں اب تو گھر چلو۔" بولے جب مرنے والا ہی نہ رہا تو میں اب گھر جا کر کیا کروں گا؟ وہ اچھی جگہ ہے، ہم بری جگہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کرے۔ یہ دن تو کبھی بھی کے لیے آنے والا ہے ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے

آج وہ، کل ہماری باری ہے

ہاں صاحب آپ نے کیا چال چلی؟"

ایک صاحب گھر سے گوشت لینے نکلے۔ قصائی سے گوشت لے کر لوٹ رہے تھے کہ قضاعنداللہ راستے میں کسی بیٹھک میں شطرنج ہوتی دکھائی دے گئی۔ ٹھٹک کر کھڑے ہوگئے۔ جب بازی ختم ہوئی تو صاحب خانہ نے کہا" آیئے میر صاحب، آپ سے بھی ایک پکڑ ہو جائے" اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں۔ جھٹ بیٹھ کر مہرے جمانے لگے۔ اب بازی پر بازی ہوئے چلی جا رہی ہے۔ دوپہر ہوئی، دن ڈھلا، رات ہوگئی۔ بیٹھک میں سڑاند اور بساند پھیلنے لگی۔

"اماں یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے؟"

"کوئی چوہا دوہا تو نہیں مرگیا؟"

ادھر اُدھر سونگھ کر ایک صاحب نے کہا:

"بدبو، میر صاحب کے پاس سے آرہی ہے۔"

مگر میر صاحب ہیں کہ شطرنج میں غرق ہیں۔ کسی نے اسے ہلا جلا کر کہا

"اماں میر صاحب، یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے؟"

بولے "ارے آرہی ہوگی کہیں سے۔ یہاں لاکھ روپے کی بازی لگی ہوئی، اور تمہیں بدبو کی لگ رہی ہے۔"

مگر بدبو اتنی ناگوار ہو چکی تھی کہ ناک نہیں دی جا رہی تھی۔ ایک صاحب نے اس کا سراغ لگا ہی لیا۔ اور میر صاحب کے بغل میں سے پوٹلی کھینچ لی۔

''اماں میر صاحب یہ کیا ہے؟''

میر صاحب نے چونک کر کہا ''او ہو گوشت ہے۔ سڑ گیا۔ اسے پھینک دو۔'' یہ کہہ کر پھر کھیل میں لگ گئے۔

چوسر کھیلنے والے دانا اور پچیسی کھیلنے والے کوڑیاں شرطیہ پھینکتے تھے۔ یعنی جتنی کہو اتنی پھینک دیں۔ یہی حال تاش کا تھا۔ گڈی کو جتنا چاہے پھینٹ دیجیے، مگر جب بانٹنے والا بانٹے گا تو اچھے اچھے پتے خود لے جائے گا۔

یہ اور اسی قسم کے کھیل دیوان خانوں میں کھیلے جاتے تھے۔ یہ مردانہ گھر ہوتے تھے جن میں نہایت شائستہ صحبتیں ہوا کرتی تھیں۔ ہر محلے میں دو چار بڑے بڑے دیوان خانے ہوتے تھے جن میں رات کو احباب جمع ہوتے تھے۔ دل بہلانے اور وقت گزارنے کے لیے تمام کھیل کھیلے جاتے تھے۔ انہی دیوان خانوں میں کبھی کبھی شعر و سخن کی محفلیں بھی ہوتیں، مصرعہ طرح پر مشاعرے ہوتے۔ دلّی میں اس وقت کئی استاد تھے۔ استاد بیخودؔ، نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ، آغا شاعرؔ، پنڈت امرناتھ ساحرؔ اور استاد حیدر بہت مشہور تھے۔ انہی کے شاگردوں نے دلّی کے چاروں کھونٹ داب رکھے تھے۔ مشاعروں میں پورے ادب آداب برتے جاتے تھے۔ بعد میں مشاعرے شاعروں کے اکھاڑے بن گئے تھے اور بھلے آدمیوں نے ان میں شریک ہونا چھوڑ دیا تھا۔ صرف ایک سالانہ مشاعرہ پنڈت امرناتھ ساحرؔ کا ایک ایسا رہ گیا تھا جس کے لیے خاص انتظام و اہتمام کیا جاتا تھا۔ پنڈت جی پنشن یافتہ تحصیلدار تھے۔ ستر سے اوپر ہو گئے تھے مگر صحت اچھی تھی اور کسی عیب میں نہیں تھے۔ لمبی سی چوری نما داڑھی تھی، چغہ پہنتے تھے اور پگڑی باندھتے تھے۔ انہیں اردو سے عشق تھا۔ شہر میں بھی ان کا احترام کرتے تھے اور ان کے مشاعرے میں نامی گرامی شعراء دور دور سے آ کر شریک ہوتے تھے۔

دیوان خانے کی ادبی نشست نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی کے ہاں اتوار کے اتوار سہ پہر سے مغرب کے بعد تک ہوتی تھی۔ آخر میں ادیبوں اور شاعروں کا ایک یہی ٹھکانہ رہ گیا تھا۔ کوئی معروف اور غیر معروف ادیب یا شاعر ایسا نہیں تھا جس نے اس مجلس میں شرکت نہ کی ہو۔ حضرت خواجہ حسن نظامی سے لے کر استاد ہلال چغتائی تک بھی شریک ہوتے تھے۔ استاد ہلال وہ تھے جنہیں مرزا غالب نے ایک دن خواب میں آ کر اپنا خلیفہ بنایا تھا۔ ان کے بے معنی شعروں اور ناموزوں مصرعوں سے لوگ بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔ بول ٹھولی اور فقرے بازی بھی اس مجلس میں خوب ہوتی تھی۔ خود

خواجہ محمد شفیع صاحب بڑے پھبتی باز اور چرب زبان آدمی تھے۔ تھے کیا؟ ابھی ہیں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے، مگر مہاجرت نے ان کی خوش دلی بہت کچھ چھین لی اور لاہور میں کچھ گوشہ نشین سے ہو گئے ہیں۔

دلّی والوں کو تیرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ تیراکی کے بھی دلّی میں کئی استاد تھے۔ ان کی تعلیمیں مشہور تھیں۔ تیراکی جمنا میں سکھائی جاتی تھی، بعض باؤلیوں میں بھی سیکھتے تھے، مثلاً اگر سین کی باؤلی میں۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ یہ اگر سین نہیں اصغر حسین کی باؤلی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ کثر نام بگڑ کر کچھ کے کچھ ہو گئے تھے۔ مثلاً بو علی بختیاری کا بھوری بھٹیاری بن گیا تھا اور شاہ ابوالعلیٰ کا شاہ بولا بن گیا تھا۔

ہاں تو ڈھائی ڈھوئی کا مینہہ برسا۔ ندی نالے چڑھ گئے۔ جمنا لبالب کناروں تک بھر گئی۔ تیراکی کے میلے کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ شاہی کی تو کچھ اور ہی شان تھی۔ بھلا جس کام کی سرپرستی بادشاہ خود کریں اس میں رونق برکت کیوں نہ ہو؟ شہر کا شہر امنڈ کر میلے میں آ جاتا۔ تہ بازاریاں لگ جاتیں۔ بادشاہ اور شہزادے جمنا کے رخ سمن برج (مثمن برج) اور دیوان خاص کے صحن میں آ بیٹھتے۔ بیگمات اور شہزادیاں محلوں کے جھروکوں میں سے سیر دیکھتیں۔ جمنا اس زمانے میں قلعہ سے لگی لگی بہتی تھی۔ ٹولیاں کی ٹولیاں جمنا میں اترتیں اور اپنے اپنے کمالات دکھاتیں۔ کوئی پانی پر چت لیٹا ہے، کوئی پالتی چڑھائے بیٹھا ہے۔ کوئی کھڑی لگا رہا ہے، کوئی شیر کی تیرائی تیر رہا ہے۔ کوئی گٹھری بنا بہا چلا آتا ہے، کوئی مردے کی طرح تختہ بنا ہوا ہے۔ وزیر آباد سے تیراک چھوٹتے اور جمنا کے پل پر آ کر دم لیتے۔ بادشاہ کی طرف سے اچھے تیراکوں کو انعام ملتا۔ یہ میلہ اب تک ہوتا تھا مگر وہ دھوم دھام بادشاہ کے دم کے ساتھ گئی۔ سینکڑوں قسم کی تیرائی تھی۔ چند نام آپ بھی سن لیجیے:۔

کھڑی، ملّاحی، ہنگوری، مورچال، شیر پانی، بھیڑیا پانی، کھڑی ملّاحی، ہاتھ پھینک ملّاحی، چت پٹ، چراغ، گٹھری، دوڑ بھاگ، سُن، کشتی، غوطہ، اکوائی، دو ہنگوری، الٹی پالتی، نیل، رقص، پیر دکھائی، دست بند، فلک رو، کٹورا، دھارا، بغل گیر، آنکھ مچولی، تہ آب، پانی چیر، مگرمچھ، الٹی پلٹی، نماز، پلنگ، نوک جھونک، داؤ پیچ، شمشیر۔

دلّی کے پتنگ باز بھی مشہور تھے۔ بڑے بڑے ہاتھ لگتے تھے۔ قلعہ والے اور شہر والوں کی تکلیں لڑتیں۔ اس موقع کے لیے دنوں پہلے سے اہتمام کیا جاتا تھا۔ کانپ ٹھڈے بڑی محنت سے تیار کیے جاتے، مانجھے سونتے جاتے۔ ذرا ذور سے ڈور ملی اور ایک نہ ایک کٹی۔ لو وہ تکلوں کے منھ ملے اور

دونوں نے ڈھیل دینی شروع کردی۔ دونوں نے سیروں ڈور پلا دی۔ تکلیں تارا ہو گئیں۔ اب جتنی ہی سے تکل کی کیفیت معلوم ہو رہی ہے۔ ایک نے ذرا پٹیا چھوڑا کہ دوسری نے وہیں غوطہ مارا۔ ''وہ کاٹا وہ کاٹا'' کا شور مچ گیا۔ کٹی ہوئی تکل کی ڈور ہاتھ سے توڑ دی گئی اور لوٹنے والوں نے جھٹ ساری ڈور لوٹ لاٹ انٹیاں بنالیں۔ اس دن اس کثرت سے گڈیاں اُڑتیں کہ آسمان چھپ جاتا۔ دمڑ چل، ڈھیل چل، ڈھیل، اڈھا، کلدما، للڈما، چپ، پری، شکر پارہ، پتل، بھیڑیا، کلیجہ جلی، سینکڑوں قسم کی گڈیاں اُڑتیں۔ کوئی ڈھیل دے کر کاٹتا، کوئی کھینچائی کرتا۔ کسی کی دال چو ہوئی، کوئی اینچم کئے لیے جاتا ہے۔ کوئی اپنی نوشیرواں پتنگ پر پھولا نہ سماتا۔ غرض دل بھر خوب لطف رہتا۔ ایسے پتنگ باز دلی میں اب تک موجود تھے جو پتنگ میں گجرا لگا کر اُڑاتے اور پتنگ کو غوطہ دے کر جس کے گلے میں گجرا ڈالنا چاہتے ڈال دیتے، اور رات کو پتنگ میں قندیل باندھ اُڑانا تو ایک عام بات تھی۔

OOO

رہن سہن کی ایک جھلک

اب تو آزادی کا زمانہ ہے اور وہ بھی مادر پدر آزادی کا۔ کوئی روک ٹوک نہیں، کوئی بندش ہی نہیں رہی ورنہ دلّی کی پرانی تہذیب میں عورتوں کا گھر کی دہلیز سے باہر قدم نکالنا بڑے عیب کی بات کہی جاتی تھی۔ ان کی تو مر کے ہی گھر سے کھاٹ نکلتی تھی۔ عورت کا منصب یہ سمجھا جاتا تھا کہ چراغ خانہ بنی رہے۔ شمع انجمن رنڈیاں ہوتی تھیں۔ رانڈ بیوائیں جن کا کوئی والی وارث نہ ہوتا بدرجۂ مجبوری سر پہ برقعہ ڈال کر باہر نکلتی تھیں۔ برقعے آج کل جیسی وضع کے فیشن ایبل نہیں ہوتے تھے۔ سیدھے سادھے لٹھے کے ڈھیلے ڈھالے جن میں سے ڈیل ظاہر نہ ہوتا تھا کہ برقعہ میں کوئی جوان عورت ہے یا بڑھیا۔ ہمارے ایک ملنے والے تھے باقر۔ بڑے پھکو، بڑے فقرے باز۔ آوارہ اور بدمعاش تو نہیں تھے مگر پھبتی اور بولی ٹھولی سے نہیں چوکتے تھے۔ جالی میں سے جب صاف دکھائی نہیں دیتا تھا تو عورتیں نقاب کو اندر سے چٹکی میں لے کر ایک آنکھ کھول لیا کرتی تھیں، مگر بس صرف ایک آنکھ۔ رات کو نو بج رہے تھے اور ہم سب اپنے اپنے گھروں کو جامع مسجد سے جا رہے تھے۔ مٹیا محل کے بازار میں سامنے سے ایک برقعہ والی ایک آنکھ کھولے چلی آ رہی تھی۔ جب وہ برابر سے گزری تو میاں باقر نے کہا ”آنکھ تو اچھی ہے!“ وہ عورت ذرا کی ذرا ٹھٹکی، اس نے باقر کی طرف دیکھا اور تنتناتی ہوئی چلی گئی۔ اگلے دن میاں باقر ملے تو بولے ”اماں کل بڑا غضب ہوا۔ میں جو گھر پہنچا تو خالہ جان نے مجھے دیکھتے ہی کہا ”کیوں میاں باقر، میری آنکھ تو اچھی ہے نا؟“ ایک بارگی تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ خالہ جان کیا کہہ رہی ہیں۔ پھر انہوں نے غصے سے کہا ”تو راہ چلتی عورتوں کو چھیڑتا ہے، تجھے شرم نہیں آتی؟“ تب میں سمجھا اور مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا“ ہم نے کہا ”یہی ہوتا ہے۔ چاہ کن را چاہ در پیش۔“

ہمارے ہوش کی بات ہے کہ شادی تھی یا کسی اور تقریب میں عورتوں کو گھر سے باہر جانا ہو تو ڈولی

گھر کے دروازے پر لگ جاتی۔ گھر والے گلی کے رخ چادر تانتے جب ڈولی میں سواریاں بیٹھ جاتیں تو ڈولی کے پردے پر وہی چادر ڈال دی جاتی۔ اُترتے وقت بھی پردے کا یہی اہتمام ہوتا تھا۔ کہار آواز لگاتے ''سواریاں اُتروالو'' گھر کی عورتیں ڈیوڑھی میں آکر انہیں اُتروالیتیں۔ کہار منھ پھیر کر چادر تان لیتے۔ کہاروں کو مزدوری اور انعام دے کر رخصت کیا جاتا۔ کہار محلے ہی کے ہوتے تھے۔ اور پورے محلے کے اعتماد کے ہوتے تھے۔ انجانے کہاروں کے ڈولی میں عورتیں نہیں سوار ہوتی تھیں۔ ہر محلے کے سرے پر کہاروں کی دکان ہوتی تھی۔ بڈھے کہار بھی ہوتے تھے اور جوان کہار بھی مگر کبھی کوئی ایسی ویسی بات ان کی سننے میں نہیں آئی۔ ڈولی میں اگر کبھی کوئی چھوٹا موٹا زیور گر جاتا تو کہار خود گھر آکر دے جاتے۔ نیچ قوم کے ہوتے تھے مگر ایسے وفادار اور دیانتدار کہ شریف بھی کیا ہوں گے۔ یہی کہار گھر گھر حصے بھی پہنچاتے تھے اور ذمے داری کے چھوٹے موٹے کام بھی کرتے تھے۔

گھر کی چار دیواری تک محدود زندگی کی تہذیب میں گھر بیٹھے ہر ضرورت کی چیز خریدی جا سکتی تھی۔ اگر گھر وال خود سودا سلف نہ لا کر دے سکتا ہو تو محلے کے بڑے بوڑھے گھر گھر پوچھتے پھرتے تھے کہ کچھ منگوانا تو نہیں ہے؟ اگر منگوانا ہوتا تو ان چچا میاں یا دادا میاں کو پیسے دے دیے اور بڑے میاں اپنے سودے سلف کے ساتھ محلے والوں کے سودوں کی پٹلیاں بھی باندھ لاتے۔ ویسے بھی ہر محلے میں قصائی، کنجڑے، تیلی، تنبولی، بنئے اور بساطی کی دکان ہوتی تھی۔ بچہ بھی بے خطر سودا لے آیا کرتا تھا۔ دکانوں کے علاوہ دن بھر پھیری والے آتے رہتے تھے رات گئے تک ان کی سریلی آوازیں گونجتی رہتیں۔

آم والا کہتا ''کیرانے کا لڈوا۔ سردی کی بہار''

شہتوت والا کہتا ''ریشم کے جال میں ہلایا قدرت کا۔ نلکیاں بتا جیب کھالو''

جامنوں والا ہانک لگاتا ''کالی کالی بھونرا لی جامنیں ساون بھادوں کا نمکین''

فالسے والا پکارتا ''اودے اودے نون کے بتاشے شربت کو''

بیر والا کہتا ''جھاڑی بوٹی کے بیر، گھونگھٹ والی نے توڑے ہیں بیر، لگ گیا کانٹا بکھر گیا بیر''

غرض قطب صاحب کی کھرنیاں ہیں۔'' ''میرٹھ کے کسیرو ہیں۔'' ''سہارنپور کے پونڈے ہیں۔'' ''لکھنؤ کے خربوزے ہیں۔'' ''جمنا کی فولیز کے شہیدی تربوز ہیں۔'' ''شیدی عنبر کے باغ کی کھجوریں ہیں، دمڑی اور چھ کی پا۔'' ''کیوڑے کی بیل کے سنگھاڑے ہیں، دودھیا اور میٹھے۔'' ''شربت کی برف ہے، ملائی کی برف ہے، ربڑی کی برف ہے، ملائی کے لوٹے ہو رہے ہیں۔'' ''چنے پر مل

گرم۔" "دہی بڑے کی چاٹ۔" "دولت کی چاٹ۔" غرض ہمہ نعمت الغاروں بکتی چلی آتی ہے۔ شام کے جھٹ پٹے سے رات کے ڈھلنے تک پھول والے گلی گلی آواز لگاتے "پھول لو جی موتیا کے۔ کیا ہی بہار ہے موتیا میں، کٹورے ہو رہے ہیں گجراتی موتیا کے" دو چار پیسے کے پھول ہر گھر میں خریدے جاتے۔ پردے میں سے ہاتھ بڑھا کر سودا لے لو۔ گھر سے باہر قدم نکالنے کا کیا کام؟ گھر بیٹھے دلّی کی عورتیں بیٹی کا پورا جہیز خرید لیا کرتی تھیں۔

یہ تو تھے مرد پھیری پر سودا بیچنے والے۔ عورتیں بھی ضرورت کی چیزیں گھروں میں آ کر دے جایا کرتی تھیں۔ ذرا دن چڑھتا تو کا چھن اپنا چھبیا لیے آ پہونچی۔ اس کے کچالو اد بدا کر کھائے جاتے۔ پیسہ دو پیسہ میں ایسا مزے دار پتہ بنا کر دیتی کہ ہونٹ چاٹتے رہ جاؤ۔ ابلے ہوئے آلو، شکر قند، امرود، کمرخ، کھیرا، ککڑی، کیلا، پپیتا، سب کے دو دو قتلے ڈھاک کے ایک صاف ستھرے پتے پر رکھ کر کالی مرچیں، لال مرچیں، لاہوری نمک، کالا نمک، شکر اور نہ جانے کیا کیا ایک ایک چٹکی ان پر بُرک دی۔ پھر پتے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کا ایک پیالہ سا بنایا، ایک گھیا میں سے کھٹائی یا املی کا پانی پتے ہی کے چمچے سے نکال کر کچالوؤں پر ڈالا اور تمام قتلوں کو دھیمے دھیمے اُچھال کر اچھی طرح ملا دیا۔ پھر سرکی کی چلی سیکوں سے دونے میں تانکے لگا دیے اور ایک تنکا کچالوؤں میں گھونپ گھر والی کے حوالے کیا۔ انہوں نے کہا "بچیوں کیلیے بھی بنا دو" کاچھن نے دُعائیں دیں اور حسب ضرورت پتے بنا دیے۔ کسی بچی نے کہا، "اچھی ہم تو آلو کی کلھیا کھائیں گے۔" کاچھن نے کہا، "ابھی دیتی ہوں اپنی بیٹی کو آلو کی کلھیا بنا کر" یہ کہہ کر اس نے ایک بڑا ابلا ہوا آلو لیا۔ اوپر سے اس میں اپنا نوکدار چاقو بھونک کر ایک ڈاٹ سی اس میں سے نکالی، پھر خالی جگہ میں مسالے بھرے اور کھٹائی کا پانی ڈالا، ڈاٹ اوپر سے رکھ کر آلو کی کلھیا بچی کے حوالے کی اور دعائیں دینے لگی، "اللہ عمر دے، نیک نصیبہ کرے۔"

دعائیں دینے کا رواج ۱۹۴۷ء تک تھا۔ جو عورت بھی کسی کام سے گھر آتی یا سودا بیچنے آتی تو ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی دعائیں دینی شروع کر دیتی۔ "اللہ سلامت رکھے، بچے جئیں، دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو، سر کی بادشاہت بنی رہے۔ روزی روزگار میں برکت ہو، حکم بنا رہے۔"

کمینوں کی بول چال بھی شریفوں کے گھروں میں آنے جانے کی وجہ سے منجھ گئی تھی، اور دلّی کی مہترانیوں کی زبان تو اس قدر ستھری ہوتی تھی کہ باہر والے ان سے دلّی کی زبان سیکھتے تھے۔ دلّی کی عورتوں تک بھلا باہر والوں کی رسائی کیسے ہو سکتی تھی؟ سر عبدالقادر مرحوم نے بھی جب دلّی سے اپنا

رسالہ ''مخزن'' نکالا تھا تو مہترانیوں سے بہت محاورے سیکھے تھے۔

ڈاکٹر فیلن جس کی انگریزی اُردو ڈکشنری مشہور ہے اس گھمنڈ میں تھے کہ انہیں اہل زبان سے کہیں زیادہ اُردو آ گئی ہے۔ سید احمد صاحب نے جنہوں نے ''فرہنگ آصفیہ'' چار جلدوں میں لکھی ہے، صاحب کو بتایا کہ دلّی کے شرفا کا تو ذکر ہی کیا، آپ یہاں کے کمینوں جتنی بھی اُردو نہیں جانتے۔ ڈاکٹر یہ بات سن کر سرخ ہو گئے۔ بولے ''آپ میرا امتحان لیجیے۔'' اتنے ہی میں ایک مہترانی اپنا ٹوکرا اٹھائے سامنے سے گزری۔ سید صاحب نے کہا ''ذرا اسی سے بات کر لیجیے، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟'' صاحب نے کہا ''بلاؤ اسے'' سید صاحب نے مہترانی کو آواز دی' اے بوا ذرا یہاں آنا۔ صاحب تم سے بات کرنا چاہتے ہیں؟'' مہترانی نے آ کر کہا ''فرمایئے کیا بات کرنی چاہتے ہیں؟'' صاحب نے کہا ''تم ہم سے کچھ پوچھو۔'' وہ سٹ پٹائی کہ یہ گورا آخر چاہتا کیا ہے؟ کہیں سٹھیا تو نہیں گیا موا؟ سید صاحب نے کہا ''تم ان سے کسی محاورے کے معنی پوچھو'' مہترانی نے کہا ''اچھا تو میں اس ٹوکری کو لپک کر ڈلاؤ پر ڈال آؤں تو پوچھوں گی۔ صاحب بغلیں جھانکتے رہ جائیں گے۔'' ڈاکٹر فیلن کے کان کھڑے ہوئے مہترانی یک ہی فقرے میں دو باتیں ایسی کہہ گئی جو مجھے معلوم نہیں ہیں۔ مولوی صاحب سے پوچھا ''کیوں مولوی صاحب ڈلاؤ کسے کہتے ہیں اور بغلیں جھانکنا کیا ہوتا ہے؟'' سید صاحب نے کہا ''تیل دیکھیے تیل کی دھار دیکھیے۔ ابھی تو دیکھیے کہ وہ واپس آ کر کیا پوچھتی ہے۔'' اتنے میں مہترانی واپس آ گئی۔ بولی ''ہاں صاحب بہادر بتاؤ — اگن کے بچے کھجوروں میں کا کیے مطلب ہے؟'' صاحب واقعی بغلیں جھانکنے لگے۔ مہترانی نے کہا ''بس ہو گئی تُر کی تمام؟ پھٹے سے منھ'' صاحب کا سارا علم دھرا کا دھرا رہ گیا۔ بیچارے منہ لے کر رہ گئے۔

یہی کیفیت دھوبن، چوڑی والی، مہندی والی اور کھلی والی کی بھی تھی۔ دلّی والیاں بھی ان کا اتنا ہی خیال رکھتی تھیں۔ بڑے ادب لحاظ کی زندگی تھی، ہر شخص اپنی قدر پہچانتا تھا۔ دلّی کی مہترانی کا قیاس آج کل کی مہترانی پر نہ کیجیے۔ ایسی مہترانیاں تو دلّی کی مہترانیوں کے ہاتھ تلے کام کرتی تھیں۔ ہمارے محلے کی مہترانی کا نام انار و تھا، مگر کیا مجال کہ کوئی اسے انارو کہہ کر آواز دے لے۔ بڑے اور ہم عمر اسے بی انارو کہتے اور چھوٹے خالہ انارو۔ صاف ستھرے کپڑے، گلے میں موتیا کا موٹا سا کنٹھا، دونوں ہاتھ چاندی کی چوڑیوں سے بھرے ہوئے۔ کلائیوں میں دس دس تولے چاندی کے گنگرو دار ٹھوس کڑے۔ کانوں میں بالیاں اور پتے۔ ناک میں سونے کی کیل۔ بڑھاپے میں بھی دانت پورے قائم تھے۔ مِسّی

ملی ہوئی رنگیں، جمی ہوئیں۔ ہونٹوں پر لاکھا۔ سفید بالوں میں مہندی لگی ہوئی، موٹی سی چوٹی پیچھے پڑی ہوئی۔ چوٹی میں رنگین سوباف۔ ہاتھ پیروں میں مہندی رچی ہوئی۔ پور پور چھلّے کیوں نہ ہو؟ خیر سے سہاگن تھیں۔ رنگ بڑھاپے میں میلا ہوگیا تھا، جوانی میں اجلا ہوگا۔ خود کہا کرتی تھیں کہ "ہم بھی کدمی جوان تھے۔ رنگ انار کا دانا تھا، جدہی تو نام "انارو" پڑا خیر تو بی انارو بڑے ٹھسّے سے آتیں اور دعاؤں اور سلاموں کے بعد صحن میں پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتیں۔ بیگم کا اشارہ پا کر گھر کی بڑی بہو اٹھ کر ان کے لیے پان بناتیں، اس میں زردے کی چٹکی ڈالتیں۔ پہلے جا کر بی انارو کو ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کرتیں، پھر پان پیش کرتیں تو وہ دوپٹے کا دامن پھیلا دیتیں اور دعائیں دیتیں "اللہ چاند سا بیٹا دے، کمانے والوں کی خیر رہے۔" اتنے بی انارو کی کیری صحن کی جھاڑو نکالے اور کوڑا کرکٹ سمیٹے بی انارو محلے اور شہر کی سنی سنائی خبریں سنا دیتیں۔ "اے بیگم کچھ سنا تم نے؟ پیش کار صاحب کی لڑکی کی بات ٹوٹ گئی۔ لو بیوی، غضب خدا کیا زمانہ آ گیا! اے بیگم، ٹھیکرے کی مانگ تھی وِن کی۔ اور وہ جو تحصیلدار صاحب ہیں نا اونچی ڈیوڑھی والے؟ وِن کے ہاں جو چھوکری چھکیا ہے وِس نے تحصیلدارنی کی انگوٹھی چرالی۔ جب چار چوٹ کی مار پڑی تو قبولی اور نیفے میں سے انگوٹھی نکال کر دی مردار نے۔ کلّو دھنئے کے ہاں کل وہ بجوگ پڑا الٰہی توبہ! اے کوئی بات بھی ہو؟ گھر والی نے کہیں یہ کہہ دیا کہ اب خیر سے لڑکی سیانی ہونے کو آئی، اس کا بھی کچھ فکر کرو۔ بس بیگم، وہ تو نہ جانے کب سے بھرا بیٹھا تھا؟ وِن نے چیخ چیخ کے گھر سر پر اٹھا لیا۔ مردوئے کی مت اوندھ گئی ہے۔ اے نہوتی میں کیا بیاہ شادیاں نہیں ہوتیں؟ اے ہے کیسی پٹکی پڑ گئی میری یاد پر' اے بیگم کچھ اور بھی سنا؟ وہ جو کمپنی باغ میں چاندنی چوک کے رخ کے گھنٹہ گھر کے سامنے ملکہ ٹوریا کا بت ہے نا؟ رات کو کسی نے وِس کی ناک کاٹ کر گلے میں جوتیوں کا ہار ڈال دیا۔ لنگڑا کوتوال اور کنستر بھی دیکھنے آیا تھا۔

کسی بچی نے چوک کر پوچھا "کنستر؟"

"اے اوئی! میں کیا انگریزی جانتی ہوں؟ وہ ہے نا انگریز حاکم؟"

"اچھا کمشنر۔"

"اے ہاں وہی، بڑا جھلایا ہوا تھا۔"

غرض بی انارو اور محلے اور شہر کی ساری خبریں سنا گئیں۔ ایک بار پھر کلّا تازہ کیا اور دعائیں دیتی رخصت ہوئیں۔ دو وقتی کو آتی تھیں۔ شام کو بھی یہی کیفیت گزرتی تھی۔ ان کا شمار ہر گھر کی بڑی

بوڑھیوں میں ہوتا۔ کسی بچے کی نازیبا حرکت دیکھتیں تو اسے چمکار پچکار کر سمجھاتیں۔ اگر کوئی پھر بھی نہ مانتا تو اسے ڈانٹ دیتیں۔ ان کے کہے کا کوئی برا نہ مانتا تھا۔

دلی کی مہترانیوں کے شوہر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ بس کھاتے پیتے تھے اور سنڈیاتے تھے۔ کسرت کرتے اپنے اکھاڑے میں زور کرتے اور کشتی لڑتے۔ اسی لیے دلی کے تمام مہتر پہلوان کہلاتے تھے۔ بی انارو اپنے میاں کا ذکر کرتیں تو انہیں "تمہارے پہلوان" کہتیں۔ مہترانیاں تک اپنے شوہروں کے نام نہیں لیتی تھیں۔ شوہر کا نام لینا بے شرمی کی بات سمجھی جاتی تھی۔

چوڑی والیاں یوں تو ہر مہینے ہی آیا کرتی تھیں مگر شادی بیاہ میں اور تیج تہوار کے موقع پر ان کی چاندی ہوتی تھی۔ چوڑیوں کی قیمت کے ساتھ نہیں تہواری یا نیگ بھی ملتا تھا۔ اب تو خیر بیس تیس برس سے یہ رواج نہیں رہا تھا، دلی کی عورتیں لاکھ کی چوڑیاں بڑے شوق سے پہنا کرتی تھیں۔ لاکھ کی چوڑیوں پر سنہری روپہلی پنیاں چڑھائی جاتیں اور ان پر پھول پتے بنائے جاتے تھے۔ منہاریوں کے ٹھکانے بھی بندھے ہوئے تھے۔ ایک گھر کی منہیاری دوسرے گھر میں نہیں جایا کرتی تھی۔ چوڑی والی کو دیکھتے ہی بچیاں بے قرار ہو جاتیں۔ چوڑی والی اپنے ٹوکرے میں سے کانچ کے چوڑیوں کے لچھے نکال کر فرش پر رکھ دیتی۔ جس کو جو چوڑی پسند آئی منہیری نے پہنادی۔ چوڑی پہنانا بھی ایک فن ہے۔ جن کے ہاتھوں میں ہڈی ہوتی ہے انہیں چوڑی پہنانی اور بھی مشکل ہوتی ہے۔ دلی کی چوڑی والیاں ہاتھ کو ملائم کر کے تنگ سے تنگ چوڑیاں چڑھادیتی تھیں۔ ڈھیلی ڈھل ڈھل چوڑیاں کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ بچیوں کے ہاتھ بھر جاتے تو بچیاں پہلے چوڑی والی کو سلام کرتیں، اس کے بعد سب گھر والوں کو۔ پھر بہوئیں چوڑیاں پہنتیں اور سب سے آخر میں بیگم صاحب کی باری آتی۔

چوڑی والی کہتی "اے بیگم ان موئی کانچ کی چوڑیوں کو چھوڑیے۔ آپ کے لیے تو میں لاکھ کی نفیس چوڑیاں لائی ہوں۔ یہ ملاحظہ کیجیے۔"

بیگم نے دیکھ، بولیں "واقعی میں بہت اچھی چوڑیاں ہیں۔ بس یہی پہنا دو۔"

چوڑی والی نے مٹی کے تیل کی ڈبیہ نکالی، سروتا نکالا، بیگم کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹھنڈی کیں، پھر لاکھ کی چوڑی کاٹی اور دو چار کو سینکا اور منہ کھول کر کلائی میں ڈال جھٹ سے اس کے سرے جوڑ دیے اور اس احتیاط سے کہ بیگم کی کلائیوں کو سینک تک نہیں پہنچی۔ بیگم نے چوڑیاں پہن کر منہیارنی کو سلام کیا چوڑی والی نے دعاؤں کا تار باندھ دیا۔ بیگم نے کہا "مجھے کالی نخیں اور دھانی ٹکیں بھی پسند

ہیں۔ اب کے آؤ تو لیتی آنا۔"

چوڑی والی نے کہا "اے میں واری گئی صدقے گئی، دیکھنا کیسی پر بین نخیں اور بانکیں لاتی ہوں اپنی بیگم کے لیے۔" بیگم نے صندوقچی کھول کر تہواری دی اور بی چوڑی والی دعائیں دیتی چلی گئیں۔

مہندی والی بوا فرید آباد کی ہیں، جہاں کی مہندی مشہور ہے۔ سیدانی کی گلی سے مہندی کے پُوے لاتی ہیں اور گھر گھر دے جاتی ہیں۔ ان کی مہندی میں ملاوٹ بالکل نہیں ہوتی۔ ہاتھ ایسے ہو جاتے ہیں جیسے شیر مال کے ٹکڑے۔ اصل میں مہندی والی بوا جوانی میں بیوہ ہو گئیں تھیں۔ پھر مرنے والے کے نام پر ہی بیٹھی رہیں اور پہاڑ سی جوانی یونہی کاٹ دی۔ بہتیرا ان سے کہا کہ دوسری شادی کر لو مگر یہ رضامند نہ ہوئیں۔ کہتی تھیں کہ اگر قسمت میں سہاگن ہونا لکھا ہوتا تو یہی کیوں مرتا؟ سلائی کرتی تھیں اور مہندی بیچتی تھیں۔ دو بچیوں کو پال پوس کر اٹھا بھی دیا تھا۔ بیٹی داماد کہتے ہیں کہ "اب تم گھر بیٹھ کر اللہ اللہ کرو، تمہیں اپنی بوڑھی ہڈیاں پیلنے کی اب ضرورت نہیں۔" مگر یہ کہتی ہیں کہ "میں گھر میں بیکار پڑے پڑے چارپائی توڑا کروں، اس سے کیا فائدہ؟ خدا کے فضل سے میرے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں تو میں پرائے ٹکڑوں پر کیوں پڑوں؟ بہت گئی تھوڑی رہی۔ اللہ چلتے ہاتھ پیر ہی اٹھا لے۔" ان کی غیرت قبول نہیں کرتی کہ بیٹی داماد کے گھر پڑ جائیں۔

کھلی والیوں کا لباس ایک خاص وضع کا ہوتا تھا۔ لمبا سا کرتا، تنگ مہری کا پاجامہ، پاؤں میں گھیتلی جوتی۔ گھر گھر پھر کے کھلی دے جاتی تھیں۔ کھلی میٹھی بھی ہوتی ہے کڑوی بھی۔ میٹھی کھلی منہ ہاتھ دھونے کے کام آتی تھی اور کڑوی کھلی گائے بھینس کو دودھ بڑھانے کے لئے کھلائی جاتی تھی۔ کھلی، ابٹنے اور بیسن کے زمانے کبھی کے لد گئے۔ اب تو طرح طرح کے صابن ہیں جن سے جلد کو نقصان تو پہنچ سکتا ہے فائدہ مطلق نہیں پہنچ سکتا۔ عورتیں آنولوں، ریٹھوں، ملتانی مٹی، سیکا کائی اور دہی سے بال دھویا کرتی تھیں۔ ان سے بال بڑے اور چمکدار ہو جاتے تھے۔ اب تو جھبرے بالوں کا رواج ہے، اور بقول ایک کرخندار کے "جنٹلمین عورتیں" تو پر قینچ ہو گئیں۔ کبھی دلّی کے گھرانوں میں نائنیں آتی تھیں۔ ان کا کام سر دھلانا، بچیوں کی مینڈھیاں گوندھنا، بڑوں کے سروں میں تیل ڈالنا اور کنگھی چوٹی کرنا ہوتا تھا۔ مانگ نکالنا اور گپھے بنانا رنڈیوں کی وضع میں داخل تھا۔ اب تو آزادی کا زمانہ ہے۔ حدود و قیود سب اٹھ گئیں۔۔۔ نئے زمانے کی ہوا میں چراغ خانہ جھلملا کر بجھ گیا اور شمع انجمن کی لو اور اونچی ہو گئی۔ ○○○

بھانڈ اور طوائفیں

شاہی اور شہر آبادی کا تو ذکر ہی کیا، اب سے چالیس سال پہلے تک دلّی میں ایک سے ایک منچلا رئیس تھا۔ ریاست تو خیر باپ دادا کے ساتھ ۱۸۵۷ء میں ختم ہوگئی تھی مگر فرنگی سرکار سے جو گزارہ انہیں ملتا تھا اس میں بھی ان کے ٹھاٹ باٹ دیکھنے لائق تھے۔ انہیں میں سے ایک بگڑے دل رئیس تھے جو اپنی شاہ خرچیوں کی وجہ سے نواب کہلانے لگے تھے۔ انہیں نت نئی سوجھتی تھی۔ کبھی بیت بازی ہوتی، کبھی مشاعرہ ہوتا، کبھی تاش، پچیسی اور شطرنج کی بازیاں ہوتیں۔ کبھی میر باقر علی داستان گو طلسم ہوشربا کی داستان سناتے۔ کبھی گانے بجانے کی محفل ہوتی اور کبھی ناچ رنگ کی سج جمتی۔ رات کو کھانا سب نواب صاحب کے ہاں کھاتے۔ نواب صاحب کھانے کے شوقین تھے، ایک آدھ چیز خود بھی پکاتے تھے اور دوستوں کو کھلا کر خوش ہوتے تھے۔ دیوان خانے میں کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کھلی چھت پر سب آگئے۔ دری چاندنی کا فرش ہے۔ چاروں طرف گاؤ تکئے لگے ہوئے ہیں، مہمان ان کے سہارے ہو بیٹھے۔ حقے اور پیچوان لگ گئے۔ خمیری کی لپٹیں آنے لگیں۔ گلاب پاش سے گلاب چھڑکا گیا، موتیا کے گجرے کنٹھے گلے میں ڈالے گئے۔ چنگیروں میں چنبیلی کے پھول در عطر میں بھیگی ہوئی روئی رکھی ہے۔ چاندی کے خاصدانوں میں لال قند کی صافیوں میں دیسی پان کی گلوریاں رکھی ہیں۔ چوگھڑا الائچیاں، زردہ اور قوام علیحدہ رکھا ہے۔ پان کھائے گئے، حقے کے کش لگائے گئے۔ آپس میں بولیاں ٹھولیاں ہوئیں، آوازے توازے کسے گئے، ضلع جگت اور پھبتی بازی ہوئی۔ اتنے میں چاند نے کھیت کیا۔ چاند کے چڑھنے تک یونہی خوش گپیاں اور نوک جھونک ہوتی رہی۔

جب چاندنی خوب پھیل گئی تو نواب صاحب نے میر کلو کی طرف دیکھا۔ یہ کلو دیوان خانے کے مختار کل تھے۔ تمام انتظامات میر کلو ہی کیا کرتے تھے۔ نواب صاحب نے کہا

''کیوں صاحب، کیا دیر دار ہے؟''

میر کلّو نے کہا ''حضور، حکم کا انتظار ہے۔''

وہ بولے ''تو شروع کر دو۔''

پہلو کے کمرے سے سبز رنگ کی پشواز پہنے ایک اجلے رنگ کی حسین عورت خراماں آ کر سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ محفل پر اس نے ایک نظر ڈالی اور پھر نہایت ادب سے مُجرا عرض کیا۔ اوہو! یہ تو موتی بھانڈ ہے! پیچھے دو سارنگی والے، ایک طبلہ نواز اور ایک مُجیرے والا، اجلی پوشاکیں پہنے آ کھڑے ہوئے۔ طبلے پر تھاپ پڑی، سارنگیوں پر لہرا شروع ہوا، طبلہ نواز نے پیش کار لگایا، موتی بھانڈ نے گت بھری تو یہ معلوم ہوا کہ اندر کے اکھاڑے کی پری اُتر آئی۔ تین سلاموں پر چکّر دار گت ختم ہوئی تو سب کے منھ سے ایک زبان ہو کر نکلا ''سبحان اللہ!'' موتی بھانڈ نے تسلیمات عرض کی۔ کوئی ایک گھنٹے تک کتھک ناچ کے مشکل توڑے سنائے، پھر لَے کی تقسیم ایک سے سولہ تک دکھائی، آخر میں تتکار کا کمال دکھایا۔ سب نے دل کھول کر داد دی۔ واقع میں موتی بھانڈ نے اپنے فن میں کمال حاصل کیا تھا۔ اور جب اس نے مور کا ناچ دکھایا تو اس کے تھرکنے پر محفل لوٹ گئی۔ نواب صاحب نے ناچ ختم ہونے پر اسے بلایا اور کہا

''موتی تم پر یہ فن ختم ہے۔ مور کا ناچ سبھی ناچتے ہیں مگر جس طرح تم ناچتے ہو یہ اور کسی کے بس کی بات نہیں۔ بالخصوص ناچتے ناچتے مور جب اپنے پیروں کو دیکھتا ہے تو اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں، اس کیفیت کو جس خوبی اور سچائی سے تم ادا کرتے ہو بس یہ تمہارا ہی حصہ ہے۔'' نواب صاحب نے یہ کہہ کر ایک اشرفی اور چند روپے انعام دیے۔ موتی بھانڈ نے انعام لیکر مؤدبانہ تین سلام کیے اور ہاتھ جوڑ کر کہا:

''حضور کی ذرّہ نوازی اور فن کی قدردانی ہے کہ اس غلام کو یوں سراہتے ہیں۔ ورنہ میں کیا میری بساط کیا؟ من آنم کہ من دانم۔''

یہ شائستگی اور یہ علم مجلسی دلّی کے فنکاروں میں اب سے نصف صدی پہلے تک موجود تھا۔ جب فنکار اور فن کی ناقدری ہونے لگی تو فنکار کا وقار اور فن کا اعزاز جاتا رہا۔ موتی کے بعد دلّی میں نوری اور کلّن جیسے بھانڈ رہ گئے تھے جو بھنڈیلوں اور نقالوں کے سہارے زندہ تھے، اور کمینوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ جس زمانے میں گانے بجانے کو عیب نہیں ہنر سمجھا جاتا تھا دلّی کے شرفاء اسے فن کی حیثیت

سے سیکھتے تھے۔ دلی میں اچھے استادوں کی کمی نہیں تھی۔ کوئی ستار سیکھتا، کوئی طبلہ۔ کسی کو گانے کا شوق ہوتا تو راگ، راگنیاں سیکھتا اور کسب و ریاض سے اس علم و فن میں اتنی مہارت حاصل کر لیتا کہ پیشہ ور بھی اس کا لوہا ماننے لگے۔

گانے بجانے کے سلسلے میں دلی کی ڈیرہ دار طوائفوں کا مختصر سا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ نئی نسل اب سے پچاس سال پہلے کی طوائفوں کا صحیح تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ڈیرے دار طوائفیں پیشہ نہیں کماتی تھیں، اور نہ عام طوائفوں کی طرح مجرے کرتی تھیں۔ ان کے ٹھکانے دراصل تہذیب کے ادارے ہوتے تھے جن میں تمیز، اخلاق اور شائستگی سکھائی جاتی تھی۔ ہر کس و ناکس ان کے ہاں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ ہمارے ہوش سے پہلے کی بات ہے کہ شرفا ان کے ہاں اپنے بچوں کو تہذیب سیکھنے کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ دوانی جان اور چونی جان کی یادگار موتی جان اور نوشابہ جان البتہ ۱۹۴۷ء تک دلی میں موجود تھیں جو نہایت مہذب مشہور تھیں۔ دوانی جان وہی تھیں جن کے بارے میں توتلے شہزادے مرزا چپاتی نے یہ شعر کہا تھا۔

ڈھتے ڈھتے ہو دئی اتی ہلت

تھات پیسے تی دو انی رہ دئی

یعنی۔

گھٹتے گھٹتے ہوگئی اتنی ملت

سات پیسے کی دو انی رہ گئی

نوشابہ جان کا نام گانے اور بجانے میں بھی نکلا ہوا تھا۔ دلی کے گنے چنے شرفا کے گھرانوں میں جایا کرتی تھیں اور اپنے کمال فن کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ شعر بھی کہتی تھیں۔ دلی کی بیگماتی زبان بولتی تھیں۔ بولی ٹھولی اور ضلع جگت میں بھی نہیں چوکتی تھیں۔ اگر کبھی باہر سے قابل تکریم فنکار شہر میں آتے تو ان کی دعوت کرتیں، سو پچاس شرفاء کو بھی بلاتیں۔ پہلے دستر خوان بچھایا جاتا، اس کے بعد پان، حقہ، سگریٹ سے تواضع ہوتی۔ سب گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھتے۔ فقرے بازی ہوتی، پھبتیاں کسی جاتیں۔ کسی کو ثقل محل بنایا جاتا، یہ عموماً کوئی ثقہ بزرگ ہوتے۔ برجستہ شعر پڑھے جاتے، ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں، مگر کیا مجال جو ذرا بھی کسی سے بیہودگی ہو جائے۔

پھر بی جان کا اشارہ پاتے ہی سفردا (سپرد ار) آگے آ کر سلام کرتے۔ سارنگیے غلاف اُتار کر طربیں ملاتے، طبلہ نواز اپنی گٹھری کھول کر دائیں کو چھوٹی سی ہتھوڑی سے ملانے لگتے۔ سازمل جاتے تو بی

جان سامنے آکر بیٹھ جاتیں۔ دونوں سارنگئے دائیں بائیں ہو بیٹھتے۔ طبلہ نواز پیچھے بیٹھتا۔ پھر ایک خادم تانپورہ لاکر بی جان کے سامنے پیش کرتا۔ وہ پہلے دائیں کان کو چھوتیں، پھر تانپورہ سُر کرنے لگتیں۔ سارنگیوں نے شُدھ ٹھاٹ ملایا ہے۔ بی جان نے پنچم کا تانپورہ ملایا۔ جب چاروں تار مل گئے تو سب نے کہا "ماشاء اللہ" طبلے والے نے تھاپ دی۔ دونوں کی لے مل گئی۔ بی جان نے سب سے اجازت چاہی اور وقت کا راگ بہاگ الاپنا شروع کیا۔

نوشابہ جان شاہی گائیک استاد تان رس خاں کے بیٹے استاد امراؤ خاں کی شاگرد ہیں۔ بھری آواز، درودیوار سے سُر برسنے لگے۔

الاپ ختم کر کے بلمپت خیال "کیسے سکھ سوں" چاردم کے تکواڑے میں گایا۔ سب نے ان کے دم سانس کی تعریف کی۔ اس کے بعد دُرت خیال "اب رے لالن مینکو" تین تال میں سنایا۔ ایک تان آتی اور ایک جاتی۔ کسی نے مومن خاں کا شعر پڑھا۔

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے آواز تو دیکھو

بی جان آداب بجالائیں۔ بولیں

بزرگوں کا صدقہ ہے۔ یہ گائیکی خاص دلّی کی ہے۔ اگر اجازت ہو تو بادشاہ کی دو ایک بندشیں سناؤں۔"

سامعین نے کہا "نیکی اور پوچھ پوچھ؟ ضرور سنایئے۔"

بی جان نے بہادر شاہ ظفر کا بنایا ہوا بہاگ کیسری بہار کا خیال سنایا۔

رُت بسنت میں اپنی امنگ سوں
پی ڈھونڈن میں نکسی گھر سوں

رت بسنت میں......

ملے تو لال گروا لگاؤں
پاگ بند ہاؤں پیلی سرسوں

رت بسنت میں......

رنگ ہے سبزہ نرگسی یاں کا
کہے شوق رنگ ، رنگ ہے وا کا
ان بھیدن کو کوئی نہ جانے
واقف ہوں میں وا کی جڑسوں

رت بسنت میں

سب نے تعریف کی کہ واقعی میں شوق رنگ کی بندشیں سب سے الگ ہیں۔ بادشاہ موسیقی کے بادشاہ تھے۔ ایک صاحب نے فرمائش کر دی کہ تان رس خاں درباری کا وہ ترانہ بھی سنا دیجئے جس سے انہوں نے کدو سنگھ پکھاوجی کو نیچا دکھایا تھا۔ بی جان نے اپنے دادا استاد کا ترانہ "تا نا نا نا نا نا بیا بیا یار من" سنایا، اور اتنا تیار کہ ساری محفل عش عش کر اٹھی۔

استادی گانے کے بعد ٹھمری اور دادرے کی فرمائش ہوئی۔ بی جان نے کھماج کی ٹھمری شروع کی "نا ہیں پرت مگی کو چین۔"

ایک صاحب بولے "اگر زحمت نہ ہو تو بتائیے بھی۔"

اب جو بی جان نے اس کے بھاؤ بتانے شروع کیے تو محفل تڑپ تڑپ اٹھی۔ دادرا "سوری بنیا چمکن لاگی" بھی اسی انداز ہ سے گایا۔ آخر میں مرزا غالب کی غزل

"دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی"

سنانی شروع کی۔ جب اس شعر پر پہنچیں

وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

تو ایک بزرگ نے دونوں زانو پیٹ کر کہا "ہے، ہے!"

اور جب مقطع سنایا

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

تو ان بزرگ کی حالت غیر ہوگئی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور منہ پر رومال ڈال کر سسکیاں لینے لگے۔ انہیں دیکھ کر ساری محفل افسردہ ہوگئی۔

بی جان نے خادم کو اشارہ کیا "چائے لاؤ۔" اور اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئیں۔ قریب بیٹھنے والوں نے کہا

"نوشابہ بائی، آج تو تم نے غضب کر دیا۔ کہتے ہیں کہ گانا چلتا ہوا جادو ہے۔ تم نے اس کہاوت کو سچ کر دکھایا۔"

بائی جی نے کہا:

"یہ آپ لوگوں کا حسنِ سماعت اور اللہ کا کرم ہے۔"

خشک میوے اور تازہ پھلوں کے تھال آنے لگے۔ چائے آئی اور بی جان نے سب کو خود پیالیاں بنا کر دیں۔ پھر وہی قہقہے چہچہے شروع ہو گئے۔ رات گئے محفل برخاست ہوئی۔ یہ ۱۹۳۰ء کی ایک یادگار محفل تھی جس کا نہایت مختصر آنکھوں دیکھا حال پیش کیا گیا۔

موتی جان پاکستان بننے کے بعد لاہور چلی آئیں۔ چند سال ہوئے ان کا انتقال ہو گیا نوشابہ بائی دلّی ہی میں ہیں۔ گوشہ گیری اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ جب دلّی اُجڑ گئی تو اس کی محفلیں کیسے آباد رہتیں؟

ان کے جانے سے یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

مشہور گانے والیوں میں امیر جان پانی پت والی، کالی جان، کیٹی جان، شمشاد بائی، اللہ دی غازی آباد والی، نواب پتلی۔ مجیدن بائی اور کئی اونچے درجے کے گانے والیاں تھیں جن کے ہاں شرفاء کی مخصوص نشستیں ہوتی تھیں۔ جب باہر بلائی جاتیں تو ہزار روپے روزانہ پر جاتی تھیں اور آئے دن ریاستوں اور رئیسوں میں بلائی جاتی تھیں۔ یہی ان کے تموّل کا راز تھا۔

ان میں سے دو ایک کو چھوڑ کر باقی سب شکل و صورت کے اعتبار سے واجبی واجبی ہی سی تھیں۔ مگر گانے کے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ اندر کے اکھاڑے کی پریاں زمین پر اُتر آئی ہیں۔ کیٹی جان کا رنگ کالا تھا مگر نور کا گلا پایا تھا۔ شامتِ اعمال ایک دن سبز رنگ کی ساڑی پہنے لال کنویں سے گزریں تو ایک کرخندار نے آوازہ کسا۔

"ابے شابو، دیکھ رہا ہے تُو لگی کیری کو؟"

یہ پھبتی ایسی چپکی کہ چپک کر رہ گئی اور بی جان بھی اس پر جھوم گئیں۔ ○○○

دلّی کا ایک شریف گھرانا

بوڑھا وقت زمانے کی کتاب پڑھ کا ورق پر ورق الٹتا چلا جاتا ہے، ہر دفعہ ایک نقش دکھ تا ہے، یوں ہی نقشے بناتا اور مٹاتا ہے۔ زمانے کی یہی ریت ہے کہ سدا ایک سا نہیں رہتا۔ یہی نیرنگی تو دنیا کو خوبصورت بناتی ہے، نئے نئے پہلو دکھاتی اور دلوں کو لبھاتی۔ مٹے ہوئے نقشوں کی یاد عبرت دلاتی ہے۔ ع

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

تاریخ کے ہزاروں ورق عظمت رفتہ کی داستان سنا رہے ہیں۔ مسلمان بادشاہ سرزمین ہند پر بادشاہی تھوڑی کرتے تھے، خدائی کرتے تھے مگر شاید وہ بھی نمرود کی خدائی تھی کہ اس کا تختہ ہی الٹ گیا۔ ع

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

وہ تو خیر بہت پرانے قصے ہیں۔ اب سے پچاس سال پہلے کی باتیں بھی خواب و خیال ہوئی جا رہی ہیں۔ یہ جو سامنے ڈیوڑھی نظر آ رہی ہے کیا آپ جانتے ہیں کس کی ہے؟ یہ نواب آغا میر کی ڈیوڑھی ہے۔ نواب صاحب پوتڑوں کے امیر تھے کبھی اس ڈیوڑھی پر ہاتھی جھولتے تھے۔ دربان، حاجب دروازے کے سہ دروں میں موجود رہتے تھے۔ مجال کیا جو پرندہ بھی اندر پر مار جائے۔ دلّی کے روادار لوگوں میں نواب صاحب کا شمار ہوتا تھا۔ غدر میں یہ حویلی لٹنے سے یوں بچ گئی تھی کہ اس کے پہلو میں پٹیالہ والوں کا ایک فوجی دستہ حکیم صاحب کی حفاظت کے لیے مامور ہو گیا تھا۔ مگر جب مغلوں کی بساط الٹ گئی اور آخری بادشاہ بھی اس کے ساتھ لپٹ گئے تو فرنگیوں نے خزینوں اور دفینوں کی تلاش میں دلّی پر گدھوں کے ہل پھروا دیے۔ دلّی ویران عمارتوں کا ایک ڈھیر بن کر رہ گئی تھی۔ نواب آغا میر کی جان بخشی تو فرنگیوں نے کر دی تھی مگر جاگیر ضبط کر لی تھی۔ جب امن جمی ہوئی اور معافی کا اعلان ہو گیا تو نواب آغا میر نے سرکاری اور پاؤں پہنیا کر کے کلکتے تک رسائی حاصل کی اور سرکاری

دولت مدار نے از راہ ترحم ایک ہزار ماہانہ پنشن ان کی مقرر کردی تھی۔ نواب صاحب نے اسی کو بہت غنیمت جانا۔ نوابی کا بھرم بندھا رہا گو شان وشوکت سب رخصت ہو چکی تھی۔ اس انقلاب کا دہاکا کچھ یسا بیٹھا کہ نواب صاحب خانہ نشین، گوشہ نشین اور گوشہ گیر ہو گئے۔ انہی کے اکلوتے بیٹے نواب آغا قدیر تھے۔ باپ کی تباہی دیکھ چکے تھے اور جانتے تھے کہ وہ ریاست لوٹ کر آنے سے رہی، لہٰذا دل لگا کر تعلیم حاصل کی۔ علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد دلّی ہی میں ایک اچھے عہدیدار ہو گئے تھے۔ حکومت نے ان کی کارکردگی سے خوش ہو کر ایک ہزار کا تو نہیں البتہ پانسو کا وظیفہ ان کے باپ کے مرنے کے بعد ان کا جاری کر دیا تھا۔ حویلی میں خوب لہر بہر ہو گئی تھی اور نواب قدیر بھی دلّی کے رئیسوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ آدمی چلن کے تھے، آخر وقت تک ان کی ساکھ قائم رہی۔

ہاں تو ہوا یہ کہ جب ساون سوکھا نکل گیا اور بارش کی آس ٹوٹنے لگی تو ایک شام کو مغرب سے کالی آندھی اٹھی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو گیا۔ آندھی کے پیچھے ہی بھادوں کا بادل کچھ ایسا ٹوٹ کر برسا کہ جل تھل سب ایک ہو گئے۔ نواب صاحب کو دفتر سے گھر پہنچنا مشکل ہو گیا۔ پانی کا زور کم ہوا تو نواب صاحب اپنی فٹن میں گھر پہنچے تو سر سے پاؤں تک شرابور ہو رہے تھے۔ بیگم انہیں اس حال میں دیکھ کر جلدی سے اپنا سروتا اور کسنا چھوڑ کر کھڑی ہو گئیں بولیں:

''اے ہے، سارے کپڑے چوڑا ہو گئے۔ جلدی سے انہیں اتاریئے'' نواب صاحب نے کہا ''بیگم اس کا کچھ ڈر نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کی رحمت ہے۔''

بیگم بولیں'' درست ہے، مگر بھادوں کے مہینہ میں احتیاط لازم ہے۔ میں ابھی آئی۔''

یہ کہہ کر بیگم پہلو والی کوٹھری میں جھپاک سے چلی گئیں اور جھٹ کپڑوں کا جوڑا نکال لائیں۔ اتنے نواب صاحب نے گیلے کپڑے اتار تولئے سے بدن خشک کیا، بیگم نے لپاک جھپاک تکیے پر جانماز لپیٹ کھڑیاے کرتے کی آستینیں چُن دیں اور کھونٹی پر سے بندکش اتار پاجامے میں ازار بند ڈال کپڑے نواب صاحب کے حوالے کیے۔ پھرتی سے کپڑے بدل کر نواب صاحب صدر دالان میں آبیٹھے۔ بیگم نے گاؤ تکیہ لگا دیا۔ نواب صاحب نے پوچھا:

''بچیاں کہاں ہیں۔''

بیگم نے کہا'' باورچی خانے میں۔ مینہ برستے ہی انہیں کڑھائی چڑھانے کی سوجھی۔ میں نے بہترا کہا کہ مینہ تھم لینے دو۔ بھلا آپ کی غضبی بچیاں کیوں ماننے لگیں؟ اور تو اور بی اماں بھی ان کے

ساتھ ہو گئیں۔ اب پکوان اُتر رہا ہے۔"

نواب صاحب نے کہا" پکوان کا مزہ تو گرما گرم کا ہے۔ بیگم ایسا کیوں نہ کریں کھانا بھی ساتھ کھالیں؟"

بیگم بولیں" جی ہاں، مینہ بوندی کا دن ہے، سویرے ہی سے فارغ ہو لینا بہتر ہوگا۔"

یہ کہہ کر بی مغلانی کو آواز دی۔ صحن کے پہلو میں بنی ہوئی کوٹھریوں میں سے ایک بڑی بی" جی حاضر ہوئی" کہتی برآمد ہوئیں۔ سفید دوپٹہ، سفید ململ کا کُرتا، سفید لٹھے کا چست پاجامہ، کھیلی جوتی، سفید سر پر دوپٹہ جماتی سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوئیں۔

بولیں" ارشاد؟"

بیگم: بی مغلانی، دسترخوان لگاؤ۔ بڑی بیگم اور بچوں کو بھی بلاؤ۔

مغلانی: جی بہت اچھا۔

تھیں تو خاصی پکّی عمر کی مگر آنکھ جھپکتے میں بی مغلانی نے پیش دالان میں دسترخوان لگا دیا۔ آفتابہ اور سلفچی لا کر ایک طرف رکھ دی۔ ماما نے پتیلیاں اور روٹی کی چنگیر صحنچی میں بوریہ بچھا کر رکھ دی۔ بیگم نے ڈونگوں میں سالن، قابوں میں کھچڑی اور دسترخوان میں روٹیاں لپیٹ سینی میں رکھ دیں۔ بی مغلانی نے بسم اللہ کہہ کر سینی اٹھائی اور سب چیزیں دسترخواں پر لے جا کر چن دیں۔ تانبے کی قلعی دار رکابیاں اور غوریاں دیوار گیری پر سے اتار کر جھپا جھپ لگا دیں۔ بیگم نے چینی کی پیالیوں میں مرتبانوں میں سے نیبو، آم کا اچار، بادشاہ پسند چٹنی، سرکہ میں پڑی ہوئی پیاز نکال کر رکھی۔ ایک پیالے میں گاؤں کا آیا ہوا گھی نکالا۔ شیشے کی طشتریوں میں پودینہ اور ہری مرچوں کی چٹنی اور لہسن اور لال مرچوں کی چٹنی رکھی۔ بی مغلانی نے یہ سب چیزیں دسترخوان پر پہنچا دیں۔ اتنے میں بچیاں بھی اپنا پکوان لے کر آ پہنچیں۔ دونوں بچیوں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر ادب سے سلام کیا۔ نواب صاحب نے کہا" جیتی رہو، بڑی عمر ہو۔ ہم نے سنا ہے کہ آج ہماری بیٹیوں نے اچھی اچھی چیزیں تلی ہیں۔"

فرخندہ نے کہا" جی ابا جان آپ چکھ کر بتائیے کیسی ہیں؟ بی رخشندہ تو کہتی ہیں کہ بڑی مزے دار ہیں۔"

نواب صاحب: کیوں بھئی رخشندہ، تم نے کیا تلا ہے؟

رخشندہ:۔ پھلکیاں، پالک اور قلمی بڑے تو باجی نے تلے ہیں۔ میں نے گلگلے اور سہال، اچھی

ابا جان، آپ ذرا چکھ کر تو دیکھئے۔

نواب صاحب: اچھا بھئی اچھا۔

بی مغلانی نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ کھانا لگ گیا ہے سرکار۔ نواب صاحب نے کہا ''آؤ بھئی وہیں چل کر کھائیں گے اتنے میں بڑی بیگم بھی آ گئیں۔ نواب صاحب نے آداب کیا۔ بڑی بیگم نے دعائیں دیں۔ جگ جگ جئو۔ ہزاری عمر ہو۔ بی مغلانی نے ہاتھ دھلائے اور سب دسترخوان کے چاروں طرف آ بیٹھے۔ سب نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ پکوان بھی چکھا۔ بڑی بیگم نے کہا ''سلونا بڑی ننھی کے ہاتھ کا ہے اور میٹھا چھوٹی ننھی کے ہاتھ کا ہے۔'' نواب صاحب نے دونوں کی تعریف کی۔ بچیوں کے دل بڑھ گئے۔ نانی اماں نے خوش ہو کر کہا ''میری بچیاں تو ماشاء اللہ دسوں انگلیاں دسوں چراغ ہیں۔ ان کے نصیبے کھلیں۔ ان کے سہرے کے پھول کھلیں۔ جس گھر میں جائیں گی اس گھر میں اجالا ہو جائے گا۔ بچیاں شرما کر چھوٹے دالان میں چلی آئیں۔'' نانی اماں کو تو بس یہی ذکر رہ گیا ہے۔''

کھانے سے فارغ ہو کر نواب صاحب پھر صدر دالان میں آ بیٹھے۔ بیگم نے پان بنا کر خاصدان ان کی طرف بڑھا دیا۔ رفو چھوکرے نے حقہ تازہ کر رکھا تھا، چلم بھر کر حقہ سامنے لگا دیا۔ نواب صاحب اخبار بھی دیکھتے رہے اور بیگم سے باتیں بھی کرتے رہے۔ اتنے میں عشاء کی اذان ہوئی۔ سب نے نماز پڑھی۔ نانی اماں وظیفہ بھی پڑھتی ہیں اور جب وظیفہ پڑھتی ہیں تو بس بولتی نہیں۔ مگر ساری ہدایتیں منہ کھولے بغیر وہیں بیٹھے بیٹھے ''ہوں'' سے دے دیتی ہیں۔ اسی ہوں سے وہ مخاطب کر لیتی ہیں، اسی کو گھٹا لیتی ہیں تو کچھ اور معنی ہو جاتے ہیں اور اسی کو لمبا کر دیتی ہیں تو کچھ اور۔ اسی سے تائید کرتی ہیں، اور جب تردید کرنی ہوتی ہے تو اسی کو دو دفعہ کہہ دیتی ہیں۔ وظیفہ انگلیوں پر برابر چلتا رہتا ہے۔ یہ اگر اپنا منہ کھول دیں تو وظیفہ ہوا ہو جائے۔ بچیاں بعض دفعہ ان کی ہوں کا مطلب نہیں سمجھتیں اور ہنس پڑتی ہیں تو نانی اماں اس قہر کی ہوں کرتی ہیں کہ بچیاں ڈر کر دبک جاتی ہیں۔

نواب صاحب نماز سے فارغ ہو کر اوپر برساتی میں سونے چلے گئے۔ بیگم نے گھر کا برتن بھانڈا سنگوایا، کوٹھریوں میں قفل لگوائے اور گھر کی طرف سے اطمینان کر کے خود بھی اوپر چلی گئیں۔ نانی اماں دونوں بچیوں کو لے کر اوپر ہوادار کمرے میں آ گئیں۔ اس میں دو پلنگ بچھے ہیں۔ اجلے اجلے بچھونے ہیں۔ ایک تپائی پر جھجری اور کٹورا رکھا ہے۔ تپائی کے پاس ہی لوٹا بھرا رکھا ہے۔ نانی اماں نے اپنی پن کٹی نکالی۔ اس میں لگا ہوا پان ڈال کر کوٹا۔ پھر چمچی سے کٹا ہوا پان کھا۔ یوں کلہ تازہ کر اپنے پلنگ پر

اٹھلیں۔ چھوٹی ننھی نے کہا" اچھی نانی اماں، صابر بادشاہ زادے سنا دیجئے۔" بڑی ننھی بولی" ہم تو لال شہزادے کی کہانی سنیں گے۔" نانی اماں کی جان دونوں نے ضیق میں کر رکھی ہے۔ بھلا دو کہانیاں ایک ساتھ کیسے سنائیں؟ دونوں ضد کر رہی ہیں کہ نہیں، پہلے میری کہانی سنائیے۔ نانی اماں کو دونوں کی آنکھیں برابر ہیں۔ کس کی سی کہیں؟ اتنے میں پڑوس سے گانے کی آواز آئی۔ جھولے کا گیت ہے۔ جھولے کی لے پر لڑکیاں بالیاں گا رہی ہیں۔ رات کے سناٹے میں سماں بندھ گیا۔

نانی اماں نے کہا" لو بوا، پہلے تم یہ گیت سنو۔ پھر ہم تمہیں اس کی کہانی سنائیں گے۔ بچیوں کا دھیان گیت میں لگ گیا۔

اے جی نیلی سی گھوڑی پاتلی، اور پا تکیا ہے سوار، اور سانولیا ہے سوار
پیاسے کو پانی پلا سوری گوری تو راہ مسافر جائے
اے جی بھر پیو، چھیلا بھر پیو، اور بھر پیو ڈول پچاس
جس رے سیاں کی میں بالی بہوریا، تو تم سے ہیں، براج مزدور
اے جی کاہے کا تیرا اگڑوا، اور کاہے کا تیرا اڑول
کاہے کی تیری اینڈوی ری گوری تو کیا ہے جوبن کا مول
اے جی سونے کا میرا اگڑوا، اور روپے کا میر ڈول
رتن جڑاؤ میری اینڈوی، تو جوبن میرا انمول
اے جی مٹی کا تیرا اگڑوا، اور لوہے کا تیرا اڑول
گھاس پھونس کی تیری اینڈوی تو دو ٹکے جوبن کا مول
بھر گھڑ داوہ لے چلی اور چڑھ گئی کوٹھے اوپر
کوٹھری کے اندر پلنگ بچھایا اور مکھ پر ڈالا رومال
اے جی کیا تمہیں آئی ہے نیندیا، کیا تمہیں چڑھا ہے خمار
دل کی تو کنڈی کھولو میرے رسیا تو مکھ سے ہٹاؤ رومال
نہ مجھے آئی ہے نیندیا، نہ مجھے چڑھا ہے خمار
وہ دن یاد کرو سوری گوری جو پنگھٹ پہ بولے تھے بول
اے جی میں کیا جانوں میرا شاہی تھا تھوڑا پانی میں دیتی پلا

بارہ برس کی میں بیاہی تھی بالم، اور بارہ برس پیچھے آئے

گانا ختم ہوا تو قہقہوں چہچہوں کی آوازیں آنے لگیں۔

بڑی ننھی نے کہا ”نانی اماں، یہ گانا تو میں نے پہلے بھی سنا ہے اور مجھے اچھا بھی لگتا ہے، مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں سوال جواب کیسے ہیں؟

چھوٹی ننھی نے پوچھا ”کیا اس میں کوئی کہانی ہے“ نانی اماں؟“

نانی اماں نے کہا ”ہاں بیٹی کہانی تو ہے ہی۔ قصہ اصل میں یوں ہے کہ ایک لڑکی تھی۔ جب وہ بارہ برس کی ہوئی تو اس کی شادی کے پیغام آنے لگے۔ تم جانو جہاں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔ اس کی ایک جگہ بات پکی ہوگئی اور نکاح بھی ہوگیا مگر رخصتی کی نوبت نہ آئی تھی کہ لڑکا فوج میں بھرتی ہوکر پردیس چلا گیا۔ کوئی بارہ برس کے بعد وہ کما دھما کر بے اطلاع دیے اپنے گھر واپس آیا تو اپنی بستی کے پنگھٹ پر پانی پینے کے لیے ٹھہر گیا۔ اتفاق سے اس وقت اس کی بیوی ہی پانی بھر رہی تھی۔ مگر نہ تو میاں بیوی کو جانتا تھا اور نہ بیوی میاں کو پہچانتی تھی۔ بانکے سوار نے جو پانی مانگا تو لڑکی کو خیال آیا کہ کہیں یہ شرارت تو نہیں کر رہا ہے؟ لہٰذا اس نے چیخ کر جواب دیا ”ایسا ہی پانی پینے کا شوق ہو رہا ہے تو خود بھر پیو۔ مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ میں تمہیں پانی پلاؤں میں تو اس میاں کی بیوی ہوں کہ تم جیسے اس کے پاس کئی نوکر چاکر ہیں۔“

بانکا سوار اس مغرور لڑکی کی باتیں سن کر بدکا اور یوں جھڑکے جانے پر چراغ پا ہوکر بولا ”تیرا گھڑا کاہے کا، اور ڈول کاہے کا ہے؟ تیری اینڈوی کس چیز کی بنی ہوئی ہے، اور خود تیری قیمت کیا ہے؟“

لڑکی نے اترا کر کہا ”میرا گھڑا سونے کا ہے اور ڈول چاندی کا۔ میری اینڈوی میں جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ اور رہی میری قیمت تو میری قیمت کوئی نہیں لگا سکتا۔“

بانکے سوار نے ناک بھوں چڑھا کر کہا ”بس رہنے بھی دے۔ مٹی کا تو تیرا گھڑا ہے، اور ڈول لوہے کا، گھاس پھوس کی تیری اینڈوی ہے، اور تیری اوقات دو ٹکے کی ہے۔“

لڑکی اس کے طعنے سن کر لال پیلی ہوتی اپنے گھر پہنچی اور کوٹھے پر چڑھ گئی۔ اس نے سوچا تھا کہ کمرہ بند کرکے اکیلے میں خوب رو کر اپنے دل کی بھڑاس نکالوں گی۔ مگر کمرے میں پہنچ کر دیکھا وہی بانکا سوار منہ پر رومال ڈالے اٹوائی کھٹوائی لیے پڑا ہے۔ بہت حیران ہوئی کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ بھلا یہ میرے گھر میں کیوں گھس آیا؟ یہی کھڑی سوچ رہی تھی کہ کسی نے اس کو بتایا ”اری یہی تو تیرا میاں

ہے۔ خیر سے بارہ برس پیچھے گھر آیا ہے۔'' یہ سن کر لڑکی کو بڑا پچھتاوا آیا کہ میں نے ناحق اپنے شوہر کو سخت سست کہا۔ جبھی تو کہتے ہیں کہ کسی انجانے سے بدکلامی نہیں کرنی چاہیے۔ خیر، جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اسے اب کس طرح منانا چاہیے۔

''بولی'' اے جی، کیا تمہیں نیند نہیں آ رہی ہے یا بہت تھک گئے ہو؟ مجھے اپنے دل کی بات تو بتاؤ اور اپنے منھ پر سے رومال ہٹاؤ۔''

اس کے میاں نے کہا ''نہ تو مجھے نیند آ رہی ہے اور نہ میں تھکا ہوا ہوں۔ وہ وقت یاد کرو جب تم نے پنگھٹ پر مجھے جھڑکا تھا۔''

لڑکی نے شرمندہ ہو کر خوشامد سے کہا ''لو بھلا میں کیا جانتی تھی کہ تم کون ہو؟ میں تو سمجھی تھی کوئی راہ گیر ہے جو مجھ سے ٹھٹھول کر رہا ہے۔ جبھی تو میں نے الٹے سیدھے جواب دینے شروع کیے۔ جو میں یہ جانتی کہ تم ہی میرے شوہر ہو تو تمہیں پانی پلا دیتی۔ جب تم سدھارے تھے تو میں بچی تھی۔ میں نے تمہیں دیکھا بھی نہیں تھا۔ بارہ برس بعد تم اصل خیر سے لوٹے ہو۔ بھلا میں تمہیں کیسے پہچان لیتی؟''

یہ سن کر میاں کا غصہ اتر گیا اور روٹھے من گئے۔ پھر خوب ہنسی ہوئی۔

بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

دونوں بچیاں اس کہانی کو سن کر بہت خوش ہوئیں۔ گیت کا مطلب اب ان کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

نانی اماں نے کہا

''اللہ نے جیسے ان کے دن پھیرے سب کے دن پھیرے۔''

○○○

دلّی کی ایک پرانی حویلی

کوچہ نواب مرزا میں نواب آغا مرزا کی حویلی کون نہیں جانتا؟ کھڑی آسمان سے باتیں کرتی ہے، اس حویلی نے بھی کبھی اچھے دن دیکھے تھے۔ شہر آبادی کے زمانے میں اس حویلی کی ڈیوڑھی پر ہاتھی جھولتے تھے۔ صبح وشام نوبت جھڑتی تھی۔ نواب مرزا پورٹوں کے رئیس تھے۔ ان کے بزرگ صدیوں پہلے ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ صاحب سیف ہونے کی وجہ سے انہیں شاہی افواج میں پنج ہزاری کا عہدہ مل گیا تھا۔ ان کی بہادری کے کارناموں نے انہیں اور فروغ دیا۔ تلوار کے دھنی تھے کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا۔ بھلا جو شخص ہتھیلی پر جان لیے پھرتا ہو اس سے کون جیت سکتا ہے؟ ان کی فتوحات نے انہیں بادشاہ کے مقربین میں شامل کر دیا تھا۔ سپہ گری پشت در پشت ان کے ہاں چلتی رہی۔ آخر میں جب شاہی بے جان ہو گئی تھی تو ان کے آباؤ اجداد کی تلواریں بھی لہو چاٹنا بھول گئی تھیں مگر ان کے اعلیٰ منصب شاہی درباروں میں قائم رہے۔ گاؤں گراؤں اور جاگیریں آخری تاجدار دہلی تک ان کے خاندان میں رہیں۔ ۵۷ء میں جب فرنگیوں کو نکال باہر کرنے کی جدوجہد شروع ہوئی تو نواب مرزا نے کئی محاذوں پر جی توڑ کر دادِ شجاعت دی۔ ان کا دستہ شب خون مارنے میں اس قدر مشہور ہو گیا تھا کہ ان کا نام سن کر ہی غنیم کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔ فوجی فراست کے باوجود فرنگی بھی حیران ہوتے کہ مرزا کو کیسے ان کے کمزور پہلوؤں کی خبر ہو جاتی ہے اور مرزا اس طرح ان کی فوجوں میں گھس آتا ہے جیسے بھیڑوں کے گلے میں بھیڑیا گھس آئے اور دم کے دم میں سب کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر ڈال جاتا ہے۔ دراصل مرزا کے گوئندے طرح طرح کے بھیس بدل کر گھومتے پھرتے تھے اور ذرا ذرا سی بات مرزا کو پہنچاتے رہتے تھے۔ مرزا کا دستہ اپنی کامیابیوں کی وجہ سے چھلاوا مشہور ہو گیا تھا مگر ایک مرتبہ یا تو صحیح حالات معلوم نہیں ہوئے یا مرزا نے اندازہ لگانے میں غلطی کی۔ ہوا یہ کہ

دشمن کی صفوں میں ضرورت سے زیادہ آگے بڑھ گئے اور دشمن کے نرغے میں آگئے۔ جب اس میں سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے اپنے دستے کو للکار کر بتایا کہ "غازیو، تم ان میں سے نہیں جو دشمن کو پیٹھ دکھاتے ہیں۔ تمہیں اپنا قول یاد ہے نا؟ تخت یا تختہ! جیو تو غازی، مرو تو شہید۔" اس للکار سے غازیوں میں وہ جوش خروش پھیلا کہ انہوں نے دشمن کے دانت کھٹے کر دیے۔ مگر مقابلہ سینکڑوں اور ہزاروں کا تھا۔ پھر غنیم کو برابر کمک پہنچ رہی تھی مرزا کا ایک ایک آدمی کٹ مرا اور جب صبح کاذب نے مشرق میں اپنا دھندلکا پھیلانا شروع کیا تو کسی نے مرزا کی پشت میں ایسی سنگین ماری کہ مرزا کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے گر پڑے اور بزدلوں نے ان کی تکا بوٹی کر دی۔ جب مشرق میں خونیں شفق پھولی تو مرزا کے دستے کا ایک فرد بھی زندہ نہیں تھا۔

جب ایسے جانباز نہیں رہے اور اقتدار و اختیار کے لیے کمانڈروں میں پھوٹ پڑی تو دیسی فوجوں کو پے در پے شکستیں ہونے لگیں یہاں تک کہ فرنگیوں کی فوجیں کشمیری دروازے سے آگئیں۔ جب بادشاہ کو اندازہ ہو گیا کہ اب شکست یقینی ہے تو لال قلعہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں چھپ گئے۔ لال قلعہ سے نکلنا اور دیسی فوجوں کے پاؤں اکھڑنا۔ جس کے جہاں سینگ سمائے بھاگ کھڑا ہوا اور فرنگیوں کی فوجیں درّانہ شہر میں گھس آئیں۔ اب جو بے گناہ شہر والوں کا قتل عام شروع ہوا تو نادر شاہ کا قتل عام ان کے آگے گرد ہو گیا۔ لوٹ ایسی مچی کہ دلّی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور دفینوں اور خزینوں کی تلاش میں دلّی پر گدھوں کے ہل پھروائے گئے۔ وہ تو کہیے کہ ایک فوجی دستہ پادریوں کی حفاظت کے لیے قریب ہی متعین کر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے کوچہ نواب مرزا لوٹنے والی فوجوں کی دست برد سے بچ گیا۔ ورنہ آج آغا مرزا کی حویلی میں بسے والوں کا نام و نشان تک نہ ہوتا۔ دلّی پر جب غضب ٹوٹا تو آغا مرزا کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ باپ تو میدان کارزار میں کام آ چکے تھے۔ آغا مرزا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ دلّی کے برے دن آگئے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے سارے خاندان کو لے کر کسی نہ کسی طرح الور پہنچ گئے تھے۔ شہر سے نکلتے ہی رات کے اندھیرے میں کراہنے کی آواز سنائی دی۔ آغا مرزا نے شکرم رکوائیں۔ عورتیں "ہائیں ہائیں" کہتی رہیں اور یہ کود کر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ایک پلندہ اٹھائے آئے اور اپنی شکرم میں اس پلندے کو ڈال کر پھر روانہ ہو گئے۔ یہ دراصل ایک زخمی میم تھی جسے اس کے ساتھیوں سمیت باڑھ ماردی گئی تھی۔ میم زخمی تو بہت ہوئی تھی مگر

مری نہیں تھی۔ اب جو کئی گھنٹے بعد اسے ہوش آیا تو "پانی پانی" کہہ رہی تھی۔ مرزا نے بُجھارے میں سے پانی کٹورے میں ڈال کر اس کے منھ سے لگایا۔ اس نے پانی پی کر آنکھیں کھول دیں اور جب سے معلوم ہوا کہ وہ دیسی آدمیوں میں گھری ہوئی ہے تو دوبارہ بے ہوش ہوگئی۔ مرزا نے پانی کا چھینٹا دیا اور اسے انگریزی میں سمجھایا کہ تم دوستوں میں ہو۔ رات بھر سفر کرنے بعد صبح کو آبادی سے دور پڑاؤ ڈالا۔ مرزا کی والدہ اور بہنوں نے میم کے زخموں کو پانی سے صاف کر کے پٹی باندھ دی اور اسے دلاسا دیا کہ ہم تمہیں تمہارے آدمیوں میں پہنچا دیں گے۔ مگر ابھی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ پھر اسے سمجھا بجھا کر اپنے کپڑے پہنائے اور بیگم نے کہا "آج سے تم میری بیٹی ہو۔ جو کوئی پوچھے تو یہی بتانا۔" میم اچھی خاصی اردو بول لیتی تھی معلوم ہوا کہ وہ ایک کرنل کی لڑکی ہے اور میرٹھ میں پیدا ہوئی تھی۔ باپ پنشن لے کر ولایت جانے والا تھا کہ میرٹھ کے فوجیوں نے انگریزوں کی حکومت کے خلاف سرکشی کر دی اور کئی انگریز افسروں کو مار ڈالا۔ کرنل گھوڑے پر سوار ہو کر ایسے گئے کہ پھر گھر نہ آئے۔ یہاں حالات اتنے خراب ہو گئے کہ اس لڑکی کو اپنی ماں کے ساتھ میرٹھ سے نکل کر دلّی روانہ ہونا پڑا تا کہ جنرل نکلسن کے فوجی کیمپ میں پہنچ جائے۔ مگر دلّی کے قریب جب ان کا قافلہ پہنچا تو ایک دیسی فوجی دستے نے انہیں روک کر باڑھ مار دی۔

الور پہنچ کر نواب مرزا نے مکان کرایہ پر لیا اور ایک جراح نے میم کے زخموں کی مرہم پٹی کی اور زخم بھرنے لگے۔ ادھر یہ ہوا کہ ایک جاسوس نے مرزا کا کھوج نکال کر فرنگیوں کو خبر دی کہ مرزا چھلاوا کا خاندان الور میں چھپا ہوا ہے۔ چھلاوا کا نام سنتے ہی صاحب کے تیور بگڑ گئے۔ فوراً حکم صادر کیا کہ پورے خاندان کو گرفتار کر کے الور سے لایا جایا۔ اور ان کی شناخت جاسوس سے کرائی جائے۔

یہ جاسوس دلّی کا ایک نامی بدمعاش تھا جو کوچہ نواب مرزا ہی میں رہتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنے محلّے ہی میں کسی بہو بیٹی پر آوازے کسے تھے۔ اس کی شکایت نواب مرزا کو پہنچی تو انہوں نے محلّے ہی میں اس بدمعاش کا منھ کالا کر کے جوتے لگوائے تھے اور اس سے کہہ دیا تھا "اگر آئندہ کبھی اس محلّے کا رخ کیا تو گولی مار دوں گا۔" اسے اب بدلہ لینے کا اچھا موقع مل گیا تھا اور گھاتے میں انعام بھی ملنے والا تھا۔ لہٰذا اس کو نواب مرزا کے خاندان کی تلاش رہی اور رفتہ رفتہ اس نے پتہ لگا لیا۔

لو صاحب حکم کی دیر تھی کہ ایک فوجی دستہ اس جاسوس کو لے کر فوراً الور کے پاس پہنچا۔ جیسے ہی

آغا مرزا باہر آئے جاسوس نے کہا "یہی ہے۔ یہی ہے۔" آغا مرزا پوچھتے ہی رہے "کیا بات ہے؟ آپ کو کس کی تلاش ہے؟"

اور انہیں فوراً ہتھکڑی لگا دی گئی۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ دو بہلیوں میں سب کو بھر کے فوجی دستہ دلی روانہ ہو گیا۔ بیگم کو غش پر غش آتے رہے اور میم اسے دلاسا دیتی رہی کہ "آپ بالکل نہ گھبرائیں۔ جب انگریز افسر کے سامنے ہمیں پیش کیا جائے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" مگر بیگم کا دم ہوا ہوا جاتا تھا۔ اور وہ رو رو کر کہے جاتی تھیں۔ "میرا بچہ۔ ہائے میرا بچہ۔"

راستہ بھر کسی کے منہ میں کھیل تک اڑ کے نہیں گئی، تھکن اور بھوک سے نڈھال یہ قافلہ جب دلی پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ انہیں فوجی پارک کے قریب ایک کوٹھری میں اُتارا گیا اور ایک اونچی ان پر پہرہ دار مقرر رہوا۔ مرزا کو حوالات میں بند کیا گیا۔ بیگم اور بہنوں نے نماز پڑھ پڑھ کر دعائیں مانگ مانگ کر رات کاٹی۔ صبح ہوئی تو ان کو فوجی عدالت میں حاضر کیا گیا۔ وہاں اور بھی مسلمان گرفتار کر کے لائے گئے تھے۔ ان کی پیشی ہوئی بغیر کچھ سنے فوجی حاکم نے اُسے توپ دم کرنے یا پھانسی کی سزا فوراً سنا دیتا۔ ان بے گناہوں کو توپ کے منہ سے باندھ کر اُڑا دیا جاتا، یا بھنگی پھانسی پر لٹکا دیتا۔ جب آغا مرزا کی باری آئی تو جاسوس نے بیان دیا کہ یہی وہ شخص ہے جس کا باپ چھلاوا کہلاتا تھا۔ چھلاوے کا نام سنتے ہی حاکم کا منہ سرخ ہو گیا۔ بولا "ہم اسے اپنے سامنے توپ دم کرائے گا۔" اتنے میں برقعہ پوش خواتین میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اپنا برقعہ اُتار پھینکا اور انگریزی میں حاکم سے کچھ گٹ پٹ کی۔ غالباً اسے یہ بتایا کہ اس شخص نے میری جان بچائی ہے۔ حاکم نے حیران ہو کر میم کی طرف دیکھا۔ پھر مرزا کی طرف دیکھا۔ کہا "اچھا ہم میم صاحب کی سفارش پر تمہیں چھوڑتا ہوں، مگر ہم تم کو سزا ضرور دے گا۔ تمہارے باپ کا سارا جاگیر ضبط۔" میم صاحب نے پھر کچھ حاکم سے کہا۔ اس نے سوچ کر کہا "ویل تم نے میم صاحب کا جان بچایا۔ ہم نے تمہارا جان بچایا۔ تم نے میم صاحب کو اچھا کیا، ہم بھی تمہارے ساتھ اچھا کرے گا۔ تمہارے باپ کا آدھا جاگیر تمہیں دے گا۔"

یہ فیصلہ سن کر سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ بیگم تو وہیں سجدے میں گر پڑیں۔ اور دونوں بہنیں میم صاحب سے لپٹ کر رونے لگیں۔ حاکم کے حکم سے مرزا کی ہتھکڑی کھول دی گئی۔ صاحب نے کہا "ہم گورنمنٹ سے سفارش کرے گا۔ تم اپنے گھر جا سکتا ہے۔ ہم تم کو پروانہ لکھ کر دیتا ہے۔"

لو صاحب یا تو مرزا توپ دم ہو رہے تھے، یا اعزاز کے ساتھ اپنے آبائی گھر پہنچائے گئے۔ حویلی ڈھنڈار پڑی تھی۔ فوجیوں نے ایسا ایسا لوٹا تھا کہ اس میں تنکا تک نہیں چھوڑا تھا۔ جان بچی تو لاکھوں پائے، یہ وہی حویلی تھی جہاں چپے چپے پر رونق رہتی تھی یا اب در دیوار سے ویرانی ٹپک رہی تھی۔ ایک تھگلی صاف کر کے یہ لٹا ہوا قافلہ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میم صاحب آئیں تو ان کے ساتھ کھانے پینے کا بہت سا سامان تھا۔ فوجی دستہ باہر ٹھہرا رہا۔ میم صاحب نے کہا آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نے سب انتظام کر دیا ہے۔ فوجی گارڈ آپ کی حفاظت کرے گا۔ اور میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔ میں کمانڈر صاحب سے مل کر آئی ہوں۔ وہ آپ سے بہت خوش ہیں۔ میرے فادر کو بھی انہوں نے کرنال پیغام بھیج دیا ہے۔"

قصہ مختصر کمانڈر صاحب کے حکم سے حویلی پھر سج سجا کر دلہن بن گئی۔ کرنل صاحب کرنال سے آئے تو بیٹی کو زندہ دیکھ کر ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری ہو گئے۔ بار بار آغا مرزا کا شکریہ ادا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ اجازت دو کہ میں اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ ملکہ نے معافیوں کا اعلان کر دیا ہے۔ اب دہلی پھر آباد ہو جائے گی۔ میں کچھ عرصہ دلی میں رہوں گا۔ پھر پنشن لے کر ولایت چلا جاؤں گا۔" سب نے میم صاحب کو خوش دلی سے رخصت کیا۔ مگر وہ جب تک دلی میں رہیں برابر ملنے آتی رہیں۔ حکومت کی طرف سے آغا مرزا کو نواب کا خطاب اور دو ہزار کا وظیفہ ملا۔ ان کے نوابی ٹھاٹ پھر قائم ہو گئے۔

دلی بھی عجیب شہر ہے کہ اس کے بگاڑ میں ایک بناؤ ہے۔ بیسیوں دفعہ لٹی اور ایسی لٹی کہ گھکھہ ہو گئی۔ مگر پھر آباد ہو گئی اور ایسی آباد ہوئی کہ پہلے سے بھی اس کی رونق بڑھ گئی۔ معافیوں کے بعد بچے کھچے دلی والے شہر میں واپس آ گئے۔ پھر باہر والے جوق در جوق آ کر آباد ہونے لگے۔ باہر والوں کو دلی ہمیشہ راس آئی ہے۔ یہ بھی اسی شہر کی خصوصیت ہے۔ ڈپٹی بہاء الدین مرحوم کے صاحبزادے سلطان الدین صاحب نے اس خصوص میں ایک بڑی دلچسپ بات بتائی، انہوں نے کہا کہ "میری دادی صاحبہ فرماتی تھیں کہ دلی دلی والوں کی بیوی ہے اور باہر والوں کی ماں۔" میں نے دادی صاحبہ سے پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ فرمایا "بیوی کی نگاہ شوہر کی جیب پر رہتی ہے اور ماں کی نگاہ اولاد کے پیٹ پر رہتی ہے۔"

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد دلّی کی رونق بڑھتی ہی چلی گئی۔ فرنگیوں نے دلّی کی مرکزی حیثیت کو نظر انداز کر کے کلکتہ کو نیا پایہ تخت قرار دیا۔ مگر دلّی کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کتنے ہی مسلمان امیروں اور رئیسوں کے خاندان دلّی میں پھر قائم ہو گئے۔ انہیں میں سے ایک رُودار خاندان نواب آغا میر کا تھا۔ جب شہر میں اچھی جمی ہو گئی تو بڑی بیگم کو آغا میر کی شادی کی فکر ہوئی اور ایک دن انہوں نے بیٹے سے اس کا تذکرہ کیا۔ سعادت مند بیٹے نے کہا "امی جان مجھے بھلا آپ کی کسی چیز سے اختلاف کرنے کی کیا مجال ہو سکتی ہے؟ میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ مگر کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ پہلے لڑکیاں اپنے اپنے گھر کی ہو جائیں؟" بیگم نے توقف کے بعد فرمایا "ہاں تمہارا خیال صحیح ہے۔ مجھے لڑکیوں کا بھی فکر ہے مگر ابھی ان کی عمروں میں گنجائش ہے۔ مہر افروز ماشاءاللہ پندرھواں بھر کے سولہویں میں پڑی ہے۔ رہی قمر افروز تو وہ ابھی بچہ ہے۔ ابھی خیر سے انہوں نے بارہواں بھی پورا نہیں کیا"

آغا میر امی جان آپ فرماتی ہیں کہ لڑکی پرایا دھن ہوتی ہے۔

بیگم۔ ہاں بیٹا لڑکیاں تو ماں باپ کے پاس امانت ہی ہوتی ہیں۔

آغا میر۔ تو امی جان، جس کا یہ دھن ہے اور امانت ہے اسے سونپ کر پہلے سبکدوش ہو جایئے، اور ہاں، آپ یہ بھی تو فرماتی ہیں کہ لڑکی ککڑی کی بیل ہوتی ہے۔ تو یہ بیل اگر منڈھے چڑھ جائے تو بہتر۔

بیگم۔ آغا بیٹے مجھے اس سے کب انکار ہے؟ اگر تمہاری مرضی یہی ہے کہ پہلے مہر افروز کا بیاہ ہو جائے تو چلو یونہی سہی۔ مگر ساتھ ساتھ اگر میں اپنی بہو بھی تلاش کر لوں تو اس میں کوئی مضائقہ ہے؟

آغا میر۔ جیسی آپ کی مرضی امی جان۔

اس گفتگو کے بعد بیگم نے رشتوں کی تلاش شروع کر دی مگر انہیں اندازہ ہو گیا کہ بیٹے کی مرضی یہ ہے کہ پہلے بہن کا رشتہ ہو جائے۔ لہٰذا انہوں نے بیٹی کا جہیز تیار کرنا شروع کر دیا۔ لڑکے کا کیا ہے۔ لڑکے کی بری بازار میں کھڑی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو جائے گا۔

جس گھر میں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر آتے ہی ہیں۔ آغا میر کے خاندان کا دیکھنا ہی کیا۔ اور انکی دولت کا پوچھنا کیا؟ ان کا خاندان تو آفتاب ماہتاب تھا۔ ایسے ویسے رئیس کو تو ہمت بھی نہیں پڑتی تھی کہ اس گھر میں رشتہ بھیجے۔

ایک دن ایک بڑی بی میلا سا برقعہ پہنے سپڑ سپڑ کرتی ڈیوڑھی میں آ پہنچیں۔ دربان نے پوچھا "بڑی بی تم کون ہو؟

بڑی بی: اے آدمی ہیں، اور کون؟

دربان: یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ تم آدمی ہو مگر تم منہ اٹھائے کہاں گھسی چلی جا رہی ہو؟

بڑی بی: ارے بھائی مجھے بڑی بیگم سے ملنا ہے۔

دربان: ٹھہر و اپنا نام اور کام بتاؤ۔ میں اندر اطلاع کراؤں۔

بڑی بی: اے اوئی آدمی ہے کہ بچے کے بجے کرتا ہے۔ کوئی کام ہو گا جبھی آئے ہیں۔

دربان: ان فضول باتوں سے کچھ نہیں حاصل ہو گا۔ نام بتاؤ اور کام بتاؤ۔

بڑی بی نے دیکھا کہ دربان پسیجنے والا نہیں ہے تو خود پسیج گئیں۔

بڑی بی: اے بیٹا میرا نام بستی ہے۔ میں مشاطہ ہوں۔ دنیا جانتی ہے مجھے۔

دربان نے اندر کے دروازے پر جا کر دستک دی۔ گل چمن نے آ کر پوچھا "کیا بات ہے؟"

دربان: ایک بڑی بی آئی ہیں، نام بستی بتاتی ہیں، کہتی ہیں کہ مشاطہ ہوں۔ بیگم صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتی ہیں۔

گل چمن: میں بیگم صاحب کو اطلاع کرتی ہوں۔

یہ کہہ کر گل چمن چلی گئی اور تھوڑی دیر میں واپس آ کر دربان سے بولی "بیگم صاحب نے فرمایا کہ بڑی بی کو آنے دو۔

دربان: بڑی بی اب تم اندر جا سکتی ہو۔ ہم بغیر اجازت کے کسی کو اندر جانے نہیں دیتے۔

بڑی بی بغیر کچھ جواب دیئے پردہ اُٹھا کر اندر چلی گئیں۔ گل چمن نے انہیں بیگم صاحب کے پاس پہنچا دیا۔ بی بستی نے بیگم صاحب کو دیکھتے ہی دعائیں دینی شروع کر دیں۔ اللہ سلامت رکھے۔ بچوں کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔

بیگم بڑے دالان میں گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی تھیں۔ سامنے پٹاری دھری تھی۔ کٹنے میں سے چھالیا نکالتیں اور کترتی جاتیں، بولیں آؤ بیٹھو کیسے آنا ہوا؟"

بی بستی پھسکڑا مار کر سامنے بیٹھ گئیں۔ بی بستی۔ اے اللہ رکھے۔ ہمارا تو کام ہی خدمت کرنا

ہے۔ ماشاء اللہ چھوٹے نواب کا کارکب کرنے کا ارادہ ہے؟

بیگم: آغا میاں کی تو مجھے کچھ ایسی جلدی نہیں ہے، خود ان کی بھی ابھی مرضی نہیں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ پہلے بہنوں کے فرض سے ادا ہو جائیں۔

بی بستی: بیگم آپ کا بچہ ہیرا ہے ہیرا۔ بڑے بڑے گھر والے ہاتھ جوڑ کر اپنی بیٹی دیں گے۔

بیگم نے پان بنا کر بوا بستی کو دیا۔ انہوں نے اپنا کلا تازہ کیا۔ زردے کا بکٹا بھرا اور دو چار دفعہ اپنا پوپلا منہ چلا کر پان کلے میں سرکا لیا۔

بیگم: یہ جو خان صاحب ہمارے محلے ہی میں رہتے ہیں ان کے لڑکے کا رشتہ تم ہی نے کرایا تھا۔

بی بستی: کون سے خان صاحب؟ چنگی پڑے میری یاد پر، کوئی بات نگوڑی یاد ہی نہیں رہتی۔

بیگم: کریم اللہ خان ہیں نا، گوڑ گانوے میں تحصیلدار صاحب تھے جن کا بڑا لڑکا سلیم اب نائب تحصیلدار ہے۔

بی بستی: ارے یہ اپنے تحصیلدار صاحب جن کا مکان کنویں کے سامنے ہے

بیگم: ہاں وہی۔

بی بستی ہاں بیگم تو رس کے سال میں نے ہی میاں سلیم کی شادی کرائی تھی۔ چیلوں کے کوچے والے ٹھیکیدار سلیمان کی صاحبزادی سے۔ اس کی پیٹھ پر کی ایک لڑکی ہے، بھلا سا نام ہے اس کا۔ خیر بیگم کیا بتاؤں۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ ایسی سگھڑ کہ دسوں انگلیاں دسوں چراغ۔ اللہ نے بہت پیسہ دے رکھا ہے۔ لین دین بھی اچھا کریں گے۔ اگر آپ کہیں تو چھوٹے نواب کے لیے وہاں بات لگاؤں۔

بیگم: بوا میں نے کہا نا تم سے، ابھی لڑکے کی جلدی نہیں ہے البتہ لڑکی سیانی ہو گئی ہے۔ پہلے اس کا فکر کرنا ہے۔

بی بستی: اے اس میں فکر کی کیا بات ہے بیگم؟ ہم آخر کس دن کام آئیں گے۔ میں تو رشتوں کا ڈھیر لگا دوں گی اپنی ننھی کے لیے۔

بیگم (ہنس کر)۔ خیر بھی ڈھیر تو نہ لگاؤ۔ ایک رشتہ لاؤ۔ مگر اچھا لاؤ۔ ہمیں تم جانتی ہی ہو۔

بی بستی لو! ایک میں کیا؟ سارا شہر جانتا ہے۔ دولت، عزت، شہرت، اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔

میں دو ایک ہی دن میں نام نویسی لے کر آتی ہوں۔ اللہ نے چاہا تو دیکھ کر آپ کا جی خوش ہو جائے گا۔

بیگم: میں نے تحصیلدارنی سے تمہاری تعریف سنی ہے۔

بی بستی: یہ ان کی مہربانی ہے بستی اور مشاطاؤں کی طرح نہیں ہے کہ زمین و آسمان کے قلابے ملا کر ایسے ویسے رشتے ادا کر دے۔ لو اب مجھے اجازت دو۔

یہ کہہ کر بی بستی اُٹھ کر کھڑی ہوئیں اور سلام کر کے رخصت ہوئیں وہ تو نواب خورشید مرزا کے ہاں سے آئی ہی اس لیے تھیں کہ بڑی بیگم کا عندیہ معلوم کریں کہ لڑکی کی شادی کرنے پر آمادہ ہیں یا نہیں۔ نواب خورشید مرزا کا لڑکا رشید مرزا ماشاء اللہ سترہویں سال میں تھا۔ اس کے لیے دلہن کی تلاش تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ نواب مرزا مرحوم کی دو لڑکیاں ہیں۔ مرحوم نواب سے ان کی دوستی تو نہیں تھی ہاں صاحب سلامت ضرور تھی۔ معاً انہیں لڑکیوں کا خیال آیا اور انہوں نے بی بستی کو بلوا کر اس رشتے کی ٹٹول کرنے کو کہا۔ بی بستی کے تو اب دونوں ہی میٹھے ہو گئے۔ ادھر نواب خورشید مرزا نے ان رشتے کے لیے کہا اور ادھر بڑی بیگم نے، دونوں گھر کھرے تھے۔ بی بستی کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہو گیا۔

○○○

دلّی کے چند گیت

گیت ہماری زندگی کا اہم جزو ہیں۔ پیدائش سے لے کر موت تک ہمارے معاشرے میں ہر موقع کے گیت گائے جاتے ہیں۔ یہ گیت اس لیے گائے جاتے ہیں کہ اس سے زندگی کے دکھ درد میں کمی آتی ہے۔ اگر دلوں کی بھڑاس گیتوں کی شکل میں نہ نکلتی رہے تو جینا اجیرن ہو جائے۔ یہ گیت شہروں کے ہوں یا دیہاتوں کے اپنے زمانے اور ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ شہروں کے گیتوں کی شکل میں شہری زندگی کی ہماہمی جھلکتی ہے۔ اور دیہاتی گیتوں میں کھلی فضا کی تازگی اور سرسبز کھیتوں کی شادابی اپنا عکس دکھاتی ہے۔ یہ گھریلو گیت ہمارے شاعروں نے نہیں بنائے، ان میں عروض کی پابندیاں نہیں ہیں۔ ان کی بحریں مقررہ اوزان پر قائم نہیں کی گئی ہیں۔ صرف جذبات ہیں۔ جو موزوں ہو گئے ہیں۔ ان کے الفاظ کی نوک پلک درست نہیں کی گئی ہے۔ ان کی ترکیبوں کی تراش خراش نہیں ہوئی، ان کے لیے تشبیہیں اور استعارے تلاش نہیں کیے گئے۔ یہ تو سیدھے سادے جذبات ہیں جو دل سے اٹھے اور کسی دھن میں سما گئے۔ دل کی دھڑکن ڈھولک کی چلتی ہوئی لے میں ڈھل جاتی ہے۔ نغمہ سازی اور نغمہ طرازی کو ان گیتوں کی تشکیل میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ عام بول چال کی زبان ہوتی ہے اور آسان دھنیں۔ ایک سہیلی ڈھولک لے بیٹھی اور چار، سے گھیر کر بیٹھ گئیں۔ ڈھولک پر تھاپ پڑی اور ان کا گانا شروع ہو گیا۔ ان گانوں میں نہ تو راگ راگنیوں کی پیچیدگیاں ہوتی ہیں اور نہ تال کی باریکیاں۔ ان میں ساز بھی نہیں ہوتے کہ گانے کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے رہیں۔ ان تمام خامیوں کے باوجود ان گیتوں میں وہ تاثیر ہوتی ہے جو ہماری ترقی یافتہ موسیقی میں بھی نہیں ہوتی۔ اس اثر آفرینی کی بڑی وجہ ان گانوں کا برمحل ہونا کہ جیسا موقعہ ویسا گیت۔ فضا پہلے سے سازگار ہوتی ہے۔ ادھر گیت شروع ہوا اور ادھر اس کے بول اور چلتی ہوئی دھن فضا پر چھا گئی، دلوں کو برما گئی۔

ہمارے گھریلو گیت ٹولیاں بنا کر ہی گائے جاتے ہیں۔ مہمانوں کی گہما گہمی میں ویسے ہی کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے؟ شادی کے گھر میں بیسیوں کام ساتھ ساتھ ہوتے رہتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ عورتوں کی باتیں ہیں کہ کسی طرح ختم ہونے میں ہی نہیں آتیں۔ نہ جانے کب کب کی بچھڑی ہوئی سہیلیاں ایسے خوشی کے موقعوں پر ملتی ہیں۔ دنیا زمانے کے گلے شکوے کرنے کا بھی موقع ہوتا ہے۔ خوشی کے اس مختصر وقفے میں ایک عمر کی باتیں ہو جاتی ہیں۔ تمام ضروری مسائل بھی حل ہو جاتے ہیں۔ کدورتوں سے دل بھی صاف ہوتے جاتے ہیں۔

جب مہر دلہن کا پاؤں بھاری ہوا تو طبیعت سست سست رہنے لگی۔ گھر کے کاموں میں جی نہ لگتا تھا۔ ہاتھ پاؤں اینٹھیاں، سر میں چکر، طبیعت گری جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ مونہہ لپیٹ کر پڑ رہیں۔ کسی سے بات تک کرنے کو جی نہ چاہتا۔ دستر خوان پر کھانا چنا جاتا تو جی مالش کرنے لگتا۔ ہاں املی کھٹی کمرخوں، کیریوں اور چٹ پٹی چیزوں کو جی چاہتا۔ کاچھن گھر میں آتی تو اس سے کتارے لیتیں اور اپنے سہ درے میں جا کر نمک لگا کر چٹخارے لے لے کر کھاتیں۔ غضب خدا کا مٹی کھانے کو جی چاہتا تو ملتانی اور کوئلے تک کھا جاتیں۔ اپنی اس تبدیلی پر انہیں خود حیرت ہوتی کہ الٰہی یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ گھر والے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟ اور ایک دن تو یہ ہوا کہ دستر خوان پر سبھی بیٹھے تھے۔ اور بوا قابوں میں سالن لا لا کر رکھتی جا رہی تھیں۔ قورمہ تھا، دوپیازہ، ماش کی دال، کریلوں کا ڈلما تھا۔ آج ذرا طبیعت ٹھکانے سے تھی۔ مہر دلہن نے سوچا آپ خوب جی بھر کے کھاؤں گی۔ مگر جیسے ہی سیخ کے کبابوں کی غوری سامنے آئی۔ ایک دم سے ایسی ابکائی آئی کہ دوپٹے کا آنچل منہ میں ٹھونس کر دستر خوان پر سے بھاگیں غسل خانے کی طرف۔ ان کے پیچھے پیچھے ساس بھی قدم بڑھا کر پہنچیں تو دلہن کو جی خراب کرتے دیکھا کلی کر کے باہر نکلیں تو ساس نے کہا:

"اے دلہن، خیر تو ہے؟"

دلہن نے آنکھیں نیچی کر کے کہا "جی ہاں، امی جان، نہ جانے جی کیوں متلا گیا۔ صبح میں نے بے بھوک کے ناشتہ کر لیا تھا، شاید اس وجہ سے ہو۔"

ساس نے کہا "تم چل کر لیٹو، میں ابھی حکیم جی کے ہاں سے شکنجبین منگواتی ہوں۔"

بہو نے سہ درے کا رخ کیا۔ ساس جہاں دیدہ آدمی تھیں۔ زیر لب مسکراتی ہوئی دالان میں آئیں۔ میاں نے پوچھا:

"بیگم خیر تو ہے؟"

بیگم نے کہا "ہاں، اللہ ہی خیر رکھے۔"

میاں: "کیوں کیا بات ہے۔"

بیگم: اے ہے، کچھ بھی نہیں۔تم تو بچے کے بچے کرنے لگتے ہو۔

میاں ان کی مسکراہٹ سے اصل معاملہ کی تہہ کو پہنچ گئے۔ سب نے جلدی جلدی کھانا کھایا۔ جب تخلیہ ہوا تو بیگم نے میاں سے کہا "مبارک ہو، بہو ماشاءاللہ، دوجیا ہو رہی ہیں۔"

میاں، میں تمہارا اشارہ سمجھ گیا تھا مگر مجھے تو بے چاری پر ترس آ رہا ہے۔'

بیگم: "اے ہٹو، تم تو یونہی پھپھرا تلنے لگتے ہو۔ کونسی دنیا جہاں سے نرالی بات ہے؟ جب کوکھ ہری ہوتی ہے تو یہی باتیں ہوتی ہیں۔ اے جب خیر سے میاں بلند اقبال میرے پیٹ میں پڑے تھے تو میرے کیسے کیسے دھیاڑے ہوئے تھے؟ مجھے تو پانی تک نہیں پچتا تھا۔ منہ اوندھائے چھوٹے دالان میں پڑی رہتی تھی، اور تم دوائیاں ٹھنڈائیاں کرتے پھرتے تھے۔ کیا سب بھول گئے؟"

میاں: نہیں، بھولا نہیں۔ ترس تو تم پر بھی آتا تھا۔

بیگم: "اب تم پر ترس ورس کو تو چھوڑو اور دعا کرو کہ مہر دلہن خیر کے ہتھ پھیر سے فارغ ہوں اور پلنگ کو لات مار کر کھڑی ہو جائیں۔"

یہ خبر سسرال اور میکے میں دم کے دم پھیل گئی۔ مبارک سلامت ہونے لگی۔ مہر دلہن کو چھاؤں میں رکھا گیا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھیں۔ قدم قدم پر اللہ آمین ہوتی رہی۔

مہر دلہن کو جب ساتواں مہینہ لگا تو ان کے میکے سے سدھوڑ آئی۔ اس میں سات طرح کی ترکاریاں امرود، نارنگیاں، کیلے وغیرہ اور کچھ پکوان تھا۔ تیسرے پہر کو مہر دلہن کو نہلا دھلا کر سرخ جوڑا پہنایا گیا، اور سارا گہنا بھی۔ بہنوں نے گود بھری۔ مہر دلہن کی گود میں سدھوڑ کا سامان بھرا گیا۔ مقصد یہ کہ ان کی گود بھری رہے۔ یہ کل سامان اور نیگ کے روپے نندوں کے حصے میں آئے۔ بہنوں نے جھنڈولا توڑا۔ ناریل کی گری اگر سفید نکلی تو سب نے کہا اجلا پھل یعنی بیٹا پیدا ہوگا۔ اگر میلی نکلی تو کہا گیا کہ لڑکی ہوگی۔ نیگ کے روپے دولہا کی بہنوں کو تقسیم ہوگئے۔ اور ترکاریاں وغیرہ کنبے میں بٹ گئیں۔ اے لو، سب کو خبر ہوگئی کہ ستوانسے کی ترکاری ہے۔ رات کو ڈومنیوں کا گانا ہوا۔ بڑے مزے کی نقلیں ہوئیں۔

آٹھواں مہینہ خیر سے گزرا۔ نواں شروع ہوا تو مہر دلہن کے میکے سے نوما کا جوڑا۔ کنگھی، مسی، مہندی، عطر، پھول چوڑیوں کے جوڑے آئے۔ دولہا کی بہنوں کو پھر ستواسے کی طرح جوڑا نیگ ملا۔ بیگم نے بہو کے لیے منوں سے پنجیری بنوائی۔ آدھی پنجیری کنبے میں بٹی۔ آدھی مہر دلہن اپنے ساتھ لے کر پاؤں پھیرنے میکے گئیں۔ دو چار دن میکے میں رہیں۔ واپس آئیں تو پنجیری کے خالی خانوں میں ان کے میکے والوں نے ترکاریاں اور مٹھائی ساتھ کی۔ ساس نے پالکی میں سے اُتروایا۔ قدم قدم پر بسم اللہ بسم اللہ کرتی بہو کو صدر دالان میں لائیں۔ یہاں بائیں ہاتھ کے کونے میں بہو کا چھپر کھٹ لگا ہوا تھا۔ یہ کونا بڑا بھاگوان سمجھا جاتا ہے۔ میاں بلند اقبال بھی یہیں پیدا ہوئے تھے اور ان کے ابا بھی۔

سندر دائی روزانہ پھیرا کرتی اور مہر دلہن کو دیکھتی بھالتی رہتی۔ جب اس نے بتایا کہ خیر سے پورے دن لگ گئے ہیں تو بیگم نے کیوکا منگوایا۔ زچگی کے وقت اور اس کے بعد جس سامان کی ضرورت ہوتی ہے اسے کیوکا کہتے ہیں۔ اس میں گوند، بادام، مکھانے، مصری، چھوارے، سونف، اجوائن، کھوپرا، گھی، کھانڈ اور گھٹی ہوتی ہے۔ چھوٹی بڑی ہڑیں، منقی، باؤ بڑنگ، باد کھبہ، عناب، زر کچور، املتاس، شہد، بنفشہ، خمیرہ گاؤزبان، عرق بادیان، شربت عناب، سب چیزیں پہلے منگا کر رکھ لیں تاکہ وقت پر بھاگ دوڑ نہ کرنی پڑے۔ بچے کے نہالچے، پوتڑے، تکیاں، کرتے، ٹوپی، رضائی، کساوے، ساس نے پہلے ہی سے تیار کر رکھے ہیں۔ نہ جانے کس وقت ان کی ضرورت پیش آ جائے۔

مہر دلہن کو درد لگنے لگے۔ مگر وہ شرم کے مارے منہ سے اف تک نہ کرتی تھیں۔ جب ضبط نہ کر سکیں تو چپکے سے سندر سے کہا۔ سندر نے بیگم کو اطلاع کی۔ بیگم نے اپنوں اور میکے والوں کو خبر بھیجی۔ جس کو اطلاع نہ کرو وہ شکایت کرتا ہے۔ "اے اللہ کی شان، ہم ایسے غیر ہو گئے؟ اے بی ہم کسی شمار و قطار ہی میں نہ تھے؟ توج، ایسے بھی کیا خون سفید ہو گئے؟" غرض دھڑا دھڑ ڈولیاں اُترنے لگیں۔ گھر مہمانوں سے بھر گیا۔ ایک آتا ہے مہر دلہن کو جھانک جاتا ہے، دوسرا آتا ہے جھانک جاتا ہے۔ ان کا تو تماشہ ہو گیا۔ اس غریب کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اماں سرہانے بیٹھے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ انہوں نے مشکل کشا کا دونا مانا۔ مہر دلہن کی بڑی بہن صحن میں کھڑی گود پھیلائے دعا مانگ رہی تھیں۔ دائی جھیلی دلوا رہی ہے۔ کہتی ہے "ٹھنڈے درد ہیں۔" لو صاحب گرم درد بھی لگ گئے۔ مہر دلہن چاہتی ہے کہ مچھلی کی طرح تڑپے مگر شرم کے مارے کروٹ تک نہیں بدلتی کہ کل کو یہی سب لوگ ہنسی اڑائیں گے۔ خدا خدا کر کے مشکل آسان ہوئی۔ دائی نے دیکھا کہ ایک چاند سا بیٹا پیدا ہوا ہے، مگر زچہ سے

کہا'' کا تنری بنی ہوئی ہے۔'' یہ بھی ایک ٹوٹکا ہے۔ کسی نے اس بات کا یقین نہیں کیا۔ اور مہر دلہن کو اپنی ہی ہوش نہیں تھا۔ بیگم نے کہا'' سچ بتا؟'' سندر نے کہا'' بیگم، میں سونے کے کڑے انعام میں لوں گی۔ بڑی دعاؤں اور مرادوں کے بعد یہ دن اللہ نے دکھایا۔''

بیگم نے کہا سندر تو اطمینان رکھ۔ تیرا حق تجھ کو دوں گی۔ اللہ نے میری بچی کو ساتھ خیر کے فارغ کیا۔ ست ہی ست پر میرا دم تھا۔''

دائی نے کہا'' بیگم مبارک ہو، اللہ نے چاند سا پوتا دیا''

بیگم:'' اے تیرے منہ میں گھی شکر''

مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔ بی مغلانی دوڑی ہوئی مردانے میں گئیں۔'' سرکار کو پوتا مبارک ہو۔''

سرکار بیٹھے بیٹھے ہول رہے تھے۔ اتنے میں ہی مغلانی نے آن کر یہ مژدہ سنایا۔ انہوں نے منت مان رکھی تھی۔ اچھل پڑے اور جھٹ ایک اشرفی نکال کر مغلانی کو دی اور بولے'' نیک قدم تو نیک خبر بھی ہے۔''

مغلانی نے کہا'' اے حضور، دانت گھس گئے دعائیں مانگتے مانگتے۔ اللہ سلامت رکھے، بچہ بچہ کی خیر، بہو بیگم دودھوں نہائیں پوتوں پھلیں۔ میری سرکار کو نت نت خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔ اللہ ہزاری عمر کرے۔''

دعائیں دیتی بی مغلانی پھر زنانی ڈیوڑھی کی طرف شپڑ شپڑ کرتی بھاگ گئیں۔

یہاں نال کاٹنے کے بعد بچے کو سہتے سہتے پانی سے نہلا دھلا کر کپڑے پہنا نہالچے پر نانا بیگم کو دیا۔ انہوں نے پوتے کو چھاتی سے لگا کر سمدھن کو دیا وہ بھی نواسے کو دیکھ کر نہال نہال ہوئیں۔ سب نے باری باری سے بچے کو دیکھا اور دائی کے ٹھیکرے میں روپے پیسے ڈالے۔ دادا کو مردانے میں سے بلوایا گیا انہوں نے ان کے بچے کے دائیں کان میں اذان دی اور بائیں میں تکبیر کہی، پھر شہد چٹایا۔ تیسرے پہر کو گھٹی دی گئی اور دودھ دھلائی کی رسم ہوئی۔ زچہ کی بڑی نند نے چاندی کی کٹوری میں آٹے کا دودھ بنایا، اس میں ہری دوب ڈالی، اس سے دودھ اور لٹ دھلائی اور بسم اللہ کہہ کر بچے کو دودھ لگا دیا، ڈومنیوں نے گانا شروع کیا۔

میں تو ہو لر سن کر آئی

بیرن بھیا

میں تیری ماں جائی

باغوں میں جیسے آم پھلے رے

اب پھلے میرا بھائی

بیرن بھیا

میں تیری ماں جائی

ہو لُٹن کر بدھاوا لائی

جئے میری بھاوج، جئے میرا لالہ

نند ہیٹی نہیں آئی

تیرے لالہ کو ہنسلی رے کڑے

تجھ کو میوہ لائی

بیرن بھیا

میں تیری ماں جائی

ہو لُٹن کر بدھاوا لائی

چھاتی دُھلائی کٹوری لوں گی تو لٹ دُھلائی

روپیا

بیرن بھیا

میں تیری ماں جائی

ہو لُٹن کر بدھاوا لائی

پاؤں دھلن کو چیری لوں گی تو پیا چڑھن کو گھوڑا

بیرن بھیا

میں تیری ماں جائی

ہو لُٹن کر بدھاوا لائی

اچھوانی بنائی گئی، کوئی مزیدار چیز تو نہیں، منقّی اور عناب کا شیرہ نکال کر اس میں اجوائن کا عرق

ڈالا جاتا ہے اور کڑکڑاتے گھی میں ڈال کر اوپر سے کھانڈ کا شیرہ چھوڑ دیا جاتا ہے، اس کے پک جانے کے بعد سونٹھ ڈال دی جاتی ہے۔ زچہ نے دو ایک گھونٹ پئے باقی لڑکیاں بچیاں پی گئیں، اچھوانی، گوند سنورا، یہ سب چیزیں زچہ کو طاقت کے لئے کھلائی پلائی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں کچھ عجب رواج تھا، زچہ کو آرام دینے اور سونے دینے کے بدلے جگایا جاتا تھا اور خوب اُدھم مچایا جاتا تھا، ڈومنیاں بھی اسی لئے بلائی جاتی تھیں کہ خوب ہنگامہ رہے اور زچہ سونے نہ پائے۔

بی نضو لہک لہک کر سارے کنبے کو دعائیں دیتی رہیں اور ان پر بیل پڑتی رہی، اب انہوں نے ایک زچگیری ایسی شروع کی جس میں زچہ کی زبانی اس کے دلی جذبات پیش کئے گئے ہیں، زچہ کہتی ہے میری بہن کو بلواؤ تو بیٹے کا باپ، "ہوں ہوں" کہہ کر چپکا ہو جاتا ہے، پھر کہتی ہے کہ اپنی بہن کو بلواؤ تو کہتا ہے "ہاں ہاں"۔ "ہوں ہوں" اور "ہاں ہاں" کا نازک فرق غور طلب ہے۔

ہولر کا باپ یوں بولا، میرا بانکا جمعدار یوں بولا،
میرا بڑا سردار یوں بولا، میری اماں کو بلاؤ گے کیا نہیں؟
اری ہوں ہوں ری، یوں بولا، میرا بڑا سردار یوں بولا،
میری بہنوں کو بلاؤ گے کیا نہیں؟
اری ہوں ہوں ری، یوں بولا ہولر کا باپ یوں بولا
اپنی بہنوں کو بلاؤ گے کیا نہیں؟
اری ہاں ہاں ری یوں بولا، میرا بانکا جمعدار یوں بولا

ایک زچگیری میں زچہ کہتی ہے کہ میرے میکے اور سسرال کے عزیزوں کو بلاؤ تاکہ سب اپنا اپنا کام کر کے نچنت ہوں۔ ساس کو بلاؤ کہ پلنگ بچھائیں، میری نتاں کو بلاؤ وہ گھی کھچڑی لائیں گی، میرے لا کو بلاؤ وہ بھانڈ نچائیں گے۔ میری خسر کو بلاؤ، وہ نوبت رکھوائیں گے اور نیگ دیں گے، میری نند کو بلاؤ وہ دودھ دھلائیں گی میری بڑی بہن کو بلاؤ وہ بھانجے کے لئے کرتا ٹوپی لائیں گی، یہ سارے کام گویا بٹے ہوئے ہیں، ان کے علاوہ انہیں کوئی اور انجام نہیں دے سکتا۔

شاہ اکبر بیٹا جایا، پایل باجے جھنن جھنن
بلاؤ ری میری ساس بڑی کو
وہ آئیں پلنگ بچھائیں پایل باجے جھنن جھنن

بلا ؤری میری اماں بڑی کو
تمی کھچڑی لائیں، پایل باجے جھنن جھنن
بلاؤری میرے ابا بڑے کو
وہ آئیں بھانڈ نچائیں، پایل باجے جھنن جھنن
بلاؤری میرے خسر بڑے کو
وہ نوبت رکھائیں، نیگ چکائیں، پایل باجے جھنن جھنن
بلاؤری میری نند بڑی کو
وہ آئیں، چھتیاں ڈھلائیں پایل باجے جھنن جھنن

زچہ رانی بڑی ہوشیار ہیں جب سسرال کے عزیزوں کا نام آتا ہے تو سب کو بغیر نیگ دیے ٹالنا چاہتی ہیں اور یہ ٹالنے کا کام بھی اپنے راجہ ہی سے لینا چاہتی ہیں تاکہ بات پکڑی جائے تو راجہ جی ہی رودن میں آئیں، خود بھولی بن کر چھوٹ جانا چاہتی ہیں، مگر بھولی اتنی کہ سب کے نیگ اپنے زیوروں میں دلوانا چاہتی ہیں۔

میں راجہ بھولی، میرا گھر نہ لٹائے دیجیو
گھر نہ لٹا دیجیو سارا سنگوا دیجیو
ساس جو مانگے سونٹ گنوائی
راجہ اس کو بھی جواب دیجیو
ساس کا نیگ میرے ٹیکے میں ڈلوا دیجیو
میں راجہ بھولی، میرا گھر نہ لٹائے دیجیو
نند جو مانگے دودھ دھلائی
راجہ اس کو بھی جواب دیجیو
نند کا نیگ میرے جھمکوں میں ڈلوا دیجیو
میں راجہ بھولی، میرا گھر نہ لٹائے دیجیو
جٹھانی جو مانگے چھٹی نہلوائی
راجہ اس کو بھی جواب دیجیو

جٹھانی کا نیگ میری چمپا میں ڈلوا دیجیو
میں راجہ بھولی، میرا گھر نہ لٹائے دیجیو
دیور جو مانگے تارے دکھوائی
راجہ اس کو بھی جواب دیجیو
دیور کا نیگ میرے جوشن میں ڈلوا دیجیو
میں راجہ بھولی میرا گھر نہ لٹائے دیجیو
بھانڈ جو مانگیں ناچ نچوائی
راجہ ان کو بھی جواب دیجیو
بھنڈوں کا نیگ میری پایل میں ڈلوا دیجیو
میں راجہ بھولی، میرا گھر نہ لٹائے دیجیو

اس سے ملتی جلتی ایک اور زچگیری ہے جس میں سسرال والوں کی شامت بلائی ہے، زچہ رانی ایک ہوشیار! انہوں نے لِلا سیکھا ہے دوانہیں سیکھا۔ دینے کے نام پر تو یہ کنڈی بھی نہ دیں، خود الگ تھلگ رہتی ہیں۔ میاں سے سارے کام لیتی ہیں بُرا بنے گا تو وہ غریب بنے گا، میاں کو پٹی پڑھا دی ہے کہ جو بھی کچھ مانگے اسے دھکا دو۔

ہمارے پاس نہیں ہے کوڑی نہ گنڈا
ساس جو مانگے پلنگ بچھوائی
باہر سے میاں للکارے کہ دے دو انہیں دھکا
ہمارے پاس نہیں ہے کوڑی نہ گنڈا
نند جو مانگے دودھ دُھلائی
باہر سے میاں للکارے کہ دے دو انہیں دھکا
ہمارے پاس نہیں ہے کوڑی نہ گنڈا
دیور جو مانگے تارے گنوائی
باہر سے میاں للکارے کہ دیدو انہیں دھکا
ہمارے پاس نہیں ہے کوڑی نہ گنڈا

دائی جو مانگے اپنی بدھائی

باہر سے میاں للکارے کہ دے دو انہیں دھکا

ہمارے پاس نہیں ہے کوڑی نہ گنڈا

بیوی جو مانگے گوند کھاتے

باہر سے میاں للکارے کہ دیدو ہمیں بچا

ہمارے پاس نہیں ہے کوڑی نہ گنڈا

زچگی کے دوسرے ہی دن صبح سے ہجڑوں اور بھنڈوں کا تانتا لگ گیا، دراصل ہوتا یہ تھا کہ شہر میں ہیجڑے گھومتے پھرتے رہتے تھے اور محلوں کی مہترانیوں سے پوچھتے گچھتے رہتے تھے کہ کسی کے ہاں لڑکا تو نہیں ہوا؟ اگر ایک کو بھی معلوم ہو گیا کہ کسی کے ہاں لڑکا ہوا ہے تو ساری ٹولیوں کو اطلاع ہو جاتی تھی، لو وہ ڈھولک پر تھاپ پڑی اور ایک ٹولی نے صدا لگائی

اللہ کی امان، زچہ بچہ کی خیر"

اور زچگیری گانی شروع کر دی۔

میرے للا کے گھونگر والے بال

اماں جیوے بادا جیوے اور جئے پردار

میرے للا کے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ہنسلی چوموں، کٹھلا چوموں اور چوموں گلے ہار

میرے للا کے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کرتا چوموں، ٹوپی چوموں اور چوموں گورے گال

میرے للا کے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دوسری ٹولی آئی اور اس نے ایک ہنسانے والی زچگیری شروع کی

تو رہیو میری چچا پلنگ سے ہوشیار

ذرا سی اچھوانی دادی مانگے

میں چھچھ پرے پھینکوں

پتیلی پرے پھینکوں

بڑی ہی ہوشیار

ذرا سی اچھوتی نندیا مانگے

میں چھجے پرسے پھینکوں

چھَلی پر سے پھینکوں

بڑی ہی ہوشیار

تو رہیو میری چچا پلنگ سے ہوشیار

ذرا سی اچھوتی دیورانی مانگے

میں چھجے پر سے پھینکوں

چھَلی پر سے پھینکوں

بڑی ہی ہوشیار

تو رہیو میری چچا پلنگ سے ہوشیار

یہ کلن بھانڈ ہے گاتا بھی ہے ناچتا بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ نقلیں بھی اُتارتا رہتا ہے دیکھنے والے خوب ہنستے ہیں اور نیل دیتے ہیں، اس کا گیتا بیچ بیچ میں بچے کے رونے کی آواز نکالتا جاتا ہے اور دادی کی نیل نانی کی نیل غرض سارے رشتہ داروں کی نیل مانگتا جاتا ہے ور خوب پیسے سمیٹ کر لے جاتا ہے ویسے پچاس ساٹھ سال پہلے ٹکا یا آنہ ہر ٹولی کا نیگ ہوتا تھا، پھر پانچ آنے فی ٹولی ہو گیا تھا نیل میں جو کچھ مل جائے وہ ٹولی کی قسمت، ان غریبوں کا اور کوئی سہارا بھی تو نہیں تھا، اس لئے عورتیں انہیں خوب نیل دیا کرتی تھیں۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ ہوتے تو یہ مرد تھے مگر ان کا جاس اور ان کی گفتگو عورتوں جیسی ہوتی تھی اور بغیر تالیاں بجائے یہ کوئی بات نہ کرتے تھے دلی کی عورتیں رنڈیوں کو دیکھ کر جس قدر جلتی تھیں اُسی قدر ہیجڑوں کو دیکھ کر خوش ہوتی تھیں، رنڈیوں سے عورتوں کی تذلیل ہوتی تھی اور ہیجڑوں سے مردوں کی مگر یہ انوکھی مخلوق تھی بہت قابل رحم بیچے ہیجڑوں کی بھی ایک ٹولی آن پہونچی پھٹے بانس کی سی آوازیں، چار پانچ جتنے بھی ہوں سبھی مل کر گاتے ہیں اور ڈھولک بھی خود ہی بجاتے ہیں۔ ایک نو عمر ہیجڑا چیش چیش ہے، یہ مٹکتا تھرکتا رہتا ہے، اس ٹولی نے بھی ایک ظریفانہ زچگیری اچھوتی ہی کی گانی شروع کی۔

اے چچا رانی کاہے کو روٹھی رہی

میں تیرا عطر کھلوناری
سونٹھ میں بھول گیا
میں اب لادوں گاری
کہو تو۔ چچا رانی دائی کو بلاؤں
کہو تو کونے پلنگ بچھاؤں
کہو تو تھئی تھئی ناچوں
سونٹھ میں بھول گیا.........
میں اب لادوں گاری
اے، چچا رانی کاہے کو روٹھی ری
میں تیرا عطر کھلوناری
سونٹھ میں بھول گیا.........
ہاتھ میں کونڈی
بغل میں سونٹھ لایاری
سونٹھ میں بھول گیا.........
تیرے ہولر کا نوکر
تیرا چاکر ری
سونٹھ میں بھول گیا.........
میں اب لادوں گاری
اے، چچا رانی کاہے کو روٹھی ری
میں تیرا عطر کھلوناری

چھٹے دن زچہ کو چھٹی نہلائی گئی نندوں نے آٹے کے دودھ سے جس میں اتنی سی پان کی کرچ پڑی ہوئی تھی سر دھلوایا اور نیگ لیا، زچہ نہا دھو نتھ پہن، بچے کو گود میں لے چھپر کھٹ میں جا براجیں، تیسرے پہر میکے سے چھٹی آئی شام ہوتے ہوتے زچہ کو چوتھی کا جوڑا پہنایا سارے گہنے پہنائے سات قسم کی ترکاریاں، ناریل اور کھیل تباشوں سے نند بھاوجوں نے زچہ کی گود بھری، ڈومنیوں اور

چوتے والیوں نے زچگیریاں گائیں۔

اس ہریالے نے جنم لیا
میں تو پالنا بناؤں گی رے
اگر چندن کا میں پالنا بناؤں
ریشم ڈور جھلاؤں گی رے
اس باوا پیارے نے جنم لیا
میں تو پالنا بناؤں گی رے
سونے روپے کی بابل گھچڑی لائیو
سگھر بچی کو میں تارے دکھ دنگی رے
اس ہریالے نے جنم لیا
میں تو پالنا بناؤ گی رے

زچہ کے سر سے جھمجھاتا ہوا سہرا کساوا بندھا ہے، گود میں بچہ نہا لچے پر لیٹا ہے اس کے سر سے قصبہ بندھا ہوا ہے۔

نورنگ چوڑے والی مری بچّا رانیاں
سوہا جوڑا پہن سہاگن سوتی بھری مانگ
نورنگ چوڑے والیاں۔۔۔۔۔۔

جب رات کی سیاہی پھیل جاتی ہے تو چھٹی ہی کی رات کو صحن میں ایک چوکی بچھادی جاتی ہے، اور بنی سنوری زچہ کو گود میں لے کر بیویوں کے سہارے صحن میں آکر ایک چوکی پر کھڑی ہو جاتی ہے، زچہ کے سر پر ایک بیوی قرآن شریف پکڑے اور دو بیویاں ننگی تلواریں جوڑے رہتی ہیں، دائی آنے کی چونک لئے آگے آگے چلتی ہے زچہ کو آسمان پر سات تارے گنوائے جاتے ہیں اور کھیلوں بتاشوں کی نچھاور ہوتی ہے، اس سے فارغ ہو کر البیلی زچہ کو پھر چھپر کھٹ میں لا کر بٹھا دیا جاتا ہے۔ ڈومنیاں گاتی ہیں۔

زچہ تیری گود جھنڈولا سجا
تارے دیکھن چلیں البیلی زچا

اسی کے ساتھ ستھال کھلائی کی رسم بھی ہوتی ہے ستھال میں باریک چاولوں کا خشکہ ہوتا ہے جس پر گھی، شکر اور میوہ پڑا ہوتا ہے، اس کے ساتھ چار چراغ گھی کے ہوتے ہیں جن کے بیچ میں ایک طرّہ لگا ہوتا ہے، زچہ چاولوں کا ایک نوالہ لیتی ہے، اس کے بعد سہاگنیں کھاتی ہیں۔

بعض خاندانوں میں چوبہ چکھنے کی رسم ہوتی ہے جب زچہ تارے دیکھ کر چھپر کھٹ میں آ بیٹھتی ہے تو چھپر کھٹ سے ملواں ایک چوکی بچھادی جاتی ہے اور اس پر دسترخوان بچھا کر پکی ہوئی سات ترکاریاں اور چند اور کھانے چُن دیے جاتے ہیں، یہ تورہ کہلاتا ہے، سات سہاگنوں کے ساتھ مل کر زچہ رانی سب میں سے ذرا ذرا سا چکھ لیتی ہیں۔

مرگ مارنے اور بکیر بچّہ کی رسمیں لال قلعہ میں ہوتی تھیں، شہر میں ان کا رواج نہیں تھا۔

چلّہ پورا ہونے پر خوشی منائی جاتی، زچہ بچے کو لے کر پاؤں پھیرنے میکے گئیں سوا من ستورا ساتھ گیا۔ جب سسرال واپس گئیں تو ستورے کے خالی خوانوں میں پھل، ترکاریاں، مٹھائی اور کھلیں بتاشے ساتھ لائیں، کنبے بھر میں انہیں بانٹا گیا، سب کو خبر ہوگئی کہ مہر دلہن اصل خیر سے چلّہ نہالیں۔

اب ذرا یہ بھی دیکھیے کہ جب زچہ رانی اور ان کے راجہ جی کا آمنا سامنا ہوتا ہے تو کس قدر چندرا چندرا کر باتیں ہوتی ہیں، راجہ جی تو اتنے بھولے ہیں کہ جیسے کچھ جانتے ہی نہیں، زچہ رانی بھی انہیں باتوں میں اُڑاتی ہیں، مگر آخر میں بھید کھل ہی جاتا ہے تب کہیں جا کر بھولے راجہ کی سمجھ میں معاملہ آتا ہے۔

آیا ری میرا بھولا سا راجہ
آیا ری چھلبلیا سا راجہ
بیوی جی کوٹھے کاہے کو چڑھی تھیں
اے راجہ، میں نے چاند دیکھا تھا
آیا ری میرا ---------
بیوی جی پردے کاہے کو پڑے تھے
اے راجہ میری آنکھیں دُکھی تھیں
آیا ری میرا ---------
بیوی جی دائی کاہے کو آئی تھی
اے راجہ، میری ناف گئی تھی

آیا ری میرا ---------

بیوی جی کچھڑ کا ہے کو ہوئی تھی

اے راجہ، میرا گھڑا ٹوٹا تھا

آیا ری میرا --------

بیوی جی بچہ کس کا رویا تھا

اے راجہ، تری بیل بڑی تھی

آیا ری میرا --------

بیوی جی جھلبل کا ہے کو آئے تھے

اے راجہ، میں تو تم سے ڈری تھی

آیا ری میرا ----------

اب رسمیں ہیں نہ گانے کسی کو یاد ہیں۔ بچے ہسپتالوں میں ہوتے ہیں اور ڈومنیاں اور ہیجڑے فلمی گیت گاتے ہیں کہاں کا نیگ اور کیسا نیگ انہیں دھتکار دیا جاتا ہے، یا ڈانٹ کر بھگا دیا جاتا ہے۔ ان رسموں سے سینکڑوں کے پیٹ چلتے تھے دلی کی وہ اُجلی تہذیب اب کہاں؟---

OOO

روزہ کشائی

پچاس برس ادہر کا ذکر ہے نواب سلطان مرزا شہر کے رواداروں لوگوں میں شمار ہوتے تھے ان کی محلسرا فصیلوں میں کھڑی آسمان سے باتیں کرتی تھی۔ گاؤں گراؤں ان کے پرکھوں سے چلے آتے تھے، روپے کی لہر بہر تھی ان کے باپ دادا کے زمانہ میں اسی محلسرا کی ڈیوڑھی پر ہاتھی جھولتے تھے۔ شاہی کے ختم ہونے کے بعد وہ کروفر تو نہیں رہا، مگر اب بھی باہر دربان، کہار، مردھے اور اندر مغلانیاں، مامائیں، اصیلیں اور پیش خدمتیں موجود تھیں، خود نواب سلطان مرزا بڑے کلے ٹھلے کے اور جامہ زیب آدمی تھے، چالیس کے لگ بھگ عمر، میدہ وشہاب رنگ، آفتابی چہرہ، سر پر پٹھے، کشادہ پیشانی بڑی بڑی لچوئی آنکھیں، ستواں ناک، موزوں دہن، گول کٹر بڑی داڑھی، کسرتی بدن، اونچی چولی کا انگرکھا زیب تن، چست پاجامہ، نصف ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئیں، پاؤں میں انگوری بیل کی سلیم شاہی، جھوم کر چلتے تھے۔ اخلاق کے اچھے اور مذہب کے پکے تھے نماز پابندی سے پڑھتے اور روزے پورے اہتمام کے ساتھ رکھتے تھے۔ ان کی بیگم بڑی وضعدار اور خوش سلیقہ مشہور تھیں، بچے دو تھے ایک لڑکا سلمان مرزا اور ایک لڑکی زینب خانم۔ لڑکے کی عمر آٹھ سال کی اور لڑکی کی پانچ سال تھی۔

یہ ذکر ماہ رمضان المبارک کا ہے، افطار اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد صحن چمن میں بچھے ہوئے تخت پر نواب سلطان مرزا گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے ہیں۔ حقے کی منہنال منہ میں لگی ہے۔ خمیرے کی لپٹیں آ رہی ہیں۔ برابر میں گاؤ تکیے سے لگی بیگم بیٹھی ہیں آگے پٹاری دھری ہے، کٹنے میں چھالیا کاٹتی جاتی ہیں اور باتیں کرتی جاتی ہیں۔

بیگم: اے دیکھنا سلمان کے ابا خیر سے بچہ آٹھواں بھر کے نویں میں پڑ گیا اب کے تو اس کا روزہ رکھوا ہی دو۔

سلطان مرزا: بیگم میں نے کب منع کیا ہے؟ سلمان میاں کا روزہ تو میں نے تیورس کے سال ہی رکھوا دینے کو کہا تھا۔

بیگم: اے اس وقت میرے بچے کی عمر ہی کیا تھی! ننھی سی جان اس پر پہاڑ سا روزہ! تمہیں یاد نہیں اُس سال کس غضب کی گرمی پڑی تھی، جھمن آپا کو لاکھ سمجھایا کہ بی بچی کی عمر میں ابھی بہت گنجائش ہے، ایسی کیا جلدی پڑی ہے کہ پچھلے سال ہی میں لگیں روزہ رکھوانے۔ 'چیخ کر بولیں اے بی روزہ فرض ہے، نیک کام میں دیر کاہے کی؟ آتی جاتی دنیا ہے اگلے سال کون جئے کون مرے بہتیرا ان سے کہا بی، اللہ تمہارے دم کو رکھے آج سے کل دور نہیں ہے سال گزرتے کتنی دیر لگتی ہے، بچی کی جان کا بھی تو خیال کرو مگر وہ کب کسی کی سنتی ہیں۔

سلطان مرزا: جھمن آپا کے تو دل میں بس کوئی بات آجائے پھر ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے وہ اپنی من مانی کر کے رہیں گی، بُرا کیا انہوں نے۔

بیگم: اے بُرا سا بُرا کیا؟ بچی کی جان گئی، ساری عمر کے لئے کلیجے پہ داغ لگا سو الگ، دنیا نے تُھڑی تُھڑی کی سو جدا، تیسرے پہر دلہن بنانے کے لئے بچی کی جو تلاش ہوئی تو بچی غائب! ادھر دیکھا اُدھر دیکھا کہیں نہیں! محلّے میں دکھوایا بچی ندارد سارے میں ڈھنڈیا مچ گئی یا اللہ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟ بارے بی مغلانی کہیں آبدار خانے میں جا نکلیں، وہاں دیکھا کہ گھڑونچی سے چپٹی بیٹھی ہے پُچکار پُچکار کر اسے گود میں اٹھایا تو وہاں کیا رکھا تھا؟ بی مغلانی کی، ایک چیخ زمین پر اور ایک آسمان پر تھی۔ گھر والوں نے کہا لو بھئی یہ اور غضب ٹوٹا بی مغلانی پر کیا بِپتا پڑی؟ جب یہ ماجرا دیکھا تو کہرام مچ گیا شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا۔

سلطان مرزا: ہاں بیگم ہمارے کنبے میں وہ تو بہت ہی ناگوار واقعہ ہوا۔ فرض کے یہ معنی تھوڑی ہیں کہ یوں جان پر بن جائے اور مرنے والی پر تو روزہ فرض بھی نہیں تھا، اچھا چھوڑو اس قصے کو ہاں تو کیا کہہ رہی تھیں تم میاں سلمان کے بارے میں؟

بیگم: اے ہاں اس کی جان سے دور، اللہ خیر رکھے تو اب کے پیر کو سلمان میاں کا روزہ رکھوادو، منجھلا روزہ ہوگا پیر کو۔

سلطان مرزا: بس تو بسم اللہ کرو کل کسی وقت بیٹھ کر مہمانوں کی فہرست بنوا دو مردانے بلاوے الگ ہوں گے زنانے الگ، عبدالحکیم مردانی فہرست لے جائے گا اور بوا کریمن زنانی فہرست، بھائی جان

اور آپا جان کے ہاں ہمیں خود جانا ہوگا افطاری کا انتظام میاں اشتیاق کے سپرد کرو، کھانے کا اہتمام میں مرزا جی کو سونپے دیتا ہوں آپا جان سے کہنا کہ اتوار ہی کو آ جائیں گھر کے کام دھام میں وہ تمہارا ہاتھ بٹا لیں گی، کیوں ہے نا ٹھیک؟

بیگم: ہاں یوں کام بٹ جائیں تو سب کام سدھ ہو جائیں گے۔

پوری محلسرا میں سفیدی کرائی گئی کونا کونا جھڑا گیا، دالانوں اور صحنچیوں میں دری چاندنی کا فرش بچھایا گیا، کورے کورے ہنڈے اور آب خورے منگوائے گئے۔ کل پیر کو سلمان میاں کا روزہ ہوگا۔ آج اتوار کی سہ پہر کو آپا جان اور ان کے تین بچے آگئے۔ یہ بچے سیانے ہیں اور ان کے روزے رکھوائے جا چکے ہیں۔ روزے میں ان سے میاں سلمان کو ڈھارس رہے گی اور ان سے جی بھی بہلا رہے گا، آپا جان کے آتے ہی گھر میں خاصی چہل پہل ہو گئی، بچوں کے قہقہے محلسرا میں گونجنے لگے سلطان مرزا باہر کے کاموں سے فارغ ہو کر گھر میں آئے ہیں۔ سامنے دالان میں بڑی بہن بیٹھی دکھائی دیتی ہیں۔

سلطان مرزا: آپا جان آداب عرض کرتا ہوں۔

آپا جان: جگ جگ جیو، ہزاری عمر ہو، دلہن نے بتایا کہ خدا کے فضل سے کل کے لئے سارا سودا سلف آ چکا ہے، عمری باورچی اپنی دیگیں بھی رکھ گیا ہے اور حاجی نانبائی کا آدمی بھی تندور گاڑھ گیا ہے۔

سلطان مرزا: جی ہاں آپا جان، اوپر کا سارا کام ہو چکا ہے، کل بارہ بجے تک شیخ قصائی یہیں آ کر گوشت بنا جائے گا۔

آپا جان: اچھا تو میاں کیا کیا پکوا رہے ہو؟

سلطان مرزا: جی قورمہ، شیرمال اور زردہ بریانی۔

آپا جان: تو گویا دہرا کھانا ہوگا۔ بہت مناسب، اے دلہن، افطاری کا انتظام تو تم نے گھر ہی پر رکھا ہوگا؟

بیگم: جی ہاں آپا جان، کام بھی ہو جائے گا اور روزہ بھی بہل جائے گا۔

آپا جان: ہاں بھئی ہاں، یہ تو تم نے ٹھیک کیا، ایک پنتھ دو کاج۔

بیگم: اچھی آپا جان، آپ ہی بتایئے گا، فرحت میاں کے روزے میں آپ نے جو قیمہ بھری تھیاں

بنائی تھیں، سچ جانئے آج تک زبان ان کا چٹخارہ لے رہی ہے۔

آپا جان تم اطمینان رکھو دلہن، اب کے بھی انشاءاللہ ایسی ہی بنیں گی، اور دیکھنا ہم کل کچھ شاہی دستر خوان کی چیزیں بھی بنائیں گے۔ اللہ بخشے نانی اماں سے میں نے سیکھی تھیں، بادشاہ بیگم ان پر دموں دیوانی تھیں۔ ہمیشہ اپنے ساتھ انہیں رکھتی تھیں، ایسی مزے مزے کی چیزیں پکایا کرتی تھیں کہ کیا بتاؤں، بیوی اب تو لوگ ان کے نام بھی نہیں جانتے۔ من و سلویٰ، یاقوتی، نمش، ہمنی اور خدا بھلا کرے تمہارا۔ حسینی کباب، راحت جان، بادشاہ پسند دال، کون جانتا ہے موا ان کھانوں کو اب؟

سلطان مرزا: سچ ہے آپا جان، لال قلعہ کے ساتھ یہ سب باتیں بھی رخصت ہوئیں، آپا جان، وہ آپ نے ایک دن پلاؤ کی قسمیں بتائی تھیں نا؟ بیگم ذرا سننا، ہاں آپا جان۔

آپا جان: اے مجھے تو اب وہ نام بھی ٹھیک سے یاد نہیں رہے، چند یاد رہ گئے ہیں۔ سنو!

یخنی پلاؤ، موتی پلاؤ، نکتی پلاؤ، قبولی پلاؤ، آبی پلاؤ، سنہری پلاؤ، روپہلی پلاؤ، بیضہ پلاؤ، انناس پلاؤ، کوفتہ پلاؤ، بریانی پلاؤ، سارے بکرے کا پلاؤ، بونٹ پلاؤ، مٹر پلاؤ، کشمش پلاؤ، نرگسی پلاؤ، زمردی پلاؤ، لال پلاؤ، مزعفر پلاؤ، مرغ پلاؤ، مونگ پلاؤ، چلاؤ اور اللہ تمہارا بھلا کرے۔ اور یاد نہیں رہے۔

بیگم: آپا جان، ہمیں تو ان کے ناموں ہی میں مزہ آگیا۔ سبحان اللہ۔

سلطان مرزا: دراصل وہ ایک پوری تہذیب تھی جو صدیوں میں جا کر بنی تھی اور آن کی آن میں لال قلعہ کے ساتھ ختم ہوگئی۔ اچھا اب افطار کا وقت قریب ہے، چھڑکاؤ کا بھپکا نکل چکا ہے۔ صحن چبوترے ہی پر افطار کا سامان چنوا دو۔

تھوڑی دیر کے بعد دھونسا بجنا شروع ہوا، روزہ داروں نے کھجور سے روزہ کھولا، پڑوس کی مسجد میں اذان کی آواز آئی، شربت کا ایک کٹورا پی، کلی کر، نماز پڑھنے کھڑے ہوگئے، نماز کے بعد سب نے خوب سیر ہو کر افطاری کی اور کھانا کھایا۔

بچوں کو آج افطاری کے بعد کھانا کھلایا گیا، ان سے کہا گیا ہے کہ آج خوب ڈٹ کر سحری کھانا، عشاء کی نماز کے بعد انہیں سلا دیا گیا، نواب سلطان مرزا عشاء کی نماز کے بعد تراویح پڑھنے جامع مسجد چلے گئے، یہاں کچھ اور ہی بہار ہے، چپے چپے پر حافظ کھڑے قرآن شریف سنا رہے ہیں۔ کوئی سوا پارہ روزانہ پڑھتا ہے، کوئی ڈیڑھ، ایک صاحب پانچ پارے روز پڑھتے ہیں مگر ایک ایک لفظ صاف اور واضح ہوتا ہے، یہ اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے "حافظ ریل" کہلاتے ہیں، ان کے پیچھے مقتدی زیادہ

ہوتے ہیں، کیوں کہ ہر چھٹے دن قرآن شریف ختم ہو جاتا ہے، دس سوا دس بجے تک تراویح سے فارغ ہو کر نمازی گھروں کو لوٹتے ہیں، حلوائی کے ہاں سے مٹھائیاں، سیوئیاں، پھینیاں، کھجلے، قتلے، پھیکی میٹھی جلیبیاں ساتھ لے جاتے ہیں کہ رات کو سحری کے کام آئیں۔

نواب سلطان مرزا تراویحوں سے فارغ ہو کر گھر پہنچے تو بچے سو چکے تھے، آپا جان اور بیگم صحن میں اپنے اپنے پلنگ پر لیٹی باتیں کر رہی تھیں۔ بھائی صاحب کو آتے دیکھ کر آپا جان نے کہا:

آپا جان: لو بھئی مہمانوں کی دیکھ بھال دلہن کریں گی، اور گھر کے سارے کاموں کی نگرانی میرے ذمے ہوگی، تم باہر مردانے کا دھیان رکھنا، تمہارے بھائی صاحب تمہارا ہاتھ بٹانے کو موجود رہیں گے۔ لو اب تم نچنت ہو کر سو رہو۔

ڈیڑھ پہر رات باقی رہے مسجد میں پہلا ڈنکا سحری کا شروع ہوا۔ جگانے والوں کی ایک ٹولی ع

انٹھو روزہ دارو، سحر ہو رہی ہے

گاتی ہوئی گزری کوئی جگا کوئی نہیں جگا، ان کے بعد محلے کا چوکیدار ایک سرے سے ہر گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہوا چلا اور جب تک گھر میں سے "اچھا" کی صدا نہ آگئی برابر دروازہ پیٹتا رہتا، یوں اس نیک بخت نے پورے محلے کو جگا کر چھوڑا۔ نواب سلطان مرزا کے ہاں بھی جاگ ہو گئی، بچوں کو جگایا گیا، اتنے میں وہ منہ ہاتھ دھوئیں، سلطان مرزا، آپا جان اور بیگم نے وضو کر کے تہجد کی نماز ادا کی، ادھر بی مغلانی نے چولہے پر توا چڑھا دیا اور چھپا جھپ روٹیاں اُتارنی شروع کر دیں۔ ایک پیش خدمت نے لپک کر دستر خوان بچھا دیا، دوسری چلپچی اور آفتابہ لے کر ہاتھ دھلانے کھڑی ہو گئیں، کریمن بوا نے دستر خوان پر رکابیاں لگا دیں اور ڈونگوں میں دو قسم کے سالن اور قعبوں میں طاہری لا کر رکھ دی۔ شامی کباب، اچار، مربے، چٹنیاں، گاجر کا لچھا، شکر قند کی کھیر، پھینیاں کھجلے دودھ میں بھیگے ہوئے، "اے بی مغلانی، وہ قیمہ تو لاؤ جو میں نے چھوٹی پتیلی میں پکایا تھا۔"

بی مغلانی نے چھوٹی پتیلی چولہے سے اُتار کر لا دی، بولیں "میں نے اسے گرم کرنے رکھ دیا تھا۔"

آپا جان: لو بھئی اسے بھی چکھو۔

سلطان مرزا: آپا جان، یہ تو بڑا مزیدار ہے، کیا ڈالا ہے آپ نے قیمے میں؟

آپا جان: تم بتاؤ، تمہارا قیاس کیا کہتا ہے؟

سلطان مرزا: نہیں صاحب، یہ تو ذائقہ ہی کچھ اور ہے۔

آپا جان: تم بتاؤ دلہن؟

بیگم. آپا جان یہ املی کے پھول تو ہیں نہیں اور نہ کچنال ہے، ضرور آپ نے کوئی نئی چیز پکائی ہے۔

آپا جان نہیں دلہن، نئی چیز نہیں ہے، پرانی چیز ہے، تم نے شام کو ڈھیر سارے موتیا کے پھول منگائے تھے نا؟

بیگم: مگر آپا جان، یہ موتیا کے پھول تو نہیں ہیں، البتہ خوشبو کچھ۔

آپا جان: نہیں پھول نہیں ہیں، پھولوں کے نیچے کی سبز سبز ڈنڈیاں ہیں، بادشاہ کو یہ موتیا کا قیمہ بہت مرغوب تھا، سب نے خوب ڈٹ کر کھایا، پھر ہاتھ دھو کر کلی کر الایچی کی گلوریاں کھائیں، سلطان مرزا کا حقہ تازہ کیا ہوا اور بھر رکھا تھا وہ اس سے شغل کرنے لگے، چار گھڑی رات باقی رہی ہوگی کہ روزہ بند کرنے کا دھونسا بجنا شروع ہوا، جامع مسجد پر پہلا گولہ چلا، ونا نا نا نا۔ اب کھانا پینا موقوف، سب نے گھونٹ دو گھونٹ پانی پیا۔ کلی کی اور روزے کی نیت کی۔ آپا جان نے بچوں کو پاس بلا کر کہا:

آپا جان: روزے کی نیت کرو۔ سلمان میاں کہو

نویت اللہ تعالیٰ بصوم رمضان

سلمان: نویت اللہ تعالیٰ بصوم رمضان

آپا جان: بس بیٹا۔ اب شام کو روزہ کھلنے تک تم کچھ مت کھانا پینا، اچھا! شام کو تمہیں اچھے اچھے کپڑے پہنائیں گے اچھے اچھے کھانے کھلائیں گے، روزہ رکھنے سے اللہ میاں بہت خوش ہوتے ہیں، کیوں میاں تم نے پچھلے سال جو قرآن شریف ختم کیا تھا تو پھر تم نے اسے دہرایا بھی؟

سلمان: جی ہاں پھوپھی جان۔ دو دفعہ دہرا چکا ہوں۔

آپا جان: ماشاء اللہ، پھر تو بیٹا تم خوب فر فر پڑھنے لگے ہو گے؟ اچھا بھئی آج تم ہمیں سناؤ، اب صبح کی نماز پڑھ کر ہی سونا، بڑے اچھے بیٹے ہو تم۔

اتنے میں روزہ بند کرنے کے لئے دوسرا اور تیسرا گولہ بھی چل گیا، وضو کر میاں سلمان پھوپھی کے آگے قرآن شریف لے بیٹھے، آدھے پارے سے کچھ زیادہ پڑھا ہوگا کہ فجر کی اذان ہونے لگیں، سب نے نماز پڑھی اور درود شریف پڑھتے ہوئے لیٹ کر سو گئے۔

☆

دن چڑھے سب اٹھے۔ آج بہت کام ہے۔ پانسو مہمانوں کا انتظام کرنا ہے۔ کسی کو کسی قسم کی شکایت نہ ہونے پائے، محلسرا آج ایسی سجی ہے کہ دلہن بن گئی ہے، جوں جوں دن چڑھتا جاتا ہے گرمی بڑھتی جاتی ہے۔ لو آج گیارہ بجے سے ہی چلنے لگی، بچوں کو تہ خانے میں بھو نچادیا گیا ہے۔ آہاہاہا! یہاں تو خوب ٹھنڈک ہے۔ تیسرے پہر یہاں سے باہر نکلیں گے، دالانوں اور صحنچیوں میں خس کی ٹٹیاں لگ گئیں، ان پر پانی چھڑکا جارہا ہے، اندر چھت کا پنکھا جھلا جارہا ہے، باہر ٹھار دھوپ پڑ رہی ہے مگر اندر گرمی کا گزر نہیں۔ ظہر کے بعد مہمانوں کی آمد شروع ہوئی۔ بیگم صاحب انہیں ڈیوڑھی سے دالانوں اور صحنچیوں میں پہنچارہی ہیں، اُستنی جی مونڈھا بچھائے بیٹھی ہیں، ایک لمبی سے تھیلی ریزگاری بھری ان کی گود میں رکھی ہوئی ہے۔ کہار آواز لگاتے ہیں "سواریاں اُترو الو" آنے والیاں ڈولیوں میں سے اُترتی جاتی ہیں اور اُستانی جی ان کا کرایہ ادا کرتی جاتی ہیں، شام تک مہمانوں کا یونہی تانتا بندھا رہا، نہ جانے کب کب کے بچھڑے یہاں مل رہے ہیں۔ بیگم ایک ایک سے گلے مل رہی ہیں۔ دبی زبان سے شکایتیں بھی ہو رہی ہیں، وہ گہما گہمی ہے اور کاگارول مچی ہوئی ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

ایک: اے بی، میں نے کہا برابر سے نکلی جارہی ہو اور پہچانتی تک نہیں، ایسی بھی کیا بے مروّتی؟

دوسری: اے ہے، میری یاد پر تو پتھر پڑ گئی، اچھی بوا تم ہی بتادو تم کون ہو؟

پہلی: لو بوا اور سنو! اے میں ہوں سید زمانی۔ کیا سٹھیا گئی ہو؟

دوسری: اے نہیں، معاف کرنا، میں نے تمہیں بالکل نہیں پہچانا۔ اے بیوی، تم بھی بالکل بدل گئیں۔ بال تمہارے سارے سفید ہوگئے، دانت تمہارے ٹوٹ گئے! میں بھلا پہچانتی بھی کیسے؟

پہلی: بہن، بیس سال بھی تو ہو گئے، کوئی آج کی بات ہے؟ دکھ بیماریوں نے اس ہڈڑے کو پھو نچادیا۔

دوسری. لو بوا کل کی بات لگتی ہے کہ ہم دونوں چھوٹی اُستانی جی کے مکتب میں پڑھتے تھے۔ آ بہن، ذرا میرے گلے تو لگ جا۔

دونوں لپٹ گئیں۔ بچوں نے الگ ادھم مچا رکھا ہے، ایک بچہ سامنے سے کچھ کھاتا چلا آرہا ہے۔ اسے دیکھ کر ایک ٹولی شور مچارہی ہے۔

کئی بچے: روزے خور خدا کے چور
ہاتھ میں بیڑا منہ میں کیڑا

کئی اور بچے: روزے خوروں پہ کیا توائی ہے
ٹوٹی جوتی پھٹی رزائی ہے

اِدھر تو یہ شور مچ رہا ہے اُدھر عصر کے بعد آپا جان نے افطاری کی تیاری شروع کی، لڑکیاں بالیاں لپاک جھپاک کام کرتی پھر رہی ہیں، کوئی چنے کی دال دھو رہی ہے، کوئی بیسن گھول رہی ہے، انگیٹھیاں دہکائی جارہی ہیں، پتیلیاں ٹھنٹھنا رہی ہیں، تکن کا انتظام ہو رہا ہے۔ پالک، آلو کے قتلے، ہری مرچیں، بینگن کے قتلے پیاز کے لچھے بیسن میں متھے جارہے ہیں۔ کڑھائی میں تیل اونٹنے لگا تو اس میں سے ایک چٹکی ڈال دی، تیل کا تاؤ بجھ کر اس سے معلوم ہوگیا۔ کئی کڑھائیاں چڑھی ہوئی ہیں۔ پکوان جھپاجھپ اتر رہا ہے۔ دس بیس ای پر لگی ہوئی ہیں۔ آپا جان نے قمیں اور سموسے بنا کر دے دیئے ہیں، پانچ دس انہیں تلنے میں مصروف ہیں۔ ایک طرف ترکاری میوے چھیل بنا کر رکھے جارہے ہیں، قلمی آم تراشے جارہے ہیں۔ چوسنے کے آم برف بھرے ٹبوں میں لگا دیئے گئے ہیں۔ امرود، آڑو اور کیلے کاٹے جارہے ہیں، مونگ کی دال تلی جارہی ہے۔ چنے کی دال اُبالی جارہی ہے۔ لاکھوں رکابیوں میں تھوڑی تھوڑی سے ہر چیز رکھ کر حصے لگائے جارہے ہیں، انہیں سینیوں میں لگا کر محلے کی مسجد میں بھیجا جارہا ہے۔ چینی کی رکابیوں میں ہر چیز قرینے سے رکھ کر مردانے میں بھیجی جارہی ہے۔ انگور، انار، فالسے اور گڑھل کا شربت بنایا جارہا ہے۔ شربت میں تخم ریحاں ڈالی جارہی ہے۔ شام ہو چلی ہے، توڑ کا وقت ہے، دیلو! کسی کا روزہ اُچھلا، آپ ہی تو کام بگاڑا اور آپ ہی تیہا دکھا رہی ہیں۔

ایک: اے بی، کیوں اپنا روزہ بگاڑ رہی ہو؟

دوسری: چلو بی چلو، لمبی ہو، تم اپنے روزے کی خیر مناؤ، بڑی آئیں وہاں سے!

پہلی: اوئی بیوی، تم سے تو بات کرنی بھی غضب ہے، میں نے کچھ کہا بھی ہو؟ روزہ رکھو خدا کا اور ظلم توڑو بندوں پر!

دوسری: میں کہتی ہوں میرے منہ نہ لگنا، ہاں، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

پہلی: اے ناحق میرے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئی، لڑکی ہے کہ جھاڑ کا کانٹا؟

دوسری: بس بی بس، منہ سنبھال کے بات کرو، ابھی ساری شیخی رکر کری کردوں گی۔

تیسری: ارے بی، تم بھی کس سے الجھ رہی ہو۔ اس کے سر پر آج شیطان چڑھا ہے۔ چلو چلو، اسے اپنے تیہے میں آپ کھولنے دو۔

یہ انہیں کھینچ کر الگ لے گئیں۔

سلمان میاں کو نیا جوڑا پہنایا گیا۔ زربفت کی اچکن، سر پر سیلا، پھر پھول پہنائے گئے، انہیں دولہا بنایا گیا اور سب نے حسب توفیق انہیں روپے دیے اتنے میں گولا چھوٹنے کی آواز آئی اور دھونسا بجنے لگا، افطاری سب کے آگے پہونچ چکی تھی، کھجور سے روزہ کھول کر سب نے اپنی اپنی پسند کا شربت پیا۔ آپا جان نے سلمان میاں کو افطار کرنے کی دعا پڑھوائی۔

آپا جان: اللھم لك صمت وعلى رزقك افطرت

سلمان: اللھم لك صمت وعلى رزقك افطرت

اس کے بعد مکہ کی کھجور سے روزہ کھلوایا اور آب زمزم پلایا، پھر پیار کر کے بولیں۔

آپا جان: اب تم شوق سے کھاؤ پیو۔ مگر ڈگ ڈگا کر پانی یا شربت مت پینا، اس سے تونس ہو جاتی ہے۔

مغرب کی نماز کے بعد مردانے اور زنانے میں دستر خوان بچھا، مہمان کھانا کھاتے گئے اور رخصت ہوتے گئے۔ عشاء کے وقت تک سب چلے گئے مگر آپا جان اور ان کے بچوں کو نواب سلطان مرزا اور ان کی بیگم نے ایک دن کے لئے اور روک لیا کہ گھر کی رونق کچھ باقی رہ جائے۔

○○○

میٹھی عید

دلی والے رمضان شریف کی تیاریاں شب برات ہی سے شروع کر دیتے ہیں۔ رمضان کو واقع میں عبادت اور برکتوں کا مہینہ سمجھتے تھے۔ اس مہینے کے لیے بڑا اہتمام کرتے اور اس کا بڑا احترام کرتے، اچھے لوگ تو اچھے ہوتے ہیں بدکار اور بدمعاش بھی اس مہینے میں نیکوکار اور شریف بن جاتے۔ چتلی قبر کے ایک نامی دس نمبریے کو ہم نے دیکھا ہے کہ رمضان کا چاند دیکھتے ہی اپنی تمام بیہودہ حرکتوں سے تائب ہو جاتے۔ چاند دیکھتے ہی ان کی کایا پلٹ ہو جاتی، پورے روزے رکھتے، پنج وقتہ نماز پڑھتے، تراویحوں میں بھی پابندی سے شریک ہوتے، خیر خیرات اور حاجت مندوں کے ساتھ سلوک بھی کرتے حد یہ کہ رمضان رمضان ڈاڑھی بھی نہیں منڈواتے تھے۔

رمضان شریف کا احترام اس شدت سے کیا جاتا تھا کہ بازاروں میں کوئی کھانے پینے کی چیز تیسرے پہر سے پہلے نہیں ملتی تھی۔ کسی گھر سے دھواں اٹھتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ چھوٹے بچوں کو سحری ہی کا بچا کھچا چپ چپاتے کھلا دیا جاتا۔ پھیری والے بھی دوپہر کے بعد محلوں میں آنے شروع ہوتے تھے۔

جاڑوں کے روزے تو بقول دلی والوں کے مفت کے ہوتے ہیں۔ مزہ گرمیوں کے روزوں میں آتا تھا۔ مئی جون کی گرمی! الاماں والحفیظ۔ صبح چار بجے کے لگ بھگ روزہ بند کرنے کا دھونسا بج جاتا اور جامع مسجد کے سامنے گولے چل جاتے۔ روزہ رکھنے والے وضو کر کے تلاوت قرآن شریف میں مصروف ہو جاتے۔ کچھ دیر بعد ہی دلی کی بارہ سو مسجدوں سے اذانوں کی دلکش آوازیں بلند ہونے لگتیں۔ مرد محلوں کی مسجدوں میں نماز پڑھنے چلے جاتے۔ نور ظہور کا وقت، عجب سہانا سماں ہوتا۔ عبادت سے روح میں فرحت پیدا ہو جاتی۔ نماز کے بعد کوئی وظیفہ پڑھتا، کوئی اعتکاف کرتا، کوئی درود وسلام کرتا، مسجد سے آنے کے بعد مزدور اور کاریگر اپنے اپنے کام پر روانہ ہو جاتے یا اپنے اپنے ٹھیے

سنبھال لیتے۔ دس بجے کے بعد سے آگ برسنے لگتی۔ لہٰذا اوّل وقت ہی کام دھام سے فارغ ہو لیتے اور ظہر کے وقت اٹھ کھڑے ہوتے۔ مسجد میں نماز پڑھتے اور گھر چلے آتے۔

لو چلنی شروع ہو جاتی، زمین سے شعلے نکلتے، آسمان سے آگ برستی۔ بھلا ایسے میں کوئی کام ہو سکتا ہے؟ گھر آ کر حسب توفیق خس یا جوانسے کی ٹٹیاں اور پردے لگاتے۔ انہیں پانی سے تربتر کھڑی چار پائی پر بھی پانی چھڑکتے اور ٹھنڈے بان پر پڑ رہتے۔ ذرا کی ذرا آنکھ لگ جاتی۔ عصر کے وقت اٹھتے۔ نہاتے، گویا توے پر چھینٹا پڑ جاتا۔ جامع مسجد کا رخ کرتے۔ مسجد میں نماز پڑھتے اور روزہ بہلانے کے لئے چوک پر آ جاتے۔ توڑ کا وقت ہے، مگر یہاں ایسی گہما گہمی ہے کہ روزے کی بھوک پیاس کا خیال بھی نہیں آتا۔ جان پہچان کا کوئی نہ کوئی ضرور مل جاتا ہے۔ اس کے ساتھ تھوڑی دیر گھومے پھرے۔ روزہ کھلنے میں جب تھوڑی سی دیر رہ گئی تو لونگ چڑے، قلمی بڑے، تلن، دہی بڑے وغیرہ لے کر گھر کا رخ کیا۔ راستے میں سے برف بھی خریدی اور لدے پھندے گھر پہونچے۔ صحن میں چوکیوں پر دری چاندنی کا فرش، اس پر دسترخوان چنا ہوا پایا۔ شہیدی تربوز ہے، لکھنؤ کے خربوزے ہیں، ککڑیاں ہیں، ان پر برف کچل کر ڈالی۔ فالسے کا شربت شیشے کے جگ میں بھرا رکھا ہے۔ اس میں برف ڈالی۔ اور وضو کرنے چلے گئے۔ پیاس کے مارے برا حال تھا مگر کیا مجال کہ حرف شکایت زبان پر آ جائے۔ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے غسل خانے سے نکلے اور چوکیوں پر آ بیٹھے۔ بیوی بچے بھی دسترخوان پر آ گئے۔ اتنے میں گولا چلا۔ دنانانانا۔ سب نے کھجور سے روزہ کھولا اور شربت پیا۔ افطاری کھائی اور نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے۔ نماز کے بعد سب نے کھانا کھایا اور مزے مزے کی باتیں ہونے لگیں۔ کچھ دیر ستانے کے بعد تراویحوں کے لئے جامع مسجد جا پہونچے۔ بڑے امام جی نے عشا کی نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد حافظوں نے اپنی اپنی جماعتیں قائم کیں۔ جامع مسجد کے وسیع صحن کے چپے چپے میں جماعتیں کھڑی ہو گئیں۔ کوئی ڈیڑھ پارہ، کوئی دو اور کوئی تین پارے روز سناتا ہے۔ ایک صاحب حافظ ریل کہلاتے ہیں۔ یہ پانچ پارے روز سناتے ہیں ان کے پیچھے مقتدیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ عجب بہار آ رہی ہے۔ اللہ کے کلام سے مسجد گونج رہی ہے۔ وتر پڑھنے کے بعد یہ برکتوں والا منظر ختم ہوا۔

دنوں کے گزرنے میں دیر ہی کیا لگتی ہے۔ روزوں کے بارے میں کہاوت مشہور ہے کہ دس رواں، دس دواں، دس پڑاں، لیجو الوداع آ پہونچی۔ دلّی کے آس پاس کی آبادیوں سے لوگ سمٹ کر دلّی میں آ گئے۔ ان کی تعداد ہزاروں نہیں لاکھوں پر ہے۔ یہ بڑے بھولے دیہاتی ہیں جو جمعۃ الوداع

کو بھی عید کی طرح ایک بڑا تہوار سمجھتے ہیں۔ پوری جامع مسجد پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ مرد عورت، بچے، بوڑھے سب جامع مسجد میں ایسے بھرتے ہیں کہ تل دھرنے کو جگہ باقی نہیں رہتی۔ جو بچ رہتے ہیں وہ جامع مسجد کے گرد چھاؤنی چھاتے ہیں۔ وہ چیخ و پکار اور چل پوں ہوتی ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ مذہب سے انہیں واقفیت ہو یا نہ ہو مگر ہیں یہ لوگ بھی مسلمان۔ روزہ، نماز کا شاید انہوں نے نام ہی سنا ہے۔ الوداع کے دن حلیم شریف کھانا ثواب سمجھتے ہیں۔ بیسیوں حلیم بیچنے والے ہتھ گاڑیوں پر حلیم کی دیگیں رکھے ان کے وسیع مجمع میں گھومتے پھرتے ہیں۔ باہر والے ہیں کہ ان پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ دلی والے ان کی سادہ لوحی کے تماشے دیکھتے ہیں اور ہنستے ہیں۔ حلیم میں لال مرچوں اور ہری مرچوں کی بھرمار ہے۔ یہ حلیم کھاتے ہیں تو آنکھوں اور ناک سے پانی جاری ہو جاتا ہے۔ سقے اپنی مشکیں اٹھائے کٹورے بجاتے پھر رہے ہیں۔ پانی پلانے کا وار نہیں آتا۔ مرچوں کی آگ پانی سے بھی نہیں بجھتی ہے۔ لہٰذا دو آنے سیر کی تیل کی مٹھائی بھی خوب بک رہی ہے۔ دن بھر یہی کار ثواب جاری رہتا ہے۔ الوداع کی نماز دلی والے یا تو کنجیوں کی چھتوں پر اور برجیوں میں پڑھتے ہیں یا کسی مسجد کے باہر۔ نمازیوں کی صفیں یادگار اور شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کے مزار تک چلی جاتی ہیں۔ چلچلاتی دھوپ میں روزہ دار نہایت صبر و سکون سے بیٹھے رہتے ہیں۔ بزارے چھوٹتے رہتے ہیں اور گیلے کپڑے سروں پر ڈالے جاتے ہیں۔ آج کا روزہ سب روزوں سے سخت ہوتا ہے۔ مگر اللہ کے نیک بندے اس آزمائش میں پورے اُترتے ہیں۔

ایک کرخندار نے دوسرے کرخندار سے پوچھا "اماں یہ کیا بات ہے کہ الوداع جب آتی ہے جمعہ ہی کو آتی ہے؟" دوسرے نے کچھ دیر سوچ کر کہا "بھئی خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔"

لو صاحب رمضان شریف رخصت ہوئے۔ نماز کے بعد ایسے بھی بزرگ دیکھنے میں آتے ہیں جن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں، انہیں رمضان شریف کے رخصت ہونے کا واقعی اتنا صدمہ ہوتا ہے جیسے کوئی مہمان رخصت ہو رہا ہو۔ رمضان شریف کے ساتھ نیکیاں اور برکتیں بھی تو رخصت ہو رہی ہیں۔ ان سے محروم ہونے کا غم بھلا کیوں نہ ہو؟

چاند رات آگئی۔ انتیس روزے ہو چکے ہیں۔ اب یہ تذبذب ہے کہ دیکھئے انتیس کا چاند ہوتا ہے یا تیس کا۔ بچے کہتے ہیں کہ اگر آج چاند نہیں ہوا تو ہماری عید بوڑھی ہو جائے گی۔ مغرب میں آفتاب کا سنہرا تھال آنکھوں سے اوجھل ہو گیا، افق پر شہاب پھیلا۔ شام کا جھٹ پٹا بڑھا۔ سب کی آنکھیں آسمان کی

طرف لگی ہوئی ہیں۔ مطلع صاف ہے مگر لاجوردی آسمان پر جہاں گلاب کھل رہا ہے ایک چھوٹی سی سفید بدلی تیر رہی ہے۔ ہو نہ ہو چاند اسی کے پیچھے سے جھانکے گا۔ مگر بدلی کھسکنے کا نام نہیں لیتی۔ لو وہ روزہ بھی کھل گیا۔ شام کے سائے افق پر بڑھنے لگے، مگر چاند؟ چاند ابھی تک نظر نہیں آیا۔ وہ دیکھو، وہ بدلی کے ایک سرے پر روشنی کا ایک نقطہ سا کیا دکھائی دے رہا ہے؟ ہلال کا سرا معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر بدلی کے ہٹتے ہی نصف ہلال اور پھر پورا ہلال آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ چاروں طرف خوشی کا شور مچ گیا۔ "چاند ہو گیا، چاند ہو گیا" بچے مارے خوشی کے آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہیں۔ بڑوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اپنے رب کا شکریہ ادا کیا۔ فتحپوری پر دھونسا دوبارہ بجا، جامع مسجد پر گولے چھوٹے۔ سب کو خبر ہو گئی کہ چاند ہو گیا۔

بچوں کو استانیوں نے لال سبز عیدیاں تقسیم کیں۔ ان پر سنہرے حروف میں لکھا ہوا ہے۔

عیدی

زندگی کی بہار دیکھو تم
عیش لیل و نہار دیکھو تم
شب برات، عید ہو کہ بقرا عید
دائما صد ہزار دیکھو تم!

بپاس خاطر......

اس کی شاعری پر نہ جایئے۔ اس کی دعاؤں کو دیکھئے۔ بچے ان عیدیوں کو خوشی خوشی لئے پھر رہے ہیں۔ اور بچوں کے ماں باپ استانیوں کو تہواریاں بھجوا رہے ہیں۔

عید کی تیاریاں یوں تو رمضان شریف کے آغاز ہی سے شروع ہو جاتی ہیں لیکن عید سے دو چار دن پہلے اور خاص طور پر چاند رات کو تو وہ دھما چوکڑی مچتی ہے کہ الٰہی توبہ! مرد، عورتیں جسے دیکھئے عید کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ کسی بچے کی جوتی اب تک نہیں آئی ہے۔ کسی کو اپنی ٹوپی کی فکر ہے۔ لڑکیوں نے اپنے اپنے جوڑے پورے کرنے شروع کر دئے۔ کوئی اپنا کرتا کھڑا کر رہی ہے، کسی نے اپنے دوپٹے میں لچکا ٹانکنا شروع کر دیا۔ ایک نے جلدی سے لگنی میں مہندی گوندھنی شروع کر دی۔ دوسری لپکی کہ "اچھی ذرا سی مجھے بھی دینا، ماہی پشت کا جال بناؤں گی۔" گھر والی بیوی کو صبح کی فکر ہے کہ سویاں اور شیر خرمہ وقت پر تیار ملے۔ مردوں کے پیروں میں چکر بندھ گیا ہے۔ بازار کا کوڑی پھیرا

ہو رہا ہے۔ تیل پھلیل، مسی سرمہ، پھول پان، ابٹنا غازہ، ایک چیز سنگھار کی ہو تو بتائی جائے۔ جو چیز یاد آتی ہے فوراً منگائی جاتی ہے۔ ادھر درزی نے اب تک اچکن نہیں پہونچائی۔ جب جاؤ یہی کہہ دیتا ہے کہ "میاں آپ تکلف نہ فرمائیں۔ میں ابھی لے کر خود حاضر ہوتا ہوں۔" دم دلاسے دیئے جاتا ہے۔ بچوں نے الگ آفت ڈھا رکھی ہے۔ کوئی اپنی ٹوپی کے لئے سر پیٹ رہا ہے، کوئی جوتوں کے لئے ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔

لو وہ چوڑی والی بوا آپہونچی۔ ہزروں دعائیں دیتی چلی آرہی ہے "الٰہی دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔ سر کی بادشاہی بنی رہے۔ بچوں کے کار دیکھنے نصیب ہوں۔ بچوں کے نصیبے کھلیں۔ کولہے پر بڑا سا ٹوکرا ہے، اس میں چوڑیوں کے لچھے بھرے ہیں۔ گھر والی بیوی نے دیکھ تو چیخ کر بولیں۔

بیگم: اے بی اب بھی ناحق آئیں۔

چوڑی والی: اے بیگم، اللہ تمہیں سلامت رکھے، تہوار کا سرا ہے۔ ابھی تو سویرا ہی ہے۔

بیگم: لو بوا آدھی رات ہونے کو آئی، تمہیں سویرا ہی دکھائی دے رہا ہے؟ مجھے گھر کے اور کام دھندے بھی دیکھنے ہیں یا تمہاری ہی آس مناتی رہوں؟

چوڑی والی: اے بیگم، برس کے برس دن کیوں اپنا جی برا کرتی ہو، اللہ رکھے بہتیرے کام کرنے والے ہیں۔ ایک ذرا کی ذرا یہاں بیٹھ جاؤ۔ بس چٹکی بجاتے میں سر تھ خیر کے دونوں ہاتھ بھردوں گی۔ اللہ رکھے ماشاء اللہ پھر بچیاں رہ جائیں گی، ان سے میں نمٹتی رہوں گی۔ لو آؤ جھٹ پٹ، دیکھو تو کیسی سنہری بانکیں لائی ہوں میں اپنی بیگم کے لئے۔" بیگم کو چوڑی والی کی چاپلوسی پر ہنسی آگئی۔ تخت پر آبیٹھیں۔ ڈھیر ساری چوڑیاں پہنیں۔ برس کے وقتوں کی منہیاری ہے۔ سوام کر کے اٹھ گئیں۔ تہواری دی دعائیں لیں۔ پھر بچوں کی رول چول شروع ہوگئی۔

چوڑی والی کے جاتے ہی مالن آگئی۔ بڑی سی چنگیر میں لال لال قند بچھا ہوا ہے۔ اس پر چنبیلی اور موتیا کے ڈھیر پڑے ہنس رہے ہیں۔ چمپے کی گندیاں ہیں، مولسری کی لڑیاں ہیں۔ منہ بند کلیوں کی چمپا کلیاں ہیں، گجرے اور ہار ہیں۔ یہ نہیں جانے پاتی کہ کھلی والی آجاتی ہے۔ برس کے برس دن سبھی کو تہوری ملتی ہے۔ رات گئے تک گہما گہمی رہی۔ لو بھئی اب رات بہت آگئی۔ صبح سویرے اٹھنا ہے۔ خیر سے عید کا دوگانہ ادا کرنا ہے۔ اب سکھ کی نیند سو رہو۔

صبح کو جب مشرق سے سنہری کرنوں نے جھانکنا شروع کیا تو سب نہا دھو، نئے جوڑے بدل،

نمازِ فجر سے فارغ ہو چکے تھے۔ چاروں طرف خوشی کا ایک طوفان سا آیا ہوا ہے۔

سیویّوں اور شیر خرمے کا ناشتہ کر کے مردوں نے بچوں کو ساتھ لیا اور عیدگاہ کا رخ کیا۔ یکّوں میں، تانگوں میں اور موٹروں میں بھرے شہر کے چاروں کھونٹوں سے لوگ عیدگاہ کی طرف جا رہے ہیں۔ فطرے کے گیہوں اور پیسے لینے کے لئے نہ جانے کہاں سے اتنے سارے کنگلے ابل پڑے ہیں راستے کے دونوں طرف ان کی لنگتار ہے۔ سواریوں کے پیچھے خریاں بھاگ رہی ہیں۔ اور ہانپ ہانپ کر گا رہی ہیں۔

اللہ خیریں ہی خیریں رہیں گی

تیرے بٹوے میں پیسہ دھرا ہے

دے جا، اللہ کے نام پہ دے جا

اللہ تیرا بھلا کرے گا

بڑی لپچڑ ہیں، بغیر پیسہ دھیلا لئے یہ پیچھا نہیں چھوڑتیں۔

عیدگاہ پہونچے تو معلوم ہوا کہ عیدگاہ تو کبھی کی بھر چکی ہے۔ باہر بھی جہاں تک نظر جاتی ہے آدم ہی آدم نظر آتا ہے۔ اب کے الوداع جو عید کے قریب تھی تو باہر والے بھی رک گئے کہ عید کر کے ہی لوٹیں گے۔ یوں اور بھی خلقت جمع ہو گئی ہے، عیدگاہ کی دیواروں پر مکبّر کھڑے ہو کر رومال ہلانے لگے۔ مطلب ہے کہ صفیں سیدھی کر لو۔ کرخندار بھائی اپنے گود کے بچوں کو بھی لے آئے تھے۔ ایک کندھے پر، ایک گود میں ایک کی انگلی پکڑے ہوئے، ایک نے دامن پکڑ رکھا ہے۔ بچے بہت خوش ہیں۔ کندھے والے بچے کا مارے خوشی کے پیشاب نکل گیا تو "ہت تری کی" کہہ کر اسے کندھے پر سے اتارا۔ اس نے رونا شروع کر دیا تو اسے چمکار پچکار کے چُپکا کیا۔

جلدی سے رومال بچھا کر صف میں کھڑے ہو گئے اور بچوں کو آگے بٹھا لیا۔ مکبّروں نے تکبیریں کہنی شروع کر دیں، کسی نے نہیں سنیں۔ کنکھیوں سے ادھر اُدھر دیکھ کر ہاتھ باندھ لئے۔

مگر برابر والے نے ہاتھ چھوڑ رکھے تھے۔ اس لئے جھٹ ہاتھ چھوڑ دیے، وہاں قرأت شروع ہو چکی تھی اس لئے ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی دوسرے رکعت میں بھی یہی افراتفری رہی۔ کسی نے تکبیر سن کر ہاتھ چھوڑ دیے تو کوئی رکوع میں چلا گیا۔ کوئی رکوع میں ہے تو کوئی سجدے میں پہونچ گیا۔ غرض جب سلام پھرا تو دور کی صفیں سجدے ہی میں پڑی تھیں۔ بچوں نے نیت باندھنے کے بعد سے جو

دل لگا کر رونا شروع کیا تو سلام پھرنے تک ایک آواز سے روتے رہے۔ نمازیوں نے فقرے کسے:۔
"اماں سارے شہر کو اٹھا لائے، ان کی اماں کو بھی لے آتے نا۔" بیچارے کیا کہیں؟ خون کے سے گھونٹ پی کر خاموش ہو رہے۔ اور بغیر خطبہ سنے ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔

عید گاہ سے لوگ چلنا شروع ہوئے تو بچوں کے لئے تھڑی والوں سے کھلونے خریدے۔ بھلے مانسوں نے قبرستانوں کا رخ کیا۔ کوئی قدم شریف گیا کوئی کلو کے تکئے میں، کوئی خواجہ باقی باللہ میں اپنی ہڑ واڑ میں پہونچے۔ وہیں سے گلاب کے پھول اور اگربتیاں بھی خریدیں۔ اپنے پیاروں کی قبروں پر گئے۔ سقے کو آواز دی۔ قبروں پر مشکیں چھڑوائیں، پھول ڈالے، اگربتیاں جلائیں، فاتحہ پڑھی، بچوں کو بتایا کہ کس کس کی قبریں ہیں۔ قبرستان سے باہر نکل کر تانگہ کیا اور جامع مسجد جا پہونچے۔ مٹیا محل کے بازار سے مٹھائی اور کچوریاں لیں۔ پان خریدے اور گھر جا پہونچے۔

محلہ والوں سے عید ملے۔ رشتے کنبے کے جو لوگ آتے رہے ان سے بھی گلے ملتے رہے۔ دلوں کی کدورتیں دور ہوئیں۔ تن کے ساتھ من بھی اُجلے ہو گئے

بڑوں نے چھوٹوں کو عیدیاں دیں۔ کہاروں اور چماروں کے ہاتھ عزیزوں میں حصے بھیجے گئے، بھانڈوں اور ہیجڑوں کی ٹولیاں مبارک بادیاں گاتی آگئیں۔ انہیں بدھاوے دئے۔ کمینوں کو انعام دئے۔

دستر خوان بچھا۔ سب نے ساتھ بیٹھ کر کچوریاں، شامی کباب، سیخ کے کباب، مٹھائیاں اور سیویاں کھائیں۔ پھر رشتہ داروں اور دوستوں سے عید ملنے نکل گئے۔ گلے شکوے دور ہوئے، روٹھے ہوئے من گئے۔

اگلے دن تر کا میلہ ہوا۔ یہ میلہ دستکاروں اور کرخنداروں کا ہوتا تھا۔ دلی کے سیلانی جیوڑے بھی اس میں شریک ہو جاتے تھے۔ سبزی منڈی میں ایک بہت بڑا باغ تھا جس میں بے شمار پھل دار درخت تھے۔ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے ایک خواجہ سرا محل دار تھے۔ یہ باغ انہی کا تھا اور انہی کے نام پر اس کا نام محل دار خاں پڑ گیا تھا۔ آگے چل کر یہ باغ ایک ہندو رئیس کی ملکیت ہو گیا تھا۔ اسی میں تر منائی جاتی تھی۔

دلی کی آدھی آبادی اس میں سما جاتی تھی۔ عورتیں اس میلے میں نہیں جاتی تھیں۔ عید کے دوسرے دن صبح سویرے ہی سے مرد محل دار خاں میں جانے شروع ہو جاتے۔ سودا بیچنے والے یہاں

پہلے سے موجود ہوتے۔ کھانے پینے کی ہر چیز یہیں مل جاتی۔

کباب، پراٹھے، پکوریاں، مٹھائی، موسم کے پھل، ہر نعمت لے لو، گھر سے توشہ ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں۔

پتنگ باز پتنگیں اور چرخیاں لے کر جاتے۔ تاش، پچیسی، گنجفہ ساتھ ہوتا۔ پتنگ بازی ہوتی۔ طرح طرح کے کھیل ہوتے۔ ہنڈولوں میں جھولتے، درختوں میں جھولے ڈال کر پینگیں بڑھاتے۔ قوالوں کی ٹولیاں گا گا کر لوگوں کو رجھاتیں۔ ان پر روپیہ برستا۔

جگہ جگہ ڈیرے، تنبو اور چھولداریاں لگی ہوئی ہیں۔ ان میں دلّی کی گانے والی طوائفیں ہیں۔ بعض ڈیرے دارنیاں بھی ہیں۔ سفردا ساتھ ہیں۔ جب ان کے ہاں معقول مجمع ہو جاتا ہے تو یہ حسب فرمائش گانا سناتی ہیں۔

ایک سال سوکھ پڑا اور پورا ساون گزر گیا، ایک بوند تک نہ پڑی۔ بھادوں بھی خشک نکلا جا رہا تھا اور دلّی میں بھڑ سا بھن رہا تھا۔ پورا رمضان کا مہینہ اسی گرمی میں گزرا۔ خلق خدا تراہ تراہ پکار اٹھی۔ بے فکرے سیلانی بھلا گرمی کو کب خاطر میں لاتے۔ حسب دستور تر کا میلا ہوا۔ اور اسی محل دار خاں میں اللہ دی غازی آباد والی نے ملہاریں ایسی گائیں کہ گھٹائیں جو جھومتی چلی جاتی تھیں ٹوٹ کر برسیں اور جل تھل ہو گیا۔ لیلو! رت بدل گئی۔ اس واقعہ کو دیکھنے والے اب بھی کئی دلّی والے موجود ہیں، ہم تو اسے حسنِ اتفاق ہی سمجھتے ہیں مگر کئی جنوں کا کہنا یہ ہے کہ یہ راگ کی تاثیر تھی کہ بارش ہوئی۔ اور ثبوت میں میاں تان سین اور بیجو باورے کے روایتی قصے سناتے ہیں کہ وہ دیپک راگ گا کر آگ لگا دیتے تھے اور ملہار گا کر مینہ برسا دیتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب!

شام تک محل دار خاں میں یہی رونق رہتی تھی۔ ۲۵۔۳۰ سال ہوئے محل دار خاں کا مالک کوئی اور ہندو رئیس بن گیا۔ اس نے مسلمانوں پر اپنا باغ بند کر دیا تو بڑا امیہ اد کھلے میں ہونے لگا تھا۔

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

○○○

سلونی عید

دلّی والے سدا کے دل والے اور جیالے ہیں۔ اپنی شاہ خرچیوں کے پیچھے لاکھ کا گھر خاک کر دینا ان کے لیے معمولی بات ہے۔ تیج تہوار کے موقع پر ان کے حوصلے کو دیکھو۔ جو کچھ سال بھر میں پس انداز کرتے ہیں اسے دم کے دم میں خالصے لگا دیتے ہیں۔ قرض دام سے بھی نہیں چوکتے۔ یہ نہ کریں تو ان کی وضع داری میں فرق آتا ہے ان کی بات ہیٹی ہوتی ہے، کنبے برادری میں ان کی ناک کٹ جاتی ہے۔

امیروں کا تو ذکر ہی کیا، انہیں تو اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے، تہواروں کا اصل لطف غریب طبقے کے دست کار اٹھاتے ہیں۔ خوب محنت کر کے کماتے ہیں اور خوب جی بھر کے اُڑاتے ہیں۔ میٹھی عید کے بعد ہی سے انہیں سلونی عید کا فکر لگ جاتا ہے۔ مزدوری بڑھانے کے لئے دن رات ایک کر دیتے ہیں۔

خالی کا مہینہ ہے، رات ڈھل چکی ہے مگر ورق کوٹنے کی آواز برابر چلی آ رہی ہے۔ بارہ کاریگر ہیں جنہوں نے چار چار کی ٹکڑیاں بنالی ہیں۔ ہتھوڑے برابر کی لے سے چل رہے ہیں۔

ایک دو تین چار   ایک دو تین چار

یہ معلوم ہوتا ہے جیسے پکی سڑک پر کوئی جاندار فر فر رواں چلا آ رہا ہے۔ جانتے ہو اس میں سے کیا آواز آ رہی ہے؟ سنو:۔

لب بھر آٹا، مٹھی چنے   ٹکڑا روٹی، گڑ کی ڈال

یہی حال کندلے کشوں، بتیوں تار کشوں، تھپیروں اور بیسیوں اور [illegible] نے والوں کا بھی ہے۔ بڑی تن دہی سے کام ہو رہا ہے۔ کیوں نہ ہو؟ تہوار کا سرا ہے۔ یہی تو دن کمانے دھمانے کے ہوتے ہیں کہ پھوک کٹ میں ان کی چاندی ہو رہی ہے۔

بقرعید کا مہینہ شروع ہونے سے پہلے ہی بکروں، بھیڑوں اور دنبوں کے ریوڑ شہر میں آنے شروع ہو گئے۔ کوئی چوک، سنگھاڑا یا سموسہ ایسا نہیں جہاں دو چار سو جانور کھڑے نہ۔ چودہ آنے کی ناک بہتی بھیڑ سے لے دو ہزار تک کا دنبہ ان دنوں موجود ہے۔ ایک طرف گائیں کھڑی ہیں، خوب چکنی، فربہ، وہ دیکھئے ایک بھیڑ پر جھک جھک ہو رہی ہے۔ گاہک اس کی چپکی ہوئی کوکھوں کو ٹٹول کر کہتا ہے۔

"چودہری، اس کھال اور ہڈیوں کا کیا دے دوں؟"

"میاں صاحب! کیا کہہ رہے ہو؟ آٹھ سیر پکے سے کم گوشت نہیں نکلے گا اس میں اور سری پائے الگ"

ارے بھائی اس میں کیا رکھا ہے؟ یہ تو گھر تک بھی زندہ نہیں پہنچے گی۔ ہمارے تو پیسے بھی حرام موت جائیں گے"

"میاں تم بے ناحق میں ایسی باتیں کر رہے ہو۔ ذرا جناور کو دیکھو، پانی پئے گا تو سانو نا ہو جائے گا۔ اور تمہیں کوئی پالنے کے لئے تو چھپے ہی نہیں۔ قربانی ہی کرو گے نا؟ بسم اللہ کر کے چھری پھیر دینا۔ جو خون نہ دے تو آ کر اپنے پیسے مجھ سے لے جانا۔"

لو صاحب! خون دینے کی تو گارنٹی ہو گئی۔ گاہک نے روپیہ لگایا۔ چودھری نے دو مانگے۔ گاہک منہ پھیر کر جانے لگا تو چودھری نے آواز دی "میاں جی، یہاں آؤ تم تو ناراج ہی ہو گئے۔ بھلا پونے دو بھی دو گے؟"

گاہک نے کہا "ارے بھائی کوئی اندھیر ہے؟ روپیہ نہیں اٹھارہ آنے لے لو۔"

"اچھا تو ایک بات سنو۔ نہ پونے دو میرے اور نہ اٹھارہ آنے تمہارے۔ چلو ڈیڑھ روپیہ نکالو"

"سن لے بھئی چودھری۔ سوا روپیہ لے گا؟"

"میاں جی کیا قسم کھا کر گھر سے چلے تھے؟ مجھے بھی آج اسے بیچ کر جانا ہے۔ لاؤ سوا ہی دو"

کرخندار نے سوا روپیہ انٹی میں سے نکال چودھری کے ہاتھ پر رکھا اور بھیڑ کا کان پکڑ کر لگے گھسیٹنے۔ مگر وہ کم بخت دو ہی قدم چل کر ایسا اڑا کہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ انہوں نے زور لگایا تو اس نے گھٹنے ٹیک دیے، اور زیادہ کوشش کی تو وہ ہتھیا دے کر بیٹھ گیا۔ کرخندار نے سوچا یہ یوں نہیں چلے گا، دونوں کان پکڑ کر اسے کھڑا کیا۔ پھر لپک کر اس کی پچھلی دونوں ٹانگیں معلق کر لیں اور اسے اگلے پیروں پر چلاتے ہوئے اس طرح دھکیل کر لے چلے جیسے کوئی بچہ گاڑی لے جاتا ہو۔

دلہوں کی ایک جوڑی دیکھنے کے لائق ہے۔ بیس بیس پچیس پچیس سیر کی تو صرف چلکتیاں ہی ہوں گی جو ہلکی دو پہیہ گاڑیوں پر رکھی ہوئی ہیں تیاری کا یہ عالم ہے کہ کتیب اور پٹھوں پر چربی کے گولے سے لٹک رہے ہیں۔ مہندی کی گلکاری کی گئی، اوپر سنہری جھولیں پڑی ہوئیں ہیں۔ گلے میں رنگ برنگ منکوں کی مالائیں پڑی ہیں اور تعویذوں کی ہیکل بھی۔ چاروں پیروں میں چاندی کی پائلیں ہیں۔ چھن چھن کرتے جاتے ہیں۔ جو دیکھتا ہے بس دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ واہ بھئی! ماشاء اللہ۔ کیا تیار کیا ہے!

''کیوں بھئی کیا قیمت ہے اس جوڑی کی؟''

''جی حضور، چار ہزار''

''انہیں دیکھئے تو قیمت مناسب ہی ہے مگر ''

''جی ان کا بھی کوئی قدردان نکل ہی آئے گا۔ سال میں ہزار روپے تو میں انھیں کھلا دیتا ہوں، اور خدمت رو گن میں۔''

''کیوں بھئی کونسی نعمت انہیں کھلاتے ہو؟''

جی چنے سے لیکر دودھ جلیبیاں تک ہر نعمت''

''ہاں بھئی ہاں۔ تبھی تو ماشاءاللہ یہ تیاری ہے۔''

اتنے میں تجارت پیشہ برادری کے رئیس اپنی لینڈو گاڑی میں ادھر نکلے۔ جوڑی پر ان کی نظر پڑی۔ گاڑی رکوائی اور منہ مانگے دام دے کر دنبے اپنے ساتھ لے گئے۔

آج نویں تاریخ ہے۔ اس سال حج اکبر ہوا ہے۔ لوگ بہت خوش ہیں کہ اب حاجیوں کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔ کئی کئی دن پہلے سے دکانیں سجنی شروع ہو گئی تھیں، آج تخٹوں سے نکل کر پٹریوں تک آ گئی ہیں۔ ہر دکان میں الغاروں مال بھرا پڑا ہے۔ خلقت ٹوٹی پڑتی ہے۔ لاکھوں روپے کا لین دین ہو رہا ہے۔ دکانداروں کے وارے نیارے ہو رہے ہیں۔ چاندنی چوک بقعہ نور بنا ہوا ہے۔ سب سے زیادہ بکرا جوتے، ٹوپی اور موزے بنیان والوں کا ہو رہا ہے۔ بچے کو ان کی ضرورت ہے۔ جوتا اگر تنگ ہے تو کہا جاتا ہے کہ پہننے سے کھل جائے گا، اور اگر ڈھیلا ہے تو فرماتے ہیں کے موزوں پر ٹھیک آ جائے گا۔ غرض ان کے دونوں میٹھے ہیں۔

مردانی اور بچوں کی ضرورت کا سامان خرید چکے تو گھروالی کے لئے سرمہ، تیل پھلیل اور پھول

پان لیتے ہوئے گھر چلے۔ راستے میں شیر خرمے کے لئے خشک میوہ اور سوئیاں خریدیں۔ لدے پھندے گھر پہونچے۔ انہیں دیکھ کر گھر والوں کی باچھیں کھل گئیں، جھٹ انہیں اس بوجھ سے سبکدوش کیا۔ اتنے یہ وضو اور نماز سے فارغ ہوں بچیوں نے دستر خوان لگا، کھانا چن دیا۔ وہ ہاتھ دھو کر دستر خوان پر جا بیٹھے کہ ماما نے لپاک جھپاک گرم گرم چپاتیاں اُتارنی شروع کر دیں۔ سب نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔

لو وہ بی امامن چوڑی والی دعائیں دیتی چلی آرہی ہیں۔

"اے اللہ سلامت رکھے۔ سر کی بادشاہی قائم رہے۔ دودھوں نہاؤ، پوتو پھلو۔"

"اے بی بلاتے بلاتے یہ وقت ہو گیا۔ اب آئی ہو آدھی رات گئے؟"

"اے بیگم تم جانو تہوار کا سرا ہے، سبھی کا دل رکھنا پڑتا ہے۔ ادھر شبرات ماندی ہو گئی، ایک سے دوسرا آدمی ہاتھ بٹانے کو نہ رہا۔ اللہ جانتا ہے۔ میرا تو خود دھیان لگا ہوا تھا تمہاری طرف۔ لو دیکھو آج کیسی تحفہ چوڑیاں لائی ہوں تمہارے لئے کہ دیکھ کر جی خوش ہو جائے تمہارا۔ آجاؤ جلدی سے۔ ہاں بیگم، لاؤ اپنا ہاتھ لاؤ۔ کونسی پہنو گی؟"

"بوا میں تو لاکھ کے کنگن اور چوڑیاں پہنوں گی۔ مجھے آج کل کے فیشن کی چوڑیاں پسند نہیں ہیں۔ تم جانو میرے ہاتھ میں ہڈی نہیں ہے۔ بڑی چوڑی چڑھتی ہے، ڈھیلی ڈھلل چوڑیاں کہنیوں تک پہونچ جاتی ہیں۔"

"بیگم میں تو جانتی ہوں نا۔ تمہارے لئے میں لاکھ کی چوڑیاں ہی لائی ہوں۔ پنّی کے ساتھ ان میں نگینے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ لو دیکھو، یہ جوڑا میں نے تمہارے لئے تیار کیا ہے۔

یہ کہہ کر ایک مٹھا بیگم کی طرف بڑھا دیا۔ واقعی میں لاجواب چیز تھی۔ دام پوچھے تو بی امامن نے پیار بھرے انداز میں جھڑک کر کہا:

"اے بیگم، تم برس برس کے دن ایسی باتیں مت کیا کرو۔ تمہیں پسند آگئیں، بس میری محنت وصول ہو گئی۔"

یہ کہہ کر مٹی کے تیل کی ڈبیا نکالی۔ اسے روشن کیا۔ ایک کنگن سروتے سے کاٹا، لو پر اسے سینک کر نرم کیا۔ پھر کٹے ہوئے سروں کو پگھلا کر جھٹ ہاتھ میں ڈال کنگن کا منھ بند کر دیا۔ اسی طرح جھپا جھپ چوڑیاں پہنائیں اور آخر میں ایک کنگن ڈال کر ایک ہاتھ پورا کر دیا۔ اس کے بعد دوسرا ہاتھ بھی بھر دیا۔

بیگم نے چوڑیاں پہن کر منہیاری کو سلام کیا۔ بی اماسن نے چٹاچٹ بلائیں لیں۔ ''میں واری گئی، صدقے گئی۔ بوڑھ سہاگن۔ ہزاری عمر ہو میری بیگم کی۔ پروار بڑھے، خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔''

بیگم کے بعد ننھی نے بلوری چوڑیاں پہنیں۔ بڑوں کو سلام کیا۔ بیگم نے بوا اماسن کو تہواری دی اور وہ اپنی ٹوکرا سنبھال دعائیں دیتی رخصت ہوئیں۔ رات خاصی آ گئی تھی، سب پڑ کر سو گئے۔

بیگم منھ اندھیرے اٹھ کر گھر کے کام میں لگ گئیں۔ میاں اٹھے تو غسل کا پانی تیار تھا۔ نہا دھو نیا جوڑا پہنا۔ فجر کی نماز پڑھی، پاؤ سپارہ تلاوت کیا۔ اُدھر ننھی نے سیویاں ابالیں۔ بیگم نے آ کر شیر خرمہ تیار کیا اور چینی کے پیالوں میں لگا دیا۔ سب نے جی بھر کے کھایا۔ منھ سلونا کیا اور میاں بچوں کو ساتھ لے عیدگاہ روانہ ہوئے۔

ooo

بسنت کی بہار

دلّی والوں کی ایک مثل ہے "تمھیں کچھ بسنت کی بھی خبر ہے؟" انتہائے بے خبری کے موقع پہ یہ مثل بولی جاتی ہے۔ یعنی موسم پلٹ گیا، رت بدل گئی، زمین آسمان بدل گئے، مگر آپ کو ان کی کچھ خبر ہی نہیں، کانوں میں تیل ڈالے اور آنکھوں پر ٹھیکری رکھے بیٹھے ہیں! غضب خدا! ایسی بھی کیا بے خبری؟ مرزا غالب نے ایسی ہی بے خبری، بے اعتنائی، بے نیازی کی شکایت کی ہے۔

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل، اور آپ فرمائیں گے "کیا؟"

بسنت رُت آئی اور جاڑے سے ٹھٹھری ہوئی دنیا جیسے انگڑائی لے کر جاگ پڑی، غنودگی کا طلسم ٹوٹ گیا اور ہر شے میں ایک جان سی پڑ گئی۔ ننگے بُچے کالے کلوٹے درختوں نے اپنی کالی کالی کینچلیاں اتارنی شروع کر دیں اور نئے پوشاکیں پہننے لگے۔ جوشِ نمو سے ٹہنیوں میں کونپلیں پھٹنے لگیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے ہرے ہرے پتوں سے سارے درخت لد گئے۔ پون کے نرم نرم جھونکوں کے ساتھ درختوں نے جھوم جھوم کر تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ زندگی اور مسرت کا بڑا خوشنما سنجوگ ہوا ہے، پھولوں نے خوشبوؤں کے قرابے لنڈھائے ہیں اور پرندوں نے اس معطر فضا میں اپنے بیشمار نغمے بکھیر دیے ہیں اور کیوں نہ ہو! آج بہار نے خزاں پر فتح پائی ہے۔ یہ جشنِ بہاراں ہے جبھی تو چاروں طرف قہقہے اور چہچہے گونج رہے ہیں، ایک سیلاب نغمہ ہے، ایک طوفانِ سرخوشی ہے جس میں ہر چیز گا رہی ہے، ہر چیز ناچ رہی ہے، فطرت نے بھی آج اپنا بوقلموں جوڑا پہن لیا ہے۔ بہار نے فطرت کا حسن نکھار دیا ہے۔

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ پاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمین ہو گئی ہے سر تا سر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کو دیکھنے کے لئے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

دن گزرتے رہتے ہیں۔ مہینے گزرتے رہتے ہیں۔ شب و روز کا رقص جاری رہتا ہے اور پھر سال گھومتا گھومتا ایک خاص نقطے پر لوٹ آتا ہے، یہی اس کا نقطۂ عروج ہوتا ہے۔ فطرت اپنی تجدید کرتی ہے۔ اپنی زندگی کا ثبوت دیتی ہے۔ انسان فطرت کا معصوم بچہ۔ اس جشنِ بہاراں میں سب کچھ بھول جاتا ہے۔ سرمدی نغمے سن کر مست و بیخود ہو جاتا ہے، زندگی کا دکھ حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتا ہے۔ سرمدی نغموں میں لپٹی ہوئی کائنات نشاط و سرخوشی میں رقص کرنے لگتی ہے۔

کائنات تاریکی کے پردے میں لپٹی سو رہی تھی۔ گہرے اندھیرے فضا پر چھائے ہوئے تھے۔ سحر نے اپنے شبنمی پردے روئے زمین پر تان رکھے تھے۔ سناٹا اور ہو کا عالم۔ رات بھر جاگنے کے بعد ستاروں کی آنکھیں جھپک چلی تھیں کہ مشرق سے ایک سنہری کرن نے جھانک کر دیکھا اور اپنی ہم جولیوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھی۔ اس چمکیلے جھرمٹ کے آگے اندھیرا سمٹنے لگا۔ کائنات نے انگڑائی لی۔ مشرق میں شہاب پھیلا، شبنم نے کلیوں کا منہ دھلایا۔ نسیم نے گدگدایا، پھول کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ چمن میں صوتِ ہزار گونجی۔ ایک نئی زندگی ہمہمانے لگی۔ نسیمِ سحر کے ایک معطر جھونکے نے نویدِ بہار سنائی۔

بہار نے زندگی میں سرخوشی گھول دی ہے۔ غم و اندوہ کافور ہو گئے، دلوں کی کدورت دھل گئی۔ خشک بنجر زمین کا سینہ جوشِ نمو سے پھٹا جا رہا ہے۔ سبزہ لہک رہا ہے۔ چمن مہک رہا ہے۔ بہار کی دیوی آج سبزہ روندنے نکلی ہے۔ شاعر کے دل میں ایک نئی امنگ پیدا ہو رہی ہے۔ اس کی آنکھوں کے

آگے سبزے کا فرش پھیلا ہوا ہے۔ جنگل میں منگل ہو رہا ہے۔ شہر کی ہنگاموں بھری زندگی نے اسے اداس کر دیا تھا۔ اس نشیلی رت نے اس کے دل کا کنول کھلا دیا۔ نغمہ دل سے اٹھ کر لبوں پر آتا ہے اور یوں فضا میں بکھرنے لگتا ہے۔

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اُودے اُودے، نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن
برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی باد صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

یہ نغمہ ابھی ہوا میں لرز ہی رہا تھا کہ دھانی اور بسنتی جوڑے پہنے، ہاتھوں میں پیلی سرسوں کے گڑوے لئے ہنستی بولتی، گاتی گنگناتی، اینٹھتی اٹھلاتی، اہلی گہلی پھرتی سہیلیوں کا ایک پرا آن پہونچا۔ سہانی رت نے ان کے دلوں کو گدگدایا ہے۔ قہقہے، چہچہے، بہار زندگی کا رسیلا نغمہ ہی تو ہیں۔ دلّی کے آخری بادشاہ کا بنایا ہوا بہار کا خیال فضا میں گونج رہا ہے۔

سکل بن پھول رہی سرسوں
امبوا بورے، ٹیسو پھولے
کوئل کوکت ڈار ڈار اور
گوری کرت سنگھار
مالنیا گڈوا لے آئی کرسوں
سکل بن پھول رہی سرسوں
طرح طرح کے پھول لگائے
لے گڈوا ہاتھن میں آئے
نظام الدین کے دروازے پر
آدن کہہ گئے عاشق رنگ اور
بیت گئے برسوں
سکل بن پھول رہی سرسوں

اور ایک رند سرمست گھر کی چار دیواری سے نکل کر فطرت کی رنگین آغوش میں پہونچ جانا چاہتا ہے۔ نکہت و نور کی بارش ہو رہی ہے اور زندگی کو حیات تازہ مل رہی ہے۔ زمانے کے ستائے ہوئے کو بہار سکون و راحت کا پیام دے رہی ہے۔ اس نے بہت دکھ اٹھائے ہیں، آغوش فطرت ہی میں اسے سکھ مل سکتا ہے۔

چلتے ہو تو چمن کو چلیے، کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے
رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چواتے ہیں
آگے ہو میخانے کے نکلو، عہد بادہ گساراں ہے
دل ہے داغ، جگر ہے ٹکڑے، آنسو سارے خون ہوئے
لوہو پانی ایک کرے یہ عشق لالہ عذاراں ہے

مگر آج ٹوٹے ہوئے دل جڑ رہے ہیں۔ چشم خونابہ بار میں سرخ آنسو نہیں ہیں۔ رندی و سرمستی کے گلابی ڈورے ہیں۔ آج تو لالہ کے دل کا داغ بھی سویدائے بہار بن گیا، چشم محبوب کا سرمہ دنبالہ دار ہے جسے دیدۂ نرگس حیرت سے تک رہی ہے۔ سنبل و ریحاں گیسوئے فطرت سنوار رہے ہیں۔ عروس بہار کی مانگ میں شبنم کی افشاں چنی ہوئی ہے۔ کھیتوں میں سرسوں پھولی ہے۔ سرسوں کے پیلے پیلے پھول تاحد نگاہ پھیلے ہوئے ہیں۔ آج زمین نے اپنے خزانے اگل دیے ہیں یا کاروانِ بہار اشرفیوں کی بکھیر کرتا ادھر سے گزر رہا ہے۔ دولت زر بکھری پڑی ہے جس کا جی چاہے اس سے اپنی جھولیاں بھر لے۔ آج صلائے عام ہے۔ سب کی آنکھوں میں سرسوں پھولی ہے۔ آج دھرتی کے ہاتھ پیلے ہوئے ہیں۔ سہاگ گھوڑیاں گائی جا رہی ہے۔

اری اے ری آج نئی دلہن
دھرتی بن بیٹھی
میگھ دولہا بیاہنے آیا
اری اے ری آج نئی دلہن
اندر کے نقارے باجے
بوندن کا سہرا ساجے

نگر نگر کے بدرا برا تی

اری اے ری آج نئی دلہن

دھرتی نے ریت کا بسنتی جوڑا پہنا ہے، آم میں بور آیا ہے۔ مور جھنگار رہے ہیں۔ کوئل نے اپنا نغمہ چھیڑا ہے۔ پپیہا پی کہاں کی رٹ لگا رہا ہے۔ بن میں ٹیسو پھولے ہیں۔ فطرت نے سولہ سنگھار کیے ہیں۔ نک سک سے درست ہو کر دلہن بن گئی ہے، باغوں میں رنگ برنگ کے پھول کھلے ہیں۔ مالن نے گندوے سجائے ہیں۔ ننھے ننھے پیلے پیلے پھول ان میں سے ایسے کھلے ہیں کہ انہیں دیکھ کر آنکھوں میں تراوٹ آتی ہے۔ یہ سرسوں کھلائی ہے یا ہتھیلی پر سرسوں جمائی ہے؟ دیر کا یہاں کام نہیں۔ کب سے اس سہانی رت کا انتظار تھا۔ اس کا ایک ایک لمحہ دولت بیدار ہے۔

مگر بہار کی شادابی نے دلوں کے زخم بھی ہرے کر دیے ہیں۔ اس خوشی کے لمحے میں کسی کے دل کا روگ بڑھ گیا ہے۔ ورنہ اس من موہنی فضا میں یہ برہ کی آواز کیسی؟ ہو نہ ہو یہ کوئی کرموں جلی ہے۔ اس کا من اداس ہے، اسے کسی کی تلاش ہے۔ جوگیا کپڑے پہنے، انگ بھبوت ملے یہ کون بروگن ہے؟ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی ہے یا سرسوں کے پیلے پھولوں کا عکس پڑ رہا ہے؟ اوہو! یہ تو جوگن ہے جو اپنے پی کی تلاش میں گھر سے نکلی ہے۔ ذرا سنو تو اکتارے پر یہ کیا گاتی چلی آتی ہے۔ باگیری بہار میں بادشاہ کا گانا گاتی اور دلوں کو برماتی ہے۔

رُت بسنت میں اپنی امنگ سوں

پی ڈھونڈوں میں نکسی گھر سوں

رُت بسنت میں اپنی امنگ سوں

ملے تو لال گروا لگالوں

پاگ بندھاؤں پیلی سرسوں

رت بسنت میں اپنی امنگ سوں

رنگ ہے سبزہ نرگس یاں کا

کہے شوق رنگ رنگ ہے وا کا

ان بھیدن کو کوئی نہ جانے

واقف ہو میں واکی جرسوں
رت بسنت میں اپنی امنگ سوں

ادھر اس کا یہ حال، اُدھر وہ بھی پردیس میں نڈھال۔ ایسے سمے میں پردیس! بھلا کیسے چین آ سکتا ہے؟ فلک کج رفتار من مانی کئے جاتا ہے۔ یہ اپنا دس گھولے جاتا ہے، اسے دوری و مجبوری ہی بھاتی ہے۔

کسی کا اسے عیش بھاتا نہیں
یہ دو دل کو یکجا بٹھاتا نہیں

دو دلوں میں بجوگ پڑ گیا جبھی تو اداسی کا پیلا رنگ چڑھ گیا۔ زخمی دل کا نغمۂ پر شکستہ پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا ہے۔

یہ جشنِ بہاراں ہے۔ اس میں افسردہ خطروں کے لئے جگہ نہیں ہے۔ زندگی میں غمِ روزگار ہی کیا کم ہے کہ غمِ جاناں بھی اپنی جان کو لگا لیا جائے؟ یہ جشن تو غم کو بھلانے کے لئے منایا جاتا ہے۔ فضا کو دیکھو اس میں غم کی سیاہی نام کو نہیں ہے۔ صرف تین رنگوں کا امتزاج ہے دھانی، بسنتی اور گلابی۔

آج زندگی گا رہی ہے اور کھلکھلا رہی ہے۔ فطرت مسکرا رہی ہے۔ اور اس کا حسین تبسم روح کائنات بن کر طاری و ساری ہو گیا ہے۔ مگر عشق کی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں۔ فطرت کی رعنائیوں نے دوں کی ٹیسوں کو تیز تر کر دیا ہے۔ محبوب کی یادوں کو نشتر بنا دیا ہے۔ یہ چبھن بھی نغمے کا روپ دھار رہی ہے۔ غم کے چہرے پر بھی خوشی کا غازہ مل دیا ہے۔ بسنت نے جذبات کو کچھ اور ہی رنگ دیا ہے۔

لیکن فطرت کا تماشائی عام جذبات سے بے نیاز ہے۔ فطرت کی رنگینی اس کی عزیز ترین شے ہے۔ سرسوں کے لہلہاتے تختے، بن میں جھومتے ٹیسو کے پھول، کوئل کی رسیلی کوک، پپیہے کی میٹھی میٹھی ہوک، جہاں تک نظر جاتی ہے، ہریاول ہی ہریاول ہے۔ وہ تو ان ہی مناظر جمیل کا رسیا ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسا تماشائی ہے جو فطرت کی رنگینیوں کو آنکھوں سے دیکھتا ہے اور دل میں جذب کر لیتا ہے۔ اور اس کی روح رنگین ہوتی چلی جاتی ہے اور پھولوں کی خوشبو میں بس کر معطر ہو جاتی ہے، اور یہ رنگین و معطر روح نت نئے نغمے بن بن کر فضا میں رنگ و خوشبو بکھیرتی رہتی ہے۔

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
ارم بن گیا دامنِ کوہسار

گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہید ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں
فضا نیلی نیلی، ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
ذرا دیکھ اے ساقیِ لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

موسم اور زندگی میں اتنی بڑی تبدیلی آجائے اور دلّی کے دل والے اس کا کوئی اثر نہ لیں! بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ دیکھیے جگہ جگہ دلّی کے بزرگوں کے مزاروں پر بسنتیں شروع ہوگئیں۔ دلّی کے پیشہ وروں اور کاریگروں کو تو اللہ ایسا موقع دے کہ کام کاج چھوڑ سیر سپاٹے کو نکل جائیں دل بہلاوے کا کوئی موقع ہاتھ آجائے۔ ویسے بھی اس شہر میں آٹھ دن نو میلے رہتے تھے۔ بائیس خواجہ کی چوکھٹ، عجب برکتوں کا شہر تھا۔ اپنے تو صرف دو ہی تہوار تھے۔ میٹھی عید اور سلونی عید۔ لہٰذا انھوں نے ہندوؤں کی دیکھا دیکھی ان ہی سے ملتے جلتے تہوار بنا لیے۔ رت جگا، بیوی کی صحنک، آخری چہار شنبہ، حضرت خواجہ بختیار کاکی کا عرس، سلطان جی کی (بڑی) سترھویں، حضرت امیر خسرو کی (چھوٹی) سترھویں، مدار صاحب کی چھڑیاں، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی میدنی۔ رجب میں مردوں کی تبارک، جاتے جاڑوں میں بسنتیں۔

بسنت کا موسم وہی ہوتا ہے جو بہار کا۔ ہندو اپنے دیوتاؤں کے مندر میں سرسوں کے پھول چڑھاتے ہیں۔ مسلمانوں نے بھی اپنے بزرگوں کے مزاروں پر عقیدت کے پھول چڑھانے شروع کر دیے۔ دلّی میں کئی جگہ بسنت چڑھتی تھی۔ آج بھولو شاہ کی بسنت ہے تو کل رسول نما کی۔ کبھی ہرے بھرے صاحب کی بسنت ہے تو کبھی شاہ بڑے کی۔ کبھی سلطان جی کی بسنت ہے، کبھی حضرت ترکمان کی۔ ان بزرگوں کے علاوہ بعض قوالوں اور گائیکوں نے اپنے نامی گرامی باپ دادا کے مزاروں پر بھی بسنت چڑھانی شروع کر دی تھی۔ غرض دلّی میں بیسیوں جگہ بسنت چڑھتی تھی اور خوب رونق ہوتی تھی۔ بسنتوں کا کوئی اعلان نہیں ہوتا کہ کب اور کس جگہ بسنت ہوگی مگر سب کو خبر ہو جاتی تھی اور ہر بسنت میں سینکڑوں آدمی شریک ہوتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ عصر کے نماز کے بعد درگاہ کے متولی یا خادم صاحب ختم

پڑھتے اور شیرینی تقسیم کرتے۔ پھر پھولوں کی چادریں چڑھائی جاتیں۔ مزار کے پائیں میں سرسوں کے پھول اور گنڈوے رکھے جاتے۔ اس کے بعد قوالی ہوتی۔ فرطِ عقیدت سے طوائفیں بھی اپنے ناچ گانے کا ہنر دکھانے آ جاتیں، ان کی وجہ سے اور خلقت ٹوٹ پڑتی۔ تیسرے پہر ہی سے سودے والوں کی دکانیں لگ جاتیں۔ گیس کے ہنڈوں سے رات کا دن بن جاتا۔ شام کو جھٹ پٹے کے بعد ہجوم بڑھنا شروع ہوتا یہاں تک کہ رات ڈھلے تک تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی۔ دلّی کے منچلوں نے عقیدت کے ان اجتماعوں کو بھی دل بہلانے کا ایک ذریعہ بنا لیا۔ جب طوائفیں ناچنے اور گانے کھڑی ہوتیں تو انہیں ہجوم کے مختلف گوشوں سے بیل کے روپے اور نوٹ دکھائے جاتے اور رنڈیاں لاگتی بھاگتی انہیں لینے جاتیں۔ بیل دینے میں مقابلہ اور مسابقت جب شروع ہو جاتی تو سینکڑوں کے وارے نیارے ہوتے، یہ لکھ لٹ، گھر پھونک تماشہ دیکھنے والے بھلا کب باز آنے والے ہیں؟ جس نے دیا ہے تن کو وہی دے گا کفن کو، غرض بسنتوں میں وہ ہنگامہ اور دھما چوکڑی ہوتی کہ اس ہڑبوم میں بھلے آدمیوں نے شریک ہونا چھوڑ دیا تھا۔ حضرت سلطان جی کی درگاہ کے صحن میں اور حضرت امیر خسرو کے مزار کے سامنے بھی رنڈیاں ناچا کرتی تھیں۔ خواجہ حسن نظامی کو اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، انھوں نے اس خرافات کو ختم کرایا مگر شہر میں یہی سلسلہ ۱۹۴۷ء تک جاری تھا۔

ہم نے اس کی ٹوہ لی کہ آخر یہ بسنتیں چڑھانے کا دستور کہاں سے شروع ہوا تو دلّی کے عاشقِ زار واحدی صاحب کا ایک نوشتہ ہمیں ملا۔ واحدی صاحب کوئی بات بغیر تحقیق کے نہیں لکھتے، اس لیے ؎ "مستند ہے ان کا فرمایا ہوا" فرماتے ہیں:

> "حضرت سلطان المشائخ کی بہن کے پوتے خواجہ سید تقی الدین نوح دق کے مرض میں مبتلا رہ کر داغِ مفارقت دے گئے تھے، حضرت سلطان المشائخ اس سے بے حد متاثر تھے۔ مخلص مرید طرح طرح سے ان کا غم غلط کرنا چاہتے تھے لیکن کامیابی نہ ہوتی تھی۔ ایک روز خانقاہ کے پاس سے ہندوؤں کا ہجوم ہاتھوں میں سرسوں کے پھول لیے نکلا۔ یہ کالکاجی جا رہے تھے۔ اس منظر نے حضرت امیر خسرو کے دماغ میں پیر کو ہنسنے کی تدبیر پیدا کر دی۔ حضرت امیر نے بھی سرسوں کے پھول اٹھا لیے اور حضرت سلطان المشائخ کے گھر کا رستہ لیا۔ راستہ میں خواجہ محمد امام اور خواجہ سید موسیٰ اور امام احمد ایاز مل

گئے۔ وہ بھی ساتھ ہو گئے۔ گھر پر معلوم ہوا کہ حضرت سلطان المشائخ خواجہ سید تقی الدین نوح کی قبر کے نزدیک کوشک لال والے گنبد میں تنہا بیٹھے ہیں اور حضرت کا خادم مبشر گنبد کے دروازے پر کھڑا ہے۔ یہ جماعت وہاں حاضر ہوئی۔ حضرت سلطان المشائخ ایک پتھر پر تشریف فرما تھے۔ سر جھکا رکھا تھا اور نگاہ زمین پر تھی۔ حضرت امیر نے خواجہ سید محمد امام کو اشارہ کیا اور اپنی ٹوپی ذرا ٹیڑھی کر لی اور رقص کے انداز میں جھومنا شروع کیا۔ حضرت سلطان المشائخ مسکرائے اور بولے "کیا ماجرا ہے" حضرت امیر نے جھٹ بڑھ کر سرسوں کے پھول قدموں میں ڈال دیئے اور کہا

"عرب یار توری بسنت منائی

آج ہندو اپنے بت پر بسنت کے پھول چڑھانے جا رہے ہیں، میں بھی اپنے بت پر پھول چڑھانے آیا ہوں۔" اس کے بعد حضرت امیر نے یہ شعر گایا۔

اشک ریز آمد و ابر بہار
ساقیا گل بریز بادہ بیار

خواجہ سیّد محمد امام اور خواجہ سید محمد موسیٰ نے بھی حضرت امیر کے ساتھ گانے میں شرکت کی، حضرت سلطان المشائخ محظوظ ہوئے۔ حضرت سلطان المشائخ خود بار بار فرماتے۔ ع

اشک ریز آمد و ابر بہار

تینوں نے دوبارہ اس شعر کی تکرار شروع کر دی۔ حضرت خاموش کھڑے رہے، پھر خانقاہ واپس آئے اور حضرت امیر سے پوچھا "گھر جاؤ گے یا میرے ساتھ چلو گے؟"

حضرت امیر نے برجستہ عرض کیا۔

نہ خفت خسرو مسکیں ازیں ہوس شبہا
کہ دیدہ بر کف پایت نہد بخواب شود

''غریب خسرو نے اس آرزو میں متواتر تین راتیں جاگ کر کاٹی ہیں

کہ حضور کے تلوؤں سے آنکھیں ملوں تب سوؤں۔''

اس دن سے 1947 ء تک بسنت اسی طرح منتی رہی۔

بسنت پنچمی کی شام کو ٹھیک چار بجے اسی جگہ حضرت سلطان المشائخ کے نام لیوا جمع ہوتے تھے اور قوال یہی گاتے تھے۔

''عرب یار توری بسنت منائی

اور

اشک ریز آمد و ابر بہار

ساقیا گل بریز و بادہ بیار

کالکا میں ہندو اور درگاہ حضرت سلطان المشائخ میں مسلمان ایک ہی دن بسنت کے میلے کی ابتداء کرتے، پھر ساری دلّی پر بسنت چھا جاتی۔ کون تھا جو بسنت سے بے خبر اور بے تعلق رہتا؟ لڑکپن میں سوئی والوں اور شاہ بڑے اور کوٹلہ فیروز شاہ کی بسنت میں نے بھی دیکھی ہیں اور بڑھاپے میں یہ تاریخی بسنت دیکھنے جایا کرتا تھا۔

درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور درگاہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی میں بھی بسنت پہلے ہی دن درگاہ حضرت سلطان المشائخ کے ساتھ منائی جاتی تھی۔ دلّی کی دوسری درگاہوں میں بعد میں منتی رہتی تھی۔

وہ گنبد تو باقی نہیں رہا جس کے اندر حضرت امیر نے سلطان المشائخ کی خدمت میں پھول پیش کیے تھے لیکن وہ پتھر موجود ہے جس پر سلطان المشائخ پھول قبول کرتے وقت اور اس میلے میں مسلمانوں کی شرکت جائز سمجھتے وقت بیٹھے تھے۔ پہلے اس پتھر پر پھول چڑھائے جاتے اور پھر خواجہ سید تقی الدین نوح کے مزار پر۔ وہاں سے جلوس حضرت سلطان المشائخ کے مزار کے سامنے آ کر کھڑا ہوتا اور وہاں سے حضرت امیر خسروؒ کے مزار کے سامنے''۔

○○○

سترھویں کی سیر

ایلو! آج چاند کی چودھویں تاریخ تو ہوگئی، سترھویں میں اب دن ہی کے رہ گئے؟ دلّی کے دل والوں میں سرسراہٹ شروع ہوگئی، کرخنداروں میں تو جیسے عیدی آگئی، دلّی کے یہ دستکار بڑے سیلانی جیوڑے ہوتے ہیں، انہیں تو اپنی "سیل" کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ چاہئے، محنت مزدوری سے تھک بھی تو جاتے ہیں، جبھی تو میلوں ٹھیلوں کی اتی اللہ آمین کرتے ہیں، کاریگروں اور کرخنداروں میں ناویں پر جھک جھک ہورہی ہے۔

کاریگر: میاں کرخندار ناواں دلواؤ نا۔

کرخندار: ابے کاہے کا ناواں مانگ رہا ہے، کیا تو ائی ہے؟

کاریگر: میاں اللہ نہ کرے تو ائی کیوں ہوتی، میں تو اپنی دھیانگی مانگ رہا ہوں دھیانگی۔

کرخندار: ابے کل ہی تو تجھے پاؤلا دیا ہے اور اس سے اگلے دن تو دھیلی لے گیا تھا۔

کاریگر: اماں تو میں اس سے کب ناٹکر ہورہا ہوں؟ بازداں سترھویں کے لئے تو کچھ چئیے ہی ہوگا۔

کرخندار: ابے میں نے کوئی تیرا ٹھیکہ لیا ہے کہ ہر بے جر بے ناواں ہی مانگتا رہتا ہے۔

کاریگر: ۔میاں کرخندار میں کوئی تم سے بھیک مانگ رہا ہوں؟ کوئی خیرات زکوٰۃ دے رہے ہو؟ اماں جان پیلتا ہوں صبح سے شام تلک۔

کرخندار: ابے ہاں ہاں بہت دیکھے ہیں تجھ سری کے جان پیلنے والے، نئیں ہے ناواں میرے کنے۔

کاریگر: کرخندار۔ناواں تو میں تم سے لے کر ہی جاؤں گا، سیدھی خیر سے دھر دو یہاں ورنہ۔

کرخندار: چل چل، لمبا بن یاں سے، بڑا آیا سونتیا صراف، ورنہ بچہ، وہ رپٹا دوں گا کہ چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔

کاریگر: دیکھو میاں کرخندار، میں تو تمہارا لحاظ کیے جا رہا ہوں اور تم ہو کہ ایکساں سر پر چڑھے جا رہے ہو، یہ تمہاری شرافیت ہے؟ ہم تو کہتے ہیں میاں جانے دو مگر۔

کرخندار: ابے اگر مگر کے بچے جاتا ہے کہ لوں پاؤں کی ہاتھ میں؟ کیوں تری کھال میں دھواں بھرا ہے، ابے دیکھیو کھوپڑی بھیک مانگتی پھرے گی بھیک۔

کاریگر: بس میاں بس، بہت ہوئی، یک ساں ٹر ٹر کیے جا رہے ہو، رکھ دو سیدھے ہاتھ سے میرا تاوان ورنہ۔

کرخندار: ورنہ کیا کرے گا بے تو؟

کرخندار تھے جھٹ پھٹ، آؤ دیکھا نہ تاؤ، الٹے ہاتھ کا لپڑ رسید کر دیا۔ کاریگر پر غصے کا بھوت سوار تھا۔ بڑے چھوٹے کا لحاظ بالائے طاق رکھ کر غپ پٹوں میں بیٹھ گیا اور دھوں دیتی سے کرخندار کو دے مارا، ان کی جھک جھک بک بک سن کر جوار دی پڑوسی اور راہ گیر جمع ہو گئے وہ ہائیں ہائیں کر کے لپکے اور انہوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ اب کرخندار ہیں کہ کاریگر کی سات پشتوں کو کھڑے پن رہے ہیں اور کاریگر ہے کہ برابر ترکی بہ ترکی جواب دیے چلا جا رہا ہے نہ یہ ان کی سنتے ہیں اور نہ وہ ان کی، جب خوب زبانی جمع خرچ ہو چکا تو بیچ بچاؤ کرنے والوں نے دونوں کو قائل معقول کر کے گلے ملوا دیا! گلے ملتے ہی دونوں کے دل صاف ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، کرخندار نے انٹی ڈھیلی کی اور چپکے سے کچھ نکال کاریگر کے ہاتھ پر رکھ دیا اور مٹھی بند کرتے ہوئے کہا:

"اس وخت تو یہی لے جاؤ، پھر دیکھی جائے گی۔"

کاریگر نے بھی سوچا اس سوم سے یہ بھی مل گیا۔ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی بھلی، ڈنٹر پھلائے وہاں سے اپنے گھر آئے، ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی دو چار گالیاں چٹخائیں۔ گھر والوں نے جان لیا کہ بھونچال آ گیا، مگر ایک دن کا بھونچال ہو، دو دن کا، روز کا یہی وطیرہ تھا، چنانچہ کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا، اس کان سے سنا اس کان سے اڑا دیا، ان کے ہاں تو ہر وقت دردر پھٹ پھٹ ہی رہتی تھی۔

میاں رفو نے روٹی کھائی، کلہ تازہ کیا اور گھر سے نکل کر سیدھے جامع مسجد پہونچ گئے، تھڑی پر سے بھاؤ تاؤ کر کے دو گز چکن اور دو گز لٹھا خریدا، بیچ بیل خریدی، پیٹن کا چمکا ہوا پمپ خریدا، کچھ چکھا چکھی

کی اور گھر لوٹ آئے، گھر والی کو کرتا پاجامہ ارجنٹ سینے کو دیا۔ اس غریب نے راتوں رات کرتا کھڑا کیا اور چھپا چھپ آڑا پاجامہ بھی کچا کرلیا، ادھر میاں کسی کام سے باہر گئے ادھر پڑوس میں بابو جی کے ہاں جا کرتے پاجامے پر مشین کا بخیہ کرلائی۔ لو اتنی سی دیر میں اس نیک بخت نے کیکری کٹاؤ کا کرتا بھی تیار کردیا اور چوڑی دار پاجامہ بھی، میاں رفو نکو پر خلیفہ کی دکان سے حجامت بنوا کر جب لوٹے تو حاجی احمد کی دکان سے ایک بنیان اور پھول دار موزوں کی جوڑی بھی لیتے آئے۔ تیسرے پہر سلطان جی جانا تھا، ان کا سنگھار دو گھنٹے پہلے شروع ہوگیا، سگندا گندھی کے ہاں سے ایک پیسے کا تیل لیا، خوب سر پر چپڑا اور جو باقی بچا منہ پر مل لیا، گندھی نے میاں جی کو خوش کرنے کے لئے خس کا ایک پھویا بھی دے دیا، میاں رفو نے خوش ہو کر پھویا کان میں لگایا اور گھر پہونچ کر آنکھوں میں سرمہ کی سلائیاں بھر بھر کر لگائیں، کالے بھینس کے سے دیدے ہوگئے۔ پھیلا ہوا سرمہ تھوک سے پونچھا جوزہ کی تلے دانی کھول کر مسّی ملی، کتھے کا پان چبایا، پھر لاکھا جمایا، سیدھے ڈنٹر پر چھپا تا سرخ تعویذ باندھ کر کرتا پہنا، اپنے ڈنٹر قیضے دیکھے، مسکرائے نیلے ازار بند پر نظر گئی، اترائے، موزے پہن کر پمپ اڑایا، کھونٹی پر سے جھم جھماتی نیم آستین اتاری اور زیب بر کی، سر پر کھر یا سی چنی ہوئی دوپلی آڑی رکھی، کندھے پر چوخانے کا رومال ڈالا، آئینہ دیکھا، خاصے جچ رہے تھے، خوش ہو کر خود اپنی بلائیں لیں، ٹھمک ٹھمک کر چلے، صحن میں آئے، بیوی کو دیکھا کہ میلی چوہیانی راکھ سے پتیلی مانجھ رہی ہے مگر اس کا دل باغ باغ ہے اور باچھیں کھلی جارہی ہیں کیوں نہ ہو؟ سر کی بادشاہی قائم ہے۔ سہاگ بنا ہوا ہے، دل میں بولی:

"حف نظر، اللہ نظر بد سے بچائے۔"

اور جب ڈیوڑھی کے پردے پر پہونچ گئے تو بولی:

"خیر سے کب تلک لوٹو گے؟ میرا دھیان لگا رہے گا۔"

میاں رفو نے مسکرا کر کہا:

"اری کیوں مری جارئی ہے، پرسوں تو ڑی آجاؤں گا۔"

بیوی نے کہا:

"اچھی اللہ! جیسے پیٹھ دکھا کر گئے ہیں منہ دکھا کر آنا نصیب ہو۔"

آج چاند کی سولہ ہوگئی، یوں تو دنوں پہلے سے خلقت سلطان جی کا رخ کر رہی ہے اور شہر در شہر سے لوگ کھنچے چلے آرہے ہیں مگر دلّی والے آج تیسرے پہر ڈھلنے سے جانے شروع ہوتے ہیں،

جامع مسجد پر تانگوں کی لنگار اور بسوں کا ہجوم ہے، اردو بازار میں کھوے سے کھوا چھل رہا ہے چار آنے سواری عام دنوں میں جاتی تھی، آج آٹھ آنے کی آواز لگ رہی ہے، دلّی کے سیلانی جیوڑوں کے لئے چار آنے کیا اور آٹھ آنے کیا؟ گدا گد گدا گد بسوں میں بھر رہے ہیں، تانگے والے روپیہ سواری بٹھا رہے ہیں، چار سواریاں بٹھائیں گے، یہ کیا کہ بس میں بیٹھے اور اندھے بگلوں کی طرح سلطان جی پہونچے؟ نہ کچھ دیکھا نہ بھالا۔ کیا خاک سیر ہوئی؟ میاں تانگے میں بیٹھو، فرّاٹے کی ہوا کھاؤ، دلّی دروازے سے باہر تو نکلنے دو، پھر دیکھو غازی مرد کے جوہر۔ مزہ آجائے گا، اس وقت تو روپیہ سواری کھل رہی ہے مگر یہ رئیسی شان روپیہ کیا دس روپے میں بھی سستی ہے۔ کرخنداروں کی سیل تو میاں تانگے ہی میں ہوتی ہے، جھپا جھپ تانگے بھرے چلے جا رہے ہیں، تانگے والے بھی تو آخر اسی دن کی آس مناتے ہیں۔ تیج تہوار پر ہی تو ان کی چاندی ہوتی ہے، ورنہ روز تو ٹکے ٹکے سواری بھرتے ہیں، اور آج تو تانگے اور گھوڑے کے ٹھاٹ دیکھنے کے لائق ہیں، تانگہ پر جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے پتلی گلدانوں میں رنگ برنگ کاغذ کے پھول اور گلدستے لگے ہوئے ہیں، یہی حال گھوڑے کے ساز کا بھی ہے، گھوڑے کے سر پر ایک بڑا سا طرّہ ہے، گلے میں موتیا اور گلاب کا کنٹھا پڑا ہے، اس پر ایک سنہ ستارے کا ہار بھی پڑا ہوا ہے، یہاں سے وہاں تک تانگوں کی لین ڈوری لگی ہوئی ہے، جو تانگہ بھر جاتا ہے روانہ ہو جاتا ہے کہ جھٹ پہونچا کہ دوسرا پھیرا بھی کرے۔ یادگار سے نکل کر ٹھنڈی سڑک پر پہنچتے ہی سب کو ایک پھریری سی آجاتی ہے، مگر "بس بیٹا، بس بیٹا" کر کے وہ گھوڑے کو چمکار لیتا ہے، اسے تو صرف یہ دیکھنا تھا کہ گھوڑا کتنے پانی میں ہے۔ ڈلکی ایسی چلتا ہے کہ معلوم ہو جیسے چاندی کے ورق کٹ رہے ہوں، وہی لے اور وہی بول ہیں، چاہے کہہ کے دیکھ لو

لب بھر آٹا، مٹھی چنے، ٹکڑا روٹی، گڑ کی ڈلی

لب بھر آٹا، مٹھی چنے، ٹکڑا روٹی، گڑ کی ڈلی

کیوں ہے نا؟ لودلّی دروازہ آگیا، کوٹلے کی سڑک پر جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے تانگہ ہی تانگہ دکھائی دیتا ہے، یا پھر رہڑیوں کی بھرمار ہے جن میں شوقین بھرے ہیں، یہ رہڑیاں بھی تانگوں کی طرح سجی ہوئی ہیں۔ سوت کی موٹی موٹی گنگا جمنی راسیں ہیں، گھوڑے بھی خوب تیار ہیں اور ایسے چکنے کہ مکھی بیٹھے تو پھسل جائے۔ یہ شوقینوں کے جانور ہیں، ان کی کھلائی پلائی کا بھلا کیا مقابلہ؟ چاہے خود کھائیں یا نہ کھائیں مگر ان کو دودھ جلیبیاں ضرور ملتی ہیں، جبھی تو ذرا راسیں ڈھیلی چھوڑیں اور گھوڑوں نے ہوا

سے باتیں کیں۔ ذرا اس گھوڑے کو دیکھئے، راسیں کھنچی ہوئی ہیں اس لئے گردن کمان کئے سینہ کھولے، کلائیاں مارتا عجیب شان سے چلا آرہا ہے۔ اس کو پیچھے چھوڑا، اس سے آگے نکل گیا اور ابھی رہوال سے آگے نہیں بڑھا ہے۔

تانگے میں بیٹھے ہوئے ایک کرخندار نے جھرجھری لے کر کہا "ابے لے اپنے! وہ تو سب کو مارتا چلا آرہا ہے، اماں آکا دیکھ رہے ہو؟"

آکا تڑپ کر بولے "ابے او بھائی کیا سوچ رہا ہے؟ تانگہ نکال نا۔"

تانگے والے نے کہا "میاں چپکے بیٹھے رہو، کیا تو ائی آگئی۔" شابو سے بھی رہا نہ گیا، بولے "پیارے خون ہو جائیں گے یہیں جو یہ آگے نکل گیا، بڑی ہیٹی ہو جائے گی اپنی تو۔"

تانگے والا چمک کر بولا "اماں کیوں بے ناحق میرے جانور کو ہلکان کراتے ہو، جو ون نے آگے بڑھا لیا تو میری کیا ٹھو اتر جائے گی؟"

کرخندار سے ضبط نہ ہو سکا، کلّی نے گالی دے کر کہا "پیارے، مرا کیوں جا رہا ہے، لے تھام یہ روپیہ" یہ کہہ کر جیب میں سے ایک روپیہ نکال اس کے ہاتھ پر دھر دیا۔ اس نے روپیہ ڈب میں لگا کر کہا "اچھا یہ بات ہے؟ تو لو میں بھی دیکھوں کونسا مائی کا لال ہے، جو مجھ سے آگے نکل جائے۔"

یہ کہہ کر اس نے راسیں ڈھیلی چھوڑیں اور دو طرفہ گھوڑے کو چابک سے جھاڑ دیا، وہ کنوتیاں دبا شگام چلنے لگا، مگر رہڑی بھی بڑھتی چلی آرہی ہے تھی۔

ڈکارا نے بھی ایک روپیہ نکالا اور تانگے والے کے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا "یار ہو گا تو اس کو آگے نکلنے نہیں دے گا۔"

تانگے والے نے جواب دیا "اماں کیا رکھا ہے ان باتوں میں، جوتیاں لے لو ہاتھوں میں وکی تو جنتی پر طلاق جو اسے نکل جانے دے، میں بھی اسے آج ڈھاپلا کر لایا ہوں۔ ہاں بیٹا، شاباش۔" یہ کہہ کر ایک چابک چٹخا دیا اور تانگہ ایک جست کے ساتھ کہیں سے کہیں پہنچا۔ مگر وہ کمبخت رہڑی ہے کہ پھر بڑھی چلی آرہی ہے، اور کیا مجال جو رہوال میں ذرا فرق آیا ہو، اسی آن سے پھٹ پھٹ کرتا چلا آتا ہے۔ ببر کے تکئے سے نکل کر منکوں والے پیر تک ان کا تانگہ آگے ہی رہا، پرانے قلعے سے آگے بڑھتے ہی رہڑی نے ان پر بڑھنا شروع کر دیا، سڑک ذرا بہتر آئی تو رہڑی والے نے بھی ذرا سی ڈھیل دے کر اس کا سرا چھوا دیا۔ لو صاحب! وہ تو اندھی مینہ کی طرح دم کے دم میں سر پہ آپہونچا، اس

میں قصائیوں کی، من چلی ٹولی بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ بھی کرخنداروں سے کچھ کم نہیں تھے، ایک نے آوازہ کسا:

"ہٹالے آگے سے، ورنہ ٹکڑے اڑا دوں گا۔"

شابو بگھی، ڈکار اور بُرے حال سے بے حال ہوئے جا رہے ہیں اور وہ ہے کہ گھوڑے کو رہ رہ کر سُوڑ رہا ہے، مگر گھوڑا ابھی دوڑے تو کہاں تک دوڑے؟ سرپٹ تو چل رہا ہے، آخر کوئی حد بھی ہے؟

لو صاحب! وہ قصائیوں کی رہڑی تانگے کے برابر آ گئی، اس میں سے ایک شور اٹھا "بیری ہے بے بیری ہے۔ ابے تھو ہے بے"

دو ایک نے بیری بجا بھی دی۔ "ابے گدھا جوت رکھا ہے، ابے اسے تو گولی دکھاؤ" اور نہ جانے کیا کیا اول فول بکتے وہ اپنی رہڑی آگے نکال لے گئے، کرخندار کلس کر گالیاں ہی بکتے رہ گئے۔

تانگے اور رہڑیاں یونہی دوڑ لگاتی نیلی چھتری تک پہونچ گئیں، یہاں تک جنگل میں منگل ہو رہا ہے، آدھی دلی یہاں موجود ہے، دائیں ہاتھ کو مڑ کر سڑک حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کو چلی گئی ہے، بائیں ہاتھ کو مڑ کر ہمایوں کے مقبرے کو جاتی ہے، دائیں طرف سڑک کے دونوں جانب عارضی دکانیں لگ گئی ہیں۔ مغرب کا جھٹپٹا ہو چلا ہے۔ چراغ روشن ہوتے جا رہے ہیں۔ ان دکانوں اور تہ بازاری میں ہر نعمت موجود ہے۔ بیسیوں دکانیں بھٹیاروں اور نان بائیوں کی ہیں۔ میز کرسی کے ہوٹل ہیں اور چائے والے ہیں۔ سقے کٹورے بجا بجا کر پانی پلاتے پھرتے ہیں۔ گگو والا ایک بڑا سا حقہ اٹھائے ایک ایک کے آگے منہنال پیش کر رہا ہے۔ پینے والے دو چار کش لیتے ہیں اور پیسہ دو پیسہ دے جاتے ہیں۔ چرخی کا پنکھا چیخ چیخ کر پتہ دے رہا ہے کہ سیخ کے کباب یہاں تیار دھرے ہیں۔ دہی بڑے والے اپنے تگن سجائے بیٹھے ہیں۔ سفید سفید دہی لال اور ہری مرچیں کاٹ کر اس طرح چھڑکی ہیں کہ انہیں دیکھ کر جی للچانے لگتا ہے۔ گرما گرم پکوان جھپا جھپ اتر رہا ہے۔ تیل کی پکوریاں منوں سے اُتر رہی ہیں اور پیاروں کے پیٹ میں جا رہی ہیں۔ ان کا مزہ گرم گرم ہی کا ہے، آلو کی ترکاری کے ساتھ چاہے جتنی کھا جائیے اس وقت کچھ نہیں معلوم ہوتا، بعد کا خدا حافظ۔ پراٹھے والے یوں تو سیکڑوں ہیں مگر پشاوری کی دکان پر وہ بھیڑ ہے کہ وار ہی نہیں آتا۔ اس کے پراٹھے کا ایک ایک پرت سنکا ہوا ہے۔ کیا مجال جو کہیں سے بھی کچا ہو۔ سیخ کے کباب اور حلوہ بھی اس کے ہاں کا تحفہ ہوتا ہے۔ دلی والے گھر سے توشہ باندھ کر تو چلتے نہیں، سب یہیں آ کر کھاتے ہیں بلکہ پہلے کھانے سے فارغ

ہو لیتے ہیں تب کہیں درگاہ میں داخل ہوتے ہیں۔

سلطان جی کی درگاہ تک دورویہ دکانوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ یہاں میٹھی کھیلوں اور پھول والوں کی دکانیں زیادہ ہیں، جو بھی درگاہ میں داخل ہوتا ہے پہلے کھیلوں کا پُڑا اور پھولوں کا دونہ بنواتا ہے۔ دروازے پر دونوں طرف سے دربان بیٹھے ہیں۔ یہ اصل میں دربان نہیں ہیں کفش بردار ہیں جو اپنے آپ کو صاحبزدگان یعنی سلطان جی کی اولاد میں ظاہر کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دروازے پر جوتیوں کی حفاظت کے لئے ایک فقیر مقرر ہوتا تھا۔ خواجہ حسن نظامی نے بتایا کہ "میرے پاس ڈیڑھ دو سو برس تک کی بعض پرانی رسیدات ایسی موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے زمانے میں جوتیوں کے محافظ کو باقاعدہ تنخواہ ملا کرتی تھی اور اس کو "چرن بردار" کہتے تھے۔ آج کل تنخواہ نہیں ملتی۔ زائرین خود اپنی اپنی جوتیوں کی حفاظت کا معاوضہ دیتے ہیں۔ صاحبزادگان میں سے صرف ایک آدمی اپنے بچپن میں کچھ دن یہاں بیٹھے ہیں۔ یعنی میرے والد حضرت خواجہ حسن نظامی میرے دادا نے ان کو مرتے وقت وصیت کی تھی کہ "دوسرے پیرزادوں کی طرح تم درگاہ میں کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا اور خود اپنی محنت کی روٹی کھانا۔" چنانچہ بچپن میں محنت کا اور کوئی ذریعہ نظر نہ آیا تو خواجہ صاحب نے جوتیوں کی حفاظت کے لئے فقیر کی جگہ بیٹھنا شروع کر دیا تاکہ والد کی وصیت کے مطابق محنت کی روٹی ملے اور بزرگوں کے نام کو بھیک کا دھبہ نہ لگے۔ یہ وقعہ خواجہ صاحب نے تفصیل سے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے۔ متعلقین درگاہ کی گزراوقات نذرونیاز پر ہوتی ہے۔ ابتداء میں تو یہ طریقہ تھا کہ سب خانقاہ والے درس وتدریس اور مشن کے کام میں مشغول رہتے تھے اور بے مانگے اور بغیر کسی خواہش کے کوئی کچھ دے جاتا تھا تو قبول کر لیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ حالت بگڑتی گئی اور موجودہ حالات یہ ہیں کہ ہر روایت اور خودداری کے ہر طریقے کو ترک کر کے دستِ سوال دراز کیا جاتا ہے۔ حضرت سلطان جی نے تو شادی ہی نہیں فرمائی تھی۔ البتہ متعلقین درگاہ خود کو حضرت کا خواہرزادہ کہتے ہیں۔"

ہاں تو یہ چرن بردار زائرین کی جوتیوں کے جوڑے سُتلی سے باندھ باندھ کر رکھتے جاتے ہیں اور روپے برابر دو ٹین کے گول ٹکڑے نکال کر ایک ٹکڑے کو جوتیوں میں رکھ دیتے ہیں اور دوسرا بطور رسید زائر کو دے دیتے ہیں۔ جب آپ واپس آئیں تو ایک آنہ دے کر اپنی جوتیاں ان سے واپس لے سکتے ہیں۔ ایک ایک آنہ کر کے ان کے پاس سینکڑوں روپے آجاتے ہیں۔ ان کے پورے پورے کنبے اسی پر پلتے ہیں۔ کیوں نہ ہو صاحب! سب آپ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔

خلقت کی وہ ریل پیل ہے کہ سلطان جی کی درگاہ کے دروازے میں سے داخل ہو کر آگے بڑھنا مشکل ہے۔ ایک سیلاب ہے کہ اندر سے باہر آرہا ہے۔ وہ دھکا پیل ہو رہی ہے کہ الٰہی توبہ!

''اماں ذرا تو ٹھہرو بندہ اللہ کے، ایکساں دھکا دیئے جاتے ہو۔''

''بھئی میں کیا کروں؟ پیچھے سے ریلا آرہا ہے۔ بہتیرا تو روک رہا ہوں۔''

کمزور کی شامت ہے، پسا جا رہا ہے، دم گھٹا جاتا ہے، مگر شوق ہے کہ کشاں کشاں لئے جاتا ہے۔ اِدھر اُدھر حجروں میں صوفی صافی قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ کوئی اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو توجہ دے رہا ہے، کوئی ہو حق کر رہا ہے۔ ایک صاحب ''اللہ ہو'' کی ضربیں لگا رہے ہیں۔ کہیں کسی حجرے میں قوالی کی محفل بھی جم رہی ہے۔

لیجئے! یہ کھلی کھلی سی جگہ کیا آگئی۔

اماں یہ میدان نہیں ہے، باؤلی ہے باؤلی۔ جس کے بارے میں ایک روایت مشہور ہے۔ حضرت نے جب اس باؤلی کو بنوایا تو مزدور دن رات کام کرتے تھے۔ بادشاہ وقت حضور سے ناراض ہوگیا تھا۔ اس نے ان کا تیل بند کر دیا تاکہ کام میں خلل پڑے۔ مگر کہیں اللہ کے پیارے بندوں کے کام رکا کرتے ہیں؟ حضور نے فرمایا کہ اس باؤلی کا پانی چراغوں میں جلاؤ۔ اللہ کی شان، پانی تیل کی طرح جلنے لگا اور کام دن رات ہونے لگا۔

جس کسی کو بھی ذرا سا تیرنا آتا ہے وہ اس باؤلی میں ضرور نہاتا ہے۔ اور گنبد پر سے اس میں کودتے ہیں۔ تیراک دنادن دنادن ایک کے پیچھے ایک کودے چلے جاتے ہیں۔ سیدھی کدائی کا عام رواج ہے مگر مچھلی لگانے والے بھی کچھ کم نہیں ہے۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر سر کے بل ایسی مچھلی لگاتے ہیں کہ جیسے کمان سے تیر چھوٹے۔ پانی میں پہونچنے کے بعد سب کو اپنے اپنے ہنر دکھانے کی سوجھتی ہے۔ کوئی چت لگا رہا ہے کوئی پٹ، کسی نے کھڑی لگائی تو ایسی کہ ناف تک پانی سے ابھر آیا۔ کوئی مردے کی تیرائی تیر رہا ہے کوئی شیر کی۔ جو اناڑی ہیں وہ کتے کی تیرائی ہی میں خوش ہیں۔ غوطے لگائے جا رہے ہیں۔ اوروں کی دیکھا دیکھی یار لوگ انجان پنے میں کود پڑتے ہیں اور جب ڈبکیاں کھانے لگتے ہیں ایک بلو مچ جاتا ہے۔ کوئی تیراک لپک کر ان کے پاس پہونچتا ہے اور ان کی ناک پر ٹکر مار کر انہیں بے ہوش کر دیتا ہے اور پھر اطمنان سے سیڑھیوں پر پہونچا دیتا ہے۔ جو وہ ٹکر نہ مارے تو ڈوبنے والا گھبرا کر ان کی کوکھی بھرے اور انہیں بھی اپنے ساتھ تہہ میں لے جائے۔

خیر انہیں تو یہیں چھوڑیئے اور بائیں ہاتھ کے گلیارے سے ہو کر آگے بڑھئے۔ آگے چل کر ایک لمبا سا چھتا پڑتا ہے، اس میں چلئے، یہ پہلے دائیں کو مڑیگا اور پھر بائیں کو۔ بڑی پرانی پرانی قبریں راستے میں پڑتی ہیں ان میں سے راستہ ہو کر ایک دروازے پر پہونچتا ہے۔ یہ اصل درگاہ کا دروازہ ہے۔ درگاہ میں ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہیں۔ چپہ چپہ بھر زمین دو دو تین تین دن پہلے سے آکر زائرین نے روک لی ہے۔ صحن میں خلقت بھری پڑی ہے۔ بیچ میں درگاہ ہے جس پر نور برستا ہے۔ بائیں ہاتھ کو سنگ مرمر کے حجرے ہیں۔ ان میں عورتوں نے چھاؤنی چھائی ہے۔ اس طرف قبریں ہی قبریں ہیں مگر آج مردوں کی بستی میں زندہ بھی آباد ہو گئے ہیں۔ دائیں طرف مسجد ہے جو سلطان جی کے وصال کے بعد بنائی گئی ہے۔ حضرت یہاں سے خاصے فاصلے پر رہا کرتے تھے۔ مقبرۂ ہمایوں کے گوشہ مشرق و شمال میں حضرت کی خانقاہ کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں۔ اس خانقاہ میں کتب خانے کے برابر جس میں حضرت کا وصال ہوا تھا وہ چھوٹا سا حجرہ صحیح سالم ہے۔ جس کو حضرت کا چلہ یا عبادت گاہ کہا جاتا ہے۔ موجودہ درگاہ کے قریب حضرت نے اپنی زندگی میں چبوترے بنوائے تھے جن کو "چبوترۂ یاراں کہا جاتا ہے۔ یہ گویا قبرستان تھا جہاں حضرت کے مرید اور اقرباء و احباب دفن کیے جاتے تھے۔ حضرت بھی کبھی کبھی یہاں فاتحہ پڑھنے تشریف لایا کرتے تھے۔ اس بات کو دیکھ کر عقیدت مندوں نے حضرت کے مدفن کے لئے یہاں عمارتیں بنانی شروع کر دیں۔ چنانچہ روایت ہے کہ موجودہ مسجد کا گنبد بھی اسی مقصد کے لئے تعمیر ہوا تھا۔ جب حضرت کا آخری وقت آیا تو لوگوں نے پوچھا کہ "آپ کے واسطے متعدد عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں، آپ ان میں سے کس میں آرام کرنا پسند فرمائیں گے؟"

حضرت نے جواب دیا کہ میں ان میں سے کسی عمارت میں دفن ہونا نہیں چاہتا ہوں مجھے آسمان کا گنبد کافی ہے" چنانچہ یہ گنبد مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ حضرت کا روضہ بعد کی تعمیر ہے۔ اور موجودہ بست دری تو شاہجہاں کے زمانے میں جا کر بنی تھی۔

روضے کے جنوب میں بڑی خوشنما سنگ مرمر کی جالیاں ہیں۔ ان میں سے جھانک کر اندر دیکھئے تو سنگ مرمر کی قبریں دکھائی دیتی ہیں یہ جو سامنے قبر ہے محمد شاہ بادشاہ دہلی کی ہے۔ یہ وہی محمد شاہ ہیں جو "رنگیلے پیا" کہلاتے ہیں، اور جن کی رنگ رلیاں یہ رنگ لائیں کہ دلی کی گلیوں میں نادر شاہ نے تخنوں تخنوں خون کی ندیاں بہادیں۔ ان کے حجرے کے پہلو میں سے ایک راستہ اور اندر کو گیا ہے۔ دو تین سیڑھیاں چڑھ کر اس میں داخل ہونے پر کھلی کھلی سی جگہ آجاتی ہے جس میں چند قبریں ہیں۔ دائیں پہلو

میں ایک بڑی خوشنما درگاہ ہے جس پر چھاجوں نور برس رہا ہے۔زائرین کا تانتا بندھا ہوا ہے۔آپ سمجھے بھی یہ کن بزرگ کا مزار ہے؟ جی صاحب، یہ حضرت امیر خسروؒ کی درگاہ ہے۔ محبوب الٰہی کے محبوب مرید کی۔ پہلے ان کے مزار پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے، پھر سلطان جی کے مزار پر۔قوالوں کی ایک ٹولی حضرت ہی کی ایک غزل گا رہی ہے۔

بخوبی ہمچومہ تابندہ باشی

بہ ملک دلبری پائندہ باشی

سہانا سماں، شہانے کی دھن، بھیری آوازیں، ڈھولک کی تھاپ پر جب الفاظ کی تکرار ہوتی ہے تو دل رقص کرنے لگتا ہے اور روح کو وجد آنے لگتا ہے۔ جو لوگ بیٹھے سن رہے ہیں ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو جھوم نہ رہا ہو۔ واہ واہ سبحان اللہ کا شور برپا ہے جب اس شعر پر قوال پہونچتے ہیں۔

من درویش را کشتی بہ غمزہ

کرم کردی الٰہی زندہ باشی

تو محفل تڑپ اٹھتی ہے اور روپیہ برسنے لگتا ہے۔ لو وہ ایک صاحب کو حرارہ آ گیا۔ اللہ کا نعرہ مار کر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ قوالوں نے شعر کی تکرار شروع کر دی۔ ان صاحب پر کیفیت طاری ہو گئی۔ اب انہوں نے حال کھیلنا شروع کر دیا۔ آہ سرد اور نالۂ گرم کی حدود سے متجاوز ہو کر انہوں نے تو چیخیں مارنی شروع کر دیں، قوال دوسرے مصرع پر جاتے ہیں تو یہ نعرہ لگاتے ہیں ''من درویش را کشتی بہ غمزہ'' اور قوال پھر مصرع اولیٰ کی تکرار کرنے لگتے ہیں تو یہ اس زور زور سے پاؤں پٹختے ہیں کہ زمین دہل دہل جاتی ہے پھر جب مصرع ثانی شروع ہوتا ہے تو یہ صاحب ''یا خواجہ'' کہہ کر اپنے گریباں کو ایک ہی جھٹکے میں اس طرح چاک کر دیتے ہیں کہ دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں کوئی فاصلہ نہیں رہتا اس کے بعد ان پر مجذوبی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور تڑپ کر سنگین فرش پر دھائیں سے گر پڑتے ہیں اور لوٹ لگائی شروع کر دیتے ہیں۔ جو لوگ حلقہ بنائے کھڑے ہیں کائی کی طرح پھٹ جاتے ہیں اور حلقہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ قوالوں کی شامت آ گئی ہے، بیچارے کھڑے ہو کر مصرعوں کی تکرار کر رہے ہیں۔ جب لوٹ لگا کر یہ صاحب تھک گئے تو انہوں نے فرش پر دھا دھم اپنا سر پھوڑنا شروع کر دیا۔ کسی نے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ کسی نے تکیہ پھینکا کہ فرش پر رکھ دیا جائے۔ اب انہوں نے اور بھی زوروں سے اپنا سر پٹخنا شروع کر دیا استاد شابو نے رفو سے کہا ''ابے دیکھ رہا

ہے کس طریوں تکیہ پر جانچ کر سر مار دیا ہے؟" رفو نے کہا "ہماوا ہے استاد بتاوا" "کچھ کرو، اب کے وہ ٹکر لے تو اس کا تکیہ کھینچ لو۔ اس کا سارا حال وال غائب ہو جائے گا" استاد شابو کے سمجھ میں یہ بات آ گئی" اماں ہاں اور نہیں تو اتنی دیر ہو گئی اور میاں جی ہیں کہ اپنے اوسانوں ہی میں نہیں آتے" استاد چپکے سے کھسک کر قریب پہونچے اور ہمدردی میں ہر ٹکر پر تکیہ سامنے ڈالنے لگے۔ اور ایک دفعہ جو اس نے خوب جی جان سے الا اللہ کہہ کر ٹکر دکھائی تو استاد نے جھٹ تکیہ کھینچ لیا۔ ایک دھماکہ ہوا اور جل ٹھنڈے ہو گئے۔ وہ تو لمبا لمبا لیٹ گیا۔ استاد نے موقع کی نزاکت کو محسوس کیا اور رفو کو آنکھ مار کے چپکے سے رفو چکر ہو گئے۔ اس غریب کی بھوؤں پھٹ گئی اور خون کی تلی بندھ گئی۔

محبوب الٰہی کی درگاہ کے سامنے صحن میں اتنی بھیڑ ہے کہ تل دھرنے کی جگہ نہیں، جو بھی تھالی پھینکو تو سروں ہی سروں پر جائے۔ ڈھولک کی تھاپ سن کر اور بھی لوگ کھنچے چلے آ رہے ہیں، قوالوں کی چوکی ابھی بیٹھی ہے، اس کے سرچوکی استاد یعقوب خاں ہیں۔ نہ مونہہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، مارے بڑھاپے کے لیسی ہو رہے ہیں۔ ان کے ہمنوا بھی انہی کے لگ بھگ ہیں۔ کسی کے گلے میں لرزہ ہے تو کسی کے رعشہ مگر حضرت کے عرس میں قوالی انہی کی چوکی سے شروع ہوتی ہے، کیونکہ ان کے آباؤ اجداد سلطان جی کے حضوری قوال تھے۔ صامت قوال کے بارے میں روایت ہے کہ وہ گونگے تھے۔ حضرت نے اپنا لعاب دہن اپنی انگلی سے چٹا دیا اور صامت کا تن من روشن ہو گیا۔

صامتی از لب او جرعہ چشید

سالہا در خمار خواہد بود!

یہ بڑے میاں اپنے کو صامت قوال کی ولاد میں بتاتے ہیں۔ انہیں درگاہ سے نیگ کا سوا روپیہ ملتا ہے مگر یہ سوا روپیہ ان کے لئے سوا لاکھ روپے سے زیادہ ہے۔ استاد بائیں ہاتھ سے ہارمونیم بجاتے ہیں اور باجے پر سپاٹے سے جب اپنا دست شفقت پھیرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے انہوں نے باجے کی گدی ناپ دی۔ اللہ ہو کا نغمہ بجانے کے بعد انہوں نے رنگ شروع کر دیا۔ رنگ میں سبھی ٹولیاں شریک ہو گئیں۔

آج رنگ ہے اے ماں رنگ ہے ری

میرے محبوب کے گھر رنگ ہے ری

رنگ سے کچھ ایسا سماں بندھا ہے کہ لوگ زار و قطار رو رہے ہیں۔ گانے کی دھن ہی کچھ ایسی

ہے کہ دلوں کو برما رہی ہے۔ بوڑھی کانپتی ہوئی آوازیں سن کر تھرتھرا اٹھتے ہیں اور بے اختیار آنسوؤں کی لڑیاں بندھ جاتی ہیں۔

سبحان اللہ استاد کیا کہنے۔ یہ سوز اللہ کی دین ہے۔ آپ کے بعد یہ بات کسی کو نصیب نہیں ہوگی۔"

استاد نے کھڑے ہو کر تین سلام جھکائے۔ اور ہاتھ باندھ کر عرض کیا" میاں یہ اسی آستانے کا فیض ہے اور آپ کا حسن سماعت ہے، ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا؟"

استاد شابو نے کہا" میاں استاد، تمہارا دم بھی غنیمت ہے۔ یہ تمہاری لائق مندی ہے۔ مر جاؤ گے تو یاد کرو گے۔" یہ کہہ کر ایک روپیہ استاد کی نذر کیا۔

لو صاحب، اب یہاں سے باہر چلو۔ یہاں تو دم گھٹا جا رہا ہے۔ گھمس بھی آج غضب کی ہے۔ عرس تو ساری رات جاری رہے گا۔ ایسا ہی ہے تو پھر واپس آجائیں گے۔

درگاہ کے آس پاس بیسیوں پرانی عمارتیں ہیں جن میں قبریں ہیں۔ کھلے میدان میں گھاس کے بڑے بڑے تختے ہیں اور آگے بڑھ جاؤ تو ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ کسی نے رات کہیں کاٹی کسی نے کہیں، کسی نے رات بھر درگاہ میں قوالی سنی۔ دور دور سے چھکیاں آئی ہوئی ہیں۔ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی، لیجیے فجر کا وقت ہو گیا۔ قوالی ملتوی ہوگئی، موذن نے اذان دی۔ بھلے مانسوں نے نماز پڑھی، باقی ادھر ادھر ٹہل گئے۔

لنگر خانے سے لنگر برابر جاری ہے۔ خمیری روٹیاں اور چنے کی دال جس کا جی چاہے جا کر لے لے۔ اس دال روٹی میں وہ مزہ ہے کہ دنیا کی نعمت میں نہیں۔ لاکھوں آدمی کھاتا ہے اور برکت کا یہ حال ہے کہ گھٹنے کا تو ذکر ہی کیا اس لنگر میں کمی بھی آتی دکھائی نہیں دیتی۔

اٹھارویں کو پھر اڈ میلہ ہوتا ہے۔ درگاہ میں پہلے ختم پڑھا جاتا ہے اور قوالی پھر شروع ہو جاتی ہے۔ یہی سلسلہ کل اور پرسوں بھی جاری رہے گا۔ زائرین آتے جاتے رہیں گے۔

آج تو ہمایوں کے مقبرے میں بہار آرہی ہے، لوگوں نے اس مقبرے کو سیر و تفریح کے لئے منتخب کیا ہے، اس کے چپے چپے پر ٹولیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ کہیں گراموفون ریکارڈوں کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ لال قند کے غلاف کیکڑی کناو کے کام سے لپے ہوئے مشینوں پر سے اتارے گئے۔ ایک ٹولی نے ادھر سے ایک ریکارڈ بجایا۔ اس کے ختم ہوتے ہی مقابلے کی ٹولی نے جواب میں اپنا ریکارڈ سنایا۔

لیجئے یہ تو باقاعدہ میچ ہو رہا ہے۔ چاندی کے کپ رکھے گئے ہیں، اس میچ میں بارہ مشینیں شریک ہوئی ہیں کہیں چوبیس گھنٹے میں جا کر یہ میچ ختم ہوگا۔ پھر جج صاحبان اپنا فیصلہ سنائیں گے اور انعامات دیئے جائیں گے۔

وہ سامنے دیکھئے پتنگ بازی کا مقابلہ ہو رہا ہے، آج بڑے بڑے استادوں کے ہاتھ لگے ہوئے ہیں، شاگردوں نے اپنی اپنی پتنگیں چڑھائیں جب ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو ریلوں پر پہونچ گئیں تو موتھ مل گئے، کوئی ڈھیل دے کر کاٹتا ہے کوئی کھنچائی کر کے، مانجھے سے مانجھا ملتے ہی استادوں نے بچی اپنی پتنگ کی ڈور سنبھال لی۔ سیروں سے ڈور پلائی جا چکی ہے اور پتنگیں تارہ ہو گئی ہیں، مگر انہیں تو ڈور پلائی جا چکی ہے اوپر والے کل چڑے نے غوطہ مارا۔ ادھر سے پری بھی سینہ تان کر اوپر کو اٹھی۔ چشم زدن میں "وہ کاٹا، وہ کاٹا" کا شور مچ گیا۔ جس کی پتنگ کٹ گئی اس نے ہاتھ پر سے ڈور توڑ دی۔ لونڈوں نے ڈور لوٹنی شروع کر دی۔

جیتنے والے کے وارے نیارے ہو گئے۔

ایک طرف ہیجڑوں نے اپنا پھڑ جما رکھا ہے۔ دلی والے انہیں "جنت کی چڑیاں" کہتے ہیں، ان سے ٹھٹھول کرتے ہیں اور ان کی بولی ٹھولی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ پھٹے بانس کی سی آوازیں، مردوں سے بھی بڑے ہاڑ۔ زنانے کپڑے پہنے چوٹی کنگھی کیے ہاتھوں میں مہندی، آنکھوں میں کاجل، سولہ سنگھار کیے مٹک مٹک کر گاتے اور ناچتے ہیں۔

استاد شبو نے کہا "کولھے سے ہوگی بے، کولھے سے۔"

لو صاحب اس نے بھی:

سر دتا کہاں بھول آئی پیارے نندوئیا

کا بول ختم کرتے ہی کولھوں پر ہاتھ رکھے۔ پہلے اکہرا کولھا لگایا اور پھر دوہرا کولھا اس طرح لگایا کہ اس کے ساتھ چکر بھی پورا ہو گیا۔ کرخندار اس ادا پر لوٹ گئے۔ چوتی اس انداز سے اٹھانے لگا کہ استاد ریشہ خطمی ہو گئے بولے "اگر چہ کہ۔" مگر بوا شہزادی نے تالیاں پٹخار کر کہا۔

اگر چہ کی روٹی مگر چہ کی دال
چنانچہ کی چٹنی بڑی مزے دار

یہ کہہ کر استاد کی انگلی مروڑی اور چوتی لے کر چلتا بنا۔ استاد کی ساری شیخی دھری کی دھری رہ گئی۔

''یہاں تو یہ چیخ اور بے ہودگی ہو رہی ہے، دیکھیں وہ مجمع کیسا ہے؟ آہاہاہا! یہ ہے شوقینوں کی ٹولی۔ بڑا سا گھیرا بنا ہے، سب سلیقے سے بیٹھے ہیں، پان سگریٹ سے تواضع ہو رہی ہے، بی چھمیا تھئی تھئی ناچ رہی ہیں۔ طبلے والے نے پیشکار شروع کیا اور چھمیا نے گت بھری۔ توڑا کہتے ہی انہوں نے پاؤں سے تاتھئی تت تت کہہ کر گھنگھروؤں کا توڑا کہا۔ ادھر طبلے کا چکر دار تیا آیا ادھر بی چھمیا کے بھی چک پھیری کھا کھا کر تین سلام ہو گئے سب نے کہا ''واہ واہ کیا کہنا'' اب ان کے تین بھاؤ شروع ہو گئے اور ہاتھ سانپوں کی طرح لہرانے لگے۔ سینے کا زیر و بم قیامت ڈھانے لگا۔ بی چھمیا تو خود قد آدم قیامت ہیں، ان کی ایک ایک ادا پر واہ واہ سبحان اللہ کا شور برپا ہو رہا ہے۔ ستھری مجلس ہے اس لئے بیہودگی نہیں ہونے پاتی، تماشائیوں میں سے بھی کیا مجال جو کوئی آوازہ کس دے۔ دِلّی کی ڈیرہ دار ہے، ویسے بھی عزت دار ہے۔

کہیں کبڈی کے پالے جم رہے ہیں، کہیں جھولوں کی پینگیں بڑھ رہی ہیں، کہیں تاش ہے کہیں چوسر، کہیں کہیں گنجفہ بھی کھیلا جا رہا ہے، اگلے وقت کے لوگوں ہی میں اب اس کے کھیلنے والے رہ گئے ہیں، ہماری سمجھ میں تو اس کی بازی خاک نہیں آتی۔ شطرنج کی بساطیں بھی کئی جگہ بچھی ہوئی ہے۔ حکیم جی کی چال بہت اچھی ہے، کئی کئی چالیں آگے کی سوچ لیتے ہیں اور مدمقابل کو مات کا سان گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ مہرے ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں'' لو میاں دوسری بچھاؤ'' اور واقع میں ایسا رخ کرتے ہیں کہ اپنی مرضی کی چال چلواتے ہیں اور دس بارہ چالوں میں شہ مات ہو جاتی ہے۔ صاحب ان کا کیا کہنا، یہ تو غائب بھی الیی ہی کھیلتے ہیں۔ ان کی جوڑ توڑ بس مرزا بکرے ہی سے اچھی پھنستی ہے، صاحب عالم پان چباتے جاتے ہیں اور ان کی بکرے کی طرح داڑھی ہلتی رہتی ہے۔ یوں ان کا نام مرزا بکرے پڑ گیا ہے۔

لیجئے اب دونوں وقت ملتے ہیں۔ دِلّی والے اب واپس کھسکنے شروع ہو گئے ہیں۔ میلے کی رونق اب گھٹنے لگی، اب ہمیں بھی گھر چلنا چاہئے۔ تین دن کی سیر سے تھک کر چور ہو رہے ہیں۔ آنکھوں میں ریتا سا بھر رہا ہے، گھر پہونچیں، نہائیں، دھوئیں، کھانا کھائیں اور خوب ٹانگیں پسار کر سوئیں۔

OOO

راگ رنگ کی ایک رات

دہلی میں یوں تو بے شمار موسیقار تھے مگر گانے والوں میں مظفر خاں، چاند خاں اور رمضان خاں۔ سارنگی نوازوں میں ممن خاں اور بندو خاں۔ ستار بجانے والوں میں برکت اللہ خاں۔ تال کے سازوں میں اللہ دیئے خاں پکھاوجی اور نتھو خاں طبلہ نواز پورے ہندوستان میں منفرد سمجھے جاتے تھے۔ ان سب فنکاروں کا تعلق دیسی ریاستوں سے تھا کیونکہ دلی کی بادشاہی ختم ہو جانے کے بعد فرنگیوں نے اہل ہنر کی قدر نہ کی۔ روزی کے مارے سارے فنکاروں کو ریاستوں ہی میں آسرا ملا۔ شاہی زمانہ میں ان کی بڑی بڑی جاگیریں تھیں جو ۱۸۵۷ کے ہنگامے میں تلپٹ ہو گئیں۔ یہ تو اب آخر میں فنکار ناقدری کی وجہ سے گرتے گرتے اتنے پست ہو گئے تھے کہ ان میں سے اکثر کو نان شبینہ بھی میسر نہ ہوتی تھی ورنہ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانے میں نعمت خاں (سدا رنگ) کی یہ کیفیت تھی کہ وہ سوائے بادشاہ کے کسی اور کے ہاں گانے نہیں جاتا تھا۔ خود اس کے گھر میں روزانہ محفل ہوتی تھی بلکہ موسیقی کا دربار بجتا تھا۔ دربار اکبری کے نورتنوں میں تان سین نے تو وہ عروج پایا کہ ان کا نام ضرب المثل بن گیا۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے درباری گائیک تان رس خاں کو گاؤں گراؤں انعام میں ملے ہوئے تھے۔ دلی میں چتلی قبر سے آگے دائیں ہاتھ کو گلی تان رس خاں اب بھی موجود ہے۔ جس میں تان رس خاں کی عظیم الشان حویلی آج بھی اپنی عظمت رفتہ پر کھڑی آنسو بہا رہی ہے۔

۱۹۴۷ء کے وسط میں جب چھرے گھونپے جا رہے تھے اور شام کے چھ بجے سے صبح کے چھ بجے تک کرفیو لگ رہا تھا، دلی کے دو چار منچلوں کو سوجھی کہ ایک ایسا جلسہ تان رس خاں کی حویلی میں ہو جائے جس میں تمام اہل کمال اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر شریک ہوں۔ دلی کے ایک رئیس زادے تھے جنہوں نے اس فن میں اتنا درک حاصل کر لیا تھا کہ تمام کام کرنے والوں نے انہیں

گئی مان لیا تھا۔ خوش اخلاق آدمی تھے اس لئے ان کی ڈیوڑھی گانے بجانے والوں کا مرکز بن گئی تھی۔ انہی کی کوششوں سے ان لوگوں کے اختلافات بہت کچھ دور ہو گئے تھے اور ان میں یک جہتی پیدا ہو گئی تھی۔ یا تو ایک کو ایک کھائے جا رہا تھا یا یہ صورت ہوئی کہ شیر بکری ایک گھاٹ پانی پینے لگے تھے۔ انہی رئیس زادے کی یہ تجویز تھی اور یہی صاحب سب کو نیوتا دیتے پھرے، اور ایک شام کو کوئی دو سو نامی گرامی گا یک اور بجا یک چھ بجے سے پہلے پہلے تان رس خاں کی حویلی میں جمع ہو گئے۔ صدر دالان میں دری چاندنی کا فرش لگا ہوا تھا۔ دو چار بڑے بوڑھے مہمانوں کی پذیرائی کر کے انہیں حسب مراتب بٹھاتے گئے۔ پس دالان اور پیش دالان دونوں بھر گئے۔ صحن میں دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ پخت وپز کے نگراں استاد عمری رکاب دار تھے جو دور دور براتوں میں کھانا پکانے کے لئے بلائے جاتے تھے۔ یہ دلی کے اسی علاقے کے رہنے والے تھے اس لئے انہوں نے اپنی خدمت مفت پیش کی تھیں۔ چھ بجے کے بعد نہ تو کوئی اندر آسکتا تھا اور نہ اندر سے باہر ہی کوئی جا سکتا تھا۔ لہذا دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ جلسہ شروع ہوا۔ پان، سگریٹ، حقہ اور برف کے پانی سے تواضع ہوتی رہی۔ بھائی چارے کا وہ اثر تھا کہ کوئی شخص دوسرے کو بھائی کا سابقہ یا لاحقہ لگائے بغیر مخاطب نہ کرتا تھا۔ اس جلسہ کا تفصیلی بیان باعث طوالت ہوگا اس لئے اختصار کے ساتھ عرض کرتا ہوں:

کھانے سے پہلے سازوں کا پروگرام ہوا۔ ہونہار نو جوانوں نے اپنے اپنے گھروں کا باج طبلے پر سنایا۔ کسی نے قاعدہ کھولا۔ کسی نے ریلا پھینکا۔ کسی نے گت اور پرن سنائے۔ کسی نے تہائی اور چوپلی کا حساب کیا۔ اس کے بعد طے ہوا کہ کھانے سے فارغ ہو لیا جائے۔ دونوں دالانوں میں دستر خوان بچھ گئے، دوہرا کھانا چنا گیا۔ زردہ بریانی، قورمہ شیر مال۔ سب نے خوب سیر ہو کر کھایا۔

کھانے کے بعد آخر میں استادوں کی باری آئی۔ تبرکاً انہوں نے بھی علم سینہ کا مظاہرہ کیا۔ محفل میں کوڑھ ایک بھی نہیں تھا اس لئے سب خوب خوب اور باموقع داد ملی۔

آخر استاد گامی خاں جوڑی لیکر بیٹھے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ حاضرین تین گھنٹہ تک طبلہ سنتے سنتے اکتا چکے ہیں۔ لہذا انہوں نے باج کے ساتھ اس کا بیان شروع [illegible]۔ استاد گامی خاں کا رشتہ کئی پشت اوپر استاد مکھو خاں سے جا ملتا تھا۔ یہ مکھو خاں وہ تھے جو خواجہ میر درد کی ماہانہ محفلوں میں پکھاوج اور طبلہ بجایا کرتے تھے۔ استاد گامی خاں نے دلی کا خاص باج سنایا جسے ڈیہا کا باج [illegible]۔ پورب اور اجراڑے کے باج سے اس کا فرق بتایا، پھر اپنے پرکھوں کی گتیں سنائیں۔ جب مکھو خاں کا طبلہ سنانے پر آئے

تو ان سے منسوب ایک عجیب وغریب واقعہ بھی سنایا۔

"دادا مکھو شہزادوں کو تعلیم دینے لال قلعہ روزانہ بعد مغرب جایا کرتے تھے۔ ایک دن صاحب عالم کی ڈیوڑھی پر پہنچے تو دربان نے کہا "استاد توقف فرمایئے۔ صاحب عالم اپنے اگن کی چہکار سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ میں اطلاع کیے دیتا ہوں" دادا جی مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد طلبی ہوئی۔ صاحب عالم دالان میں فروکش تھے۔ دادا جی سات سلام کرتے آگے بڑھے، اگن کا پنجرا دالان کی بیچ کی محراب میں لٹکا ہوا تھا۔ نگاہ روبرو ہونے کی وجہ سے دادا جی نے دیکھا نہیں۔ آدمی تھے اونچے پورے قد کے۔ دالان میں جو داخل ہوئے تو شامت اعمال ان کا سر اگن کے پنجرے سے ٹکرا گیا۔ لو میاں اگن نے بولنا بند کر دیا۔ صاحب عالم کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ دادا جی کے ہوش اڑ گئے۔ ہاتھ جوڑ کر بولے "خطا معاف، خانہ زاد نے دیکھا نہیں۔" صاحب عالم نے برہمی سے کہا "استاد تمہاری ٹکر سے جانور بھڑک کر خاموش ہو گیا۔ اب یہ نہیں بولے گا۔" دادا جی نے عرض کیا "حضور کے اقبال سے بولے گا۔" اگن نے چپ سادھ لی۔ صاحب عالم نے کہا "استاد اگر اگن نہ بولا تو آج تمہاری خیر نہیں۔"

دادا کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ خبر نہیں صاحب عالم ناراضگی میں کیا کر گزریں۔ ہوش وحواس قائم کر کے بولے "حضور کے اقبال سے ضرور بولے گا۔" یہ کہہ کر سامنے طبلے کی جوڑی اٹھائی اور محراب میں پنجرے کے نیچے بیٹھ کر ایک گت بجانی شروع کی۔ اللہ کی شان چند منٹ کے بعد اگن نے چہکنا شروع کر دیا اور جوں جوں گت کی لے بڑھتی جاتی تھی اگن کی چہکار تیز ہوتی جاتی تھی۔ صاحب عالم کی باچھیں کھل گئیں اور بولے "سبحان اللہ! استاد آج جیسا طبلہ ہم نے سنا، نہ کسی نے سنا اور نہ کوئی سنے گا۔" یہ کہہ کر آواز دی "ارے کوئی ہے؟" خدام دوڑ پڑے۔ فرمایا "استاد کے ہاتھ کچل دو۔" حکم حاکم مرگ مفاجات۔ دادا جی کے ہاتھ کچل کر بھرتہ کر دیئے گئے۔

دادا جی قلعہ سے افتاں وخیزاں اپنے گھر آئے۔ کس سے داد فریاد کرتے؟ زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ اسی عالم بیچارگی میں ڈولی میں پڑ کر اپنے پیر

ومرشد داتا لمن شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے کیفیت سنی اور حال دیکھا تو
ان کی آنکھوں سے جلال ٹپکنے لگا۔ اسی حالت جذب میں دادا جی کے دونوں ہاتھ اپنے
ہاتھوں میں لئے اور بولے "جا تو اچھا ہو جائے گا۔" ان کی دعا اور اللہ کے فضل سے دادا
جی کے ہاتھ کچھ عرصہ میں بالکل ٹھیک ہو گئے۔"

یہ واقعہ سنانے کے بعد استاد گامی خاں نے کہا "میرے بزرگوں سے یہ گت سینہ بہ سینہ مجھے
پہونچی ہے۔ آج یہاں سبھی گنی موجود ہیں۔ وہ گت سناتا ہوں۔"

یہ کہہ کر استاد نے گت شروع کی۔ پہلے آہستہ، پھر رفتہ رفتہ بڑھتی گئی اور سچ مچ یہ معلوم
ہونے لگا جیسے چڑیاں چہچہا رہی ہیں، سب نے کہا سبحان اللہ ماشاء اللہ بے شک یہ وہی گت ہو سکتی
ہے۔" رئیس زادہ نے کہا۔

بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

طوالت کے خیال سے اس جلسہ کی تفصیل کو چھوڑتا ہوں صرف ایک واقعہ ایسا اور ہے جس کا
بیان خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

استاد بندو خاں سارنگی نواز بھی یکتائے روزگار تھے۔ انہوں نے اپنے لئے
بانس کی ایک سارنگی بنائی تھی۔ یہ سارنگی جتنی چھوٹی تھی اتنی ہی اس کی آواز بڑی تھی۔ تار
اور طربیں ملا کر استاد بولے "آج میں بھی آپ حضرات کو ایک عجوبہ سناؤں گا۔" سب
متوجہ ہو گئے بولے آپ لوگوں نے دیپک راگ کا نام تو بہت سنا ہوگا۔ مگر کسی کو گاتے
بجاتے نہیں سنا ہوگا۔ میں آپ کو آج دیپک راگ سناؤں گا۔" استاد چاند خاں جو
موسیقی کے عالم بھی ہیں اور استاد بندو خاں کے ماموں زاد بھائی اور خلیفہ بھی ہیں تڑپ
کر بول اٹھے۔ "نہیں بھائی صاحب دیپک نہ بجایئے۔ کچھ اور بجا لیجئے" بندو خاں نے
مسکرا کر کہا "چاند خاں، ڈرو مت دیپک سے آگ نہیں لگے گی۔" چاند خاں صاحب
نے کہا "بھائی سنتے تو یہی چلے آئے ہیں کہ دیپک سے بجھے ہوئے چراغ جل اٹھتے
ہیں اور آگ لگ جاتی ہے۔ آگ لگ جانا کوئی اچھی بات تھوڑی ہے۔ اس لئے یہ
راگ متروک ہو چکا ہے۔ ہم اگر دیپک کی اس روایت کو نہ بھی مانیں تب بھی یہ تو مانتے
ہیں کہ دیپک منحوس راگ ہے۔ اس کے گانے بجانے سے ضرور کوئی نقصان پہونچ جاتا

ہے۔" بندو خاں صاحب نے کہا" چاند خاں، تم تو پنڈت ہو۔ کتابیں پڑھ پڑھ کر عجیب عجیب باتیں سناتے ہو۔" دو بڑے استادوں میں اختلاف کو بڑھتے دیکھ کر رئیس زادے نے کہا آپ دونوں حضرات صحیح فرما رہے ہیں۔ مگر ہمارے اعمال وافعال اس درجہ غلط ہو گئے ہیں کہ دعا میں بھی اثر نہیں رہا۔ دراصل دیپک شام کا ایک راگ ہے جو چراغ جلے گایا بجایا جاتا ہے اسی وجہ سے اس کا نام دیپک یا چراغ رکھا گیا۔ دیپک سے چراغ نہیں جلتے بلکہ چراغ جلتے ہیں تو دیپک گایا بجایا جاتا ہے۔ اب رہ گیا سعد ونحس کا معاملہ تو بعض وہمی باتیں بھی سچ ہو جایا کرتی ہیں۔"

یہ بات سب کی سمجھ میں آ گئی مگر چاند خاں صاحب دیپک کو منحوس ہی بتاتے رہے۔ بندو خاں صاحب نے کہا" اچھا سن تو لو آئندہ نہیں بجائیں گے۔" یہ کہہ کر انہوں نے دیپک شروع کر دیا۔ راگ میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی، سیدھا سادہ راگ تھا۔ خاں صاحب نے خوب جی لگا کر بجایا مگر جب تک بجاتے رہے خواہ مخواہ طبیعت مکدر رہی۔ شاید وہم اپنا کام کر گیا۔ انہوں نے اپنی سارنگی رکھی ہی تھی کہ صبح کی اذانیں ہونے لگیں۔ دلوں کا تکدر دور ہو

موذن مرحبا بر وقت بولا

تری آواز مکے اور مدینے

اذانیں ختم ہوئیں تو پھر سب ہنسنے بولنے لگے۔ چائے کا آخری دور چلا اور سب کی زبان پر یہی تھا کہ ایسا جلسہ دلّی میں کبھی بھی حاضرین کے ہوش میں نہیں ہوا۔ چھ بجے جب کرفیو ختم ہوا تو صحبت شب برخاست ہوئی اور سب اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔

دلّی میں فسادات بڑھتے ہی چلے گئے۔ ستمبر کے پہلے ہفتے میں دلّی میں آگ لگنی شروع ہوئی۔ مسلمان مارے جا رہے تھے اور ان کے گھر لٹ رہے تھے۔ قرول باغ ختم ہوا، سبزی منڈی ختم ہوئی۔ پہاڑ گنج ختم ہوا۔ آدھا شہر جل چکا تھا۔ شہر کے کئی لاکھ مسلمان پرانے قلعے اور ہمایوں کے مقبرے میں پڑے تھے۔ پرانی دلّی میں بھیرون ناچ رہا تھا۔ ہم سب بھی جان بچا کر کسی نہ کسی طرح پاکستان پہونچ گئے۔ بندو خان صاحب بھی لاہور پہونچے اور ایک سال کے بعد کراچی آ گئے۔ انہیں کوئی جگہ رہنے کی یہاں ڈھنگ کی نہیں ملی۔ ہار کر لالوکھیت کے ویرانے میں پڑے رہے۔ نہایت عسرت و تنگدستی میں

آخری عمر بسر ہوئی۔ چاند خاں صاحب دلّی ہی میں رہ گئے۔ اب بھی وہیں ہیں۔ سال بہ سال کے بعد ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں دلّی کا وہ آخری جلسہ یاد دلایا۔ خاں صاحب فقیر منش اور رقیق القلب آدمی ہیں، آبدیدہ ہو گئے۔ بولے "بھائی صاحب آپ نے دیکھ لی دیپک کی نحوست! دلّی کو لوٹا لگ گیا۔ ہم دلّی ہی میں ہیں مگر ہمارے دلوں میں فراق کی آگ لگی ہوئی ہے۔ یہ آگ آنسوؤں سے بھی نہیں بجھتی۔ ایک ایک کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں اور نظریں مایوس پلٹتی ہیں۔"

اور میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا واقعی ۱۹۴۷ء میں جو دلّی بھسم ہوگئی تو بقول چاند خاں صاحب کے راگ کی آگ میں جلی تھی؟ یا محض ایک سوءِ اتفاق تھا، دلّی کی قسمت ہی میں یہ لکھا ہے کہ جلتی بلتی رہے۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

OOO

دلّی کا آخری تاجدار

مرزا غالب نے کہا ہے ع

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے

یہی حال مغلیہ سلطنت کا بھی ہوا۔ آخری وقت کچھ اس طرح کا دھواں اٹھا کہ ساری محفل سیاہ پوش ہوگئی۔ یوں تو اورنگ زیب کے بعد ہی سے اس عظیم الشان مغلیہ سلطنت میں انحطاط کے آثار پیدا ہو چلے تھے لیکن ان کے بعد تو وہ افراتفری اور بیراکھیری پھیلی کہ بادشاہ صرف نام کے بادشاہ رہ گئے۔ محمد شاہ رنگیلے ''پیا'' کہلائے۔ ان کے عہد میں در و دیوار سے نغمے برستے اور شعر و شاعری کے اکھاڑے جمتے۔ نعمت خاں سدا رنگ انہی کے دربار کا بین کار اور کلاونت تھا جس نے دھرپد کے مقابلے میں خیال گائیکی کو فروغ دیا۔ آج تک گویئے اس کے نام پر کان پکڑتے ہیں۔ ولی اپنا دیوان لے کر انہی کے زمانے میں آئے تھے اور انہی کے دربار میں انہوں نے اپنے طالع چمکائے تھے۔ گھر گھر شعر اور موسیقی کا چرچا تھا۔ بادشاہ کو ڈوم ڈھاڑیوں نے باور کرا دیا تھا کہ آدمی تیر تلوار کا مارا بھی مرتا ہے اور تان تلوار کا بھی۔ لہٰذا ایک فوج گویّوں کی بھی تیار کر لی گئی تھی۔ ان رنگ رلیوں میں تلواریں لہو چاٹنا بھول گئیں اور نیاموں میں پڑے پڑے سو گئیں۔ نادر شاہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور قہر و غضب کی آندھی بن کر دتی کی طرف جھپٹا۔ پرچہ لگا کہ نادر شاہ دتی کے قریب آ پہونچا۔ گویّوں کی فوج مقابلے کے لئے بھیج دی گئی۔ نادر شاہ کے جانگلو محمد شاہی فوجیوں کی بغلوں میں بڑے بڑے طنبورے دیکھ کر پہلے تو ڈرے کہ خدا جانے یہ کیا ہتھیار ہے مگر جب جاسوسوں نے بھانڈا پھوڑا کہ یہ ہتھیار نہیں ایک ساز ہے تو دم کے دم میں انہوں نے محمد شاہی فوج کو کھیرے ککڑی کی طرح کاٹ کر ڈال دیا۔ نادر شاہ نے دھڑی کر کے دتی کو لوٹا اور دتی کھک ہوگئی۔ قتل عام کیا تو ایسا کہ گھوڑوں کے سم خون میں ڈوب گئے۔ آخر وزیر با تدبیر بوڑھے نظام الملک کو نادری جلال فرو کرنے کے لئے نادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنا پڑا کہ۔

گے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر تو زندہ کُنی خلق را و باز کشی

نادر شاہ لوٹ لاٹ کابل چلا گیا، اور اپنے ساتھ شاہ جہانی تخت طاؤس بھی لے گیا۔ شاہ عالم ثانی کی آنکھیں روہیلے نے نکالیں۔ بادشاہ آنکھوں کے ساتھ ساتھ عقل کے بھی اندھے ہو گئے۔ ان کے درباریوں نے انہیں یقین دلایا کہ حضور والا بیٹھے بیٹھے ایک دم سے غائب ہو جایا کرتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں دلی سے مکہ مدینہ پہونچ جاتے ہیں۔ اپلو! بادشاہ سلامت بھی یہ سمجھنے لگے کہ واقع میں مجھ میں یہ کرامت سما گئی ہے۔ پیری مریدی کرنے لگے اور مریدوں کے وظائف مقرر ہونے لگے۔ حکومت تباہ اور خزانے ویران ہو گئے۔ مثل مشہور ہوئی کہ "سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم۔" یعنی صرف چند میل کی بادشاہت رہ گئی۔ سودا نے اپنے شہر آشوب میں ان کے زمانے کا خاکہ اڑایا۔ اکبر بادشاہ ثانی جاٹوں کے حملے سے ایسے ناچار ہوئے کہ انگریزوں کے وظیفہ خوار ہو گئے۔ یہی لیل و نہار تھے کہ بہادر شاہ عالمِ وجود میں آئے۔ بہادر شاہ کی پوری جوانی اور ادھیڑ عمر تخت و تاج کی راہ تکتے بیت گئی۔ اکبر شاہ ثانی کی ایک بیگم تھیں ممتاز محل۔ ان بیگم کے ایک چہیتے بیٹے تھے مرزا جہانگیر۔ بادشاہ بھی انہیں بہت چاہتے تھے اور انہی کو ولی مقرر کرنا چاہتے تھے مگر مرزا جہانگیر اپنی بے ہودہ حرکتوں سے باز نہ آتے تھے۔ انگریز حاکم اعلیٰ اسٹین کو لولو کہہ دیا اور اس پر طمنچہ بھی چلا دیا۔ اس کی پاداش میں مرزا نظر بند کر کے الہ آباد بھیج دیے گئے۔ یہ ایک الگ قصہ ہے۔ ہاں تو بہادر شاہ ہی ولی عہد رہے اور ایک نہ دو پورے باسٹھ سال تک ولی عہد رہے۔ جب کسی بادشاہ کا انتقال ہو جاتا تھا تو اس کے مرنے کی خبر مشہور نہیں کرتے تھے۔ یہ بات کہی جانے لگی تھی کہ "تھی کا کپا سنڈھ گیا۔" خاموشی کے ساتھ میت کو نہلا دھلا کفنا کر قلعے کے طاقی دروازے سے جنازہ دفن کرنے بھیج دیا جاتا۔ نوبت نقارے اُلٹے کر دیے جاتے اور چولہوں پر سے کڑھائیاں اُتار دی جاتیں۔ اکبر شاہ ثانی کے وقت تک یہ رسم چلی آتی تھی کہ بادشاہ کے جنازے کو تخت کے آگے لا کے رکھتے۔ دوسرا بادشاہ جو کوئی ہوتا تھا مُردے کے منھ پر پاؤں رکھ کر تخت پر بیٹھتا تھا۔ دوسرے بادشاہ کے تخت پر بیٹھتے ہی شادیانے بجنے لگتے۔ سلامی کی توپیں چلنے لگتیں۔ تب کہیں سب کو معلوم ہوتا کہ بادشاہ مر گیا اور دوسرا بادشاہ تخت پر بیٹھ گیا۔

باسٹھ سال کی عمر میں بہادر شاہ کو تخت نصیب ہوا تھا تو مغلوں کا جلال رخصت ہو رہا تھا، اور آفتاب اقبال لب بام آ چکا تھا۔ بہادر شاہ کہنے کو تو بادشاہ تھے لیکن بالکل بے دست و پا تھے۔ فرنگی سرکار

کے نمک خوار تھے۔ انہیں اس شرط پر ایک لاکھ روپیہ ماہانہ دیا جاتا تھا کہ ان کے بعد دلّی کی شاہی ختم ہو جائے گی اور دلّی بھی انگریزی عملداری میں شامل ہو جائے گی۔ لال حویلی کے باہر بادشاہ کا حکم نہیں چلتا تھا۔ اور اگر شہر والوں میں سے کوئی ان کے پاس فریاد لے کر آتا تو بادشاہ اپنی مجبوری ظاہر کر دیتے اور کہتے ''بھئی انگریزوں کی عدالت میں جاؤ۔''

لیکن اس بے بسی کے باوجود دلّی والے ہی نہیں باہر والے بھی بادشاہ سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ شہر کی بیشتر آبادی لال قلعہ کے متوسلین پر مشتمل تھی۔ شہزادوں اور سلاطین زادوں کے علاوہ امیر امراء اور رؤسا کا خدم و حشم کیا کم تھا؟ دلّی میں لٹتے لٹتے بھی الغاروں دولت بھری پڑی تھی۔ ڈیوڑھیوں پر ہاتھی جھولتے۔ تخت رواں، ہوادار، پالکی، نالکی، تام جھام ہر حویلی میں موجود لاؤ لشکر کا کیا ٹھکانہ! چوبدار، عصا بردار، پیادے، مردھے، کہار، لونڈیاں، باندیاں، دائیں، انائیں، چھوچھوئیں، مغلانیاں، ترکنیں، حبشنیں، جسولنیں، قلماقنیاں، خواجہ سرا، دربان، پاسبان، ہر امیر کے ہاں آخور کی بھرتی کی طرح بھرے پڑے تھے۔ سستا سماں، کاروبار خوب چمکے ہوئے، نہ جانے کیسی برکت تھی کہ ہن برستا تھا۔ ایک کماتا اور دس کھاتے۔ اجلے پوشوں تک کے خرچ اجلے تھے۔ رعایا خوش حال اور فارغ البال تھی۔ رہن سہن، ادب آداب، نشست برخاست، بول چال، رسم و رواج، تیج تہوار، میلے ٹھیلے سیر تماشے ان سب میں کچھ سلیقہ اور قرینہ تھا کہ دلّی کی تہذیب ایک مثالی نمونہ سمجھی جاتی تھی۔ باہر سے جو بھی کھڑ آتی یا انگھڑ جواہر پارے آتے یہاں ان کی تراش خراش کچھ اس انداز سے ہوتی اور ان پر ایسی جلا چڑھتی کہ اس چھوٹ سے آنکھیں خیرہ ہونے لگتیں۔ یہاں آ کر گونگوں کو زبان مل جاتی، جن کی منقار زیر پر ہوتی وہ ہزار داستان بن جاتے، جو پر شکستہ ہوتے وہ فلک الافلاک پر پر مارنے لگتے۔ علوم و فنون کے چشمے اس سرزمین سے پھوٹتے اور حکمت و دانش یہاں کی فضا میں گھلتی رہتی۔ غرض ہندوستان کا دل ایک عجیب پر کیف مقام تھا جو بہت کچھ برباد ہو جانے پر بھی جنت بنا ہوا تھا۔

زمانہ چپکے چپکے کروٹ بدل رہا تھا۔ مشرق پر مغرب کی یلغار شروع ہو چکی تھی۔ تہذیب فرنگ کی آندھی چڑھتی چلی آ رہی تھی اور مشرقی تہذیب کے چراغ جھلملا رہے تھے۔ یہ دلّی کی آخری بہار تھی جس کی گھات میں خزاں لگی ہوئی تھی۔

بہادر شاہ کی حیثیت شاہِ شطرنج سے زیادہ نہیں تھی۔ تیموری دبدبہ لال قلعہ میں محصور ہو چکا تھا مگر وہ اس کا کوئی تدارک نہیں کر سکتے تھے۔ اور تو اور خود ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف تھے۔ گھر کے

عہدی لنکا ڈھار ہے تھے۔ ان کی چہیتی بیگم زینت محل مرزا جواں بخت کو ولی عہد بنوانا چاہتی تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے فرنگیوں سے ساز باز کر رکھا تھا۔ بادشاہ کے سمدھی مرزا الٰہی بخش انگریزوں سے جا ملے تھے۔ شاہی طبیب حکیم احسن اللہ خاں انگریزوں کے گماشتے تھے۔ جب ۱۸۵۷ء میں غدر پڑا۔ جو دراصل پہلی جنگ آزادی تھی جو انگریزوں سے لڑی گئی، تو دیسی فوجیں چاروں طرف سے سمٹ کر دلی آنے لگیں۔ مگر اندر خانے تو دیمک لگی ہوئی تھی۔ کالے حال گول انداز کو جو بارود قلعہ سے بھیجی جاتی وہ بارود نہیں ریتا ہوا باجرا ہوتا۔ پھر دیسی فوج کا کوئی سردھرا نہیں تھا۔ سب من مانی کر رہے تھے۔ جنرل بخت خاں پہلے تو جی توڑ کر لڑا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ صاحب عالم اس کی چلنے نہیں دیتے تو اپنے آدمیوں کو لے کر روپوش ہو گیا۔

اقتدار کی خواہش اور محلات کی ریشہ دوانیاں آخری مغل بادشاہ کو لے ڈوبیں۔ جب انگریزوں کی فوجیں دلی پر چڑھ آئیں اور شہر کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو بادشاہ لال قلعہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں چلے گئے۔ دلی کو انگریزوں نے فتح کر لیا۔ رعایا تباہ ہو گئی۔ دربدر خاک بسر، جس کے جہاں سینگ سمائے نکل گیا۔ دلی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ ہڈسن اپنی فوج کا دستہ لے کر ہمایوں کے مقبرے پہنچا۔ اس کے پہونچنے سے کچھ ہی دیر پہلے جنرل بخت خاں نے مقبرے میں آکر بادشاہ کو بتایا کہ دلی ختم ہو گئی۔ بہتر ہے کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔ ہم کسی اور مقام کو اپنا گڑھ بنا کر انگریزوں سے لڑیں گے۔ بادشاہ اس کے ساتھ چلنے پر رضامند بھی ہو گئے مگر انگریزوں کے ہواخواہوں نے پھر بہکا دیا۔ یہ کہہ کر کہ اس پوربیئے کا کیا اعتبار؟ یہ آپ کی آڑ میں خود بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ بادشاہ پھر ڈھسل گئے۔ انہیں باور کرایا گیا کہ انگریز آپ کی پنشن جاری رکھیں گے اور آپ کی جو نذر بند کر دی گئی ہے اسے بھی کھول دیں گے اور آپ آرام سے لال قلعے میں رہیں گے۔ اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں۔ بادشاہ نے بخت خاں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ جنرل بخت خاں نے بہت سمجھایا کہ یہ مشورہ نمک حراموں کا ہے۔ ان کا یا فرنگیوں کا کیا اعتبار؟ مگر بادشاہ دودلے ہو کر رہ گئے اور ہڈسن کا دستہ جب مقبرے میں داخل ہو گیا تو جنرل بخت خاں بادشاہ کو آخری سلام کر کے مقبرے میں سے جمنا کے رخ اتر گیا۔ اس کا پھر کوئی پتہ نہیں چلا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

ہڈسن نے آکر بادشاہ سے باتیں ملائیں۔ بادشاہ نے قلعہ میں واپس چلنے کی چند شرائط پیش کیں۔ اپنی اور اپنے متعلقین کی جاں بخشی چاہی۔ پنشن کا جاری رہنا اور نذر کا کھلنا چاہا۔ ہڈسن نے

سارے مطالبات مان لئے۔ بادشاہ کو ہوادار میں سوار کرایا ور چھ شہزادوں کو فینس میں۔ جب دلّی کے خونی دروازے پر پہونچے تو ہڈسن نے رک کر شہزادوں کو حکم دیا کہ فینس میں سے باہر نکل آؤ۔ شاہزادوں نے حکم کی تعمیل کی۔ ہڈسن نے ان پر اپنا طمنچہ تانا۔ شہزادوں نے کہا" آپ نے تو ہمیں جان کی امان دی ہے۔" زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ ایک ایک کر کے ہڈسن نے چھیوں شہزادوں کو گولی کا نشانہ بنایا ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب شہزادے خاک وخون میں تڑپ رہے تھے تو ہڈسن نے ان کا چلو چلو بھر خون پیا اور کہا:

"آج میں نے انگریزوں کے مارنے کا بدلہ ان سے لے لیا۔"

شہزادوں کے سر کاٹ لئے گئے اور ان کی لاشیں خونی دروازے پر لٹکا دی گئیں۔ بادشاہ کو لال قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ جب بادشاہ نے دبی زبان سے شکوہ کیا کہ

"مجھ سے میری پنشن بحال رکھنے اور نذر کھولنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔"

تو ہڈسن نے کہا" ہم تمہاری نذر بھی کھولے گا۔" یہ کہہ کر شہزادوں کے کٹے ہوئے سر ایک طشت میں رکھ کر بادشاہ کے سامنے پیش کر دئے۔ بوڑھے بادشاہ کے دل پر چھ جان جوان بیٹوں کے سر دیکھ کر کیا گزری ہوگی۔؟ اس کا اندازہ صاحب اولاد کر سکتے ہیں۔ اور شہزادوں کے بے گوروکفن لاشین خونی دروازے پر لٹکی سڑتی رہیں۔ بادشاہ زادیاں دلّی کے ویران گلی کوچوں میں بھٹکتی پھریں۔ کوئی انہیں امان دینے پر تیار نہ تھا۔ کون اپنی جان جوکھم میں ڈالتا؟ کوتوالی چبوترے پر پھانسیاں گڑھ گئیں اور چن چن کر مسلمانوں کو دار پر چڑھایا گیا۔ اور اس کا بھی خاص اہتمام کیا گیا کہ پھانسی دینے والا بھنگی ہی ہو۔

دیکھتے ہی دیکھتے شہر میں ہو کا عالم ہو گیا۔ ویرانوں میں کتے لوٹنے لگے۔ وہ بازار جہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور تھالی پھینکوں تو سروں ہی سروں پر جاتی تھی، مسمار کر دئے گئے۔ امیر امراء کی حویلیاں ڈھادی گئیں۔ اور دفینوں کی تلاش میں دلّی پر گدھوں کے ہل پھروادئے گئے۔

بادشاہ پر لال قلعہ میں مقدمہ چلایا گیا۔ اور انہیں قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ لال حویلی کی کوکھ جل گئی۔ قلعہ میں گوری فوج رہنے لگی۔ جامع مسجد میں گھوڑے باندھے جانے لگے۔

بہادر شاہ ایک فقیر منش بادشاہ تھے۔ پیری مریدی بھی کرتے تھے، جو اُن کا مرید ہوتا اس کا کچھ نہ کچھ وظیفہ مقرر ہو جاتا۔ یوں تو ان کے سینکڑوں مرید تھے جو چیلے کہلاتے تھے۔ دلّی میں ایک محلہ انہی چیلوں کی رہائش کی وجہ سے چیلوں کا کوچہ کہلاتا ہے۔ شعروشاعری تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ کلام الملوک

ملوک الکلام، ان سے زیادہ کسی اور پر یہ مقولہ سچا نہیں اُترتا۔ کلام میں سوز وگداز ہے، ان کا کلام ان کی سیرت کا آئینہ ہے، مایوسیوں نے ان کا دل گداز کر دیا تھا۔ فرماتے ہیں۔

یا تو افسر شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

ان کی زبان کا کیا کہنا! لال قلعہ کی زبان اردوئے معلّیٰ کہلائی۔ بیان اتنا موثر کہ تیر کی طرح دل میں اتر جائے۔ ظفر کو بچپن سے شعر کہنے کا شوق تھا۔ شروع شروع میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھایا۔ مشکل زمینوں میں شعر کہنے کی صلاحیت شاہ نصیر کی بدولت پیدا ہوئی۔ جب شاہ نصیر دکن چلے گئے تو میر کاظم حسین بیقرار کو اپنا استاد بنایا لیکن کچھ عرصہ بعد بیقرار افغانستان چلے گئے تو استاد ذوق کو ولی عہد بہادر کی غزلیں بنانے کی خدمت سونپی گئی۔ ذوق جب تک جیے اس خوشگوار فرض کو انجام دیتے رہے، ذوق کے انتقال کے بعد مرزا غالب استادِ شہ مقرر ہوئے۔ مرزا کو استادی کے پچاس روپے ملتے تھے جو انہیں پچاس ہزار سے بھی زیادہ تھے۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ظفر کے چار دیوان شائع ہوئے تھے، انہوں نے اردو کے علاوہ فارسی بھاشا اور پنجابی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ظفر کے کلام میں چونکا دینے والا انوکھا پن تو نہیں ہے لیکن وہ ایک مخصوص طرز کلام کے مالک ضرور ہیں، ان کے کلام کا ایک اہم وصف ان کا خلوص ہے جو ان کی زندگی سے ہم آہنگ ہے اور ان کی شخصی خوبیوں کا آئینہ دار۔ ظفر بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی اور دردمند بھی تھے۔ اس دردمندی نے آگے چل کر فریاد وزاری کی شکل اختیار کر لی۔ ان کے زمانہ اسیری کا کلام "شکستِ شیشۂ دل کی" صدا معلوم ہوتا ہے، یہ کلام شائع نہیں ہو سکا مگر دلی کے اکثر لوگوں کو زبانی یاد تھا۔ ایک غزل جو ان سے منسوب ہے اس کے چند شعر یہ ہیں۔

نہ کسی کے آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
مرا رنگ روپ بگڑ گیا مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں

میں نہیں ہوں نغمہ جانفزا کوئی مجھ کو سن کے کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا کسی دل جلے کی پکار ہوں
کوئی آ کے دیا جلائے کیوں کوئی آ کے اشک بہائے کیوں
کوئی آ کے پھول چڑھائے کیوں میں تو بے کسی کا مزار ہوں

۳۵۔۴۰ سال پہلے تک دلی میں ایک بڑے میاں تھے جن کی صورت شکل بہادر شاہ سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ وہ رباب بجا کر صرف بہادر شاہ ہی کی غزلیں گایا کرتے تھے۔ لوگ ان کی غمناک دھنوں میں مظلوم بادشاہ کی غزلیں سن کر بے حد متاثر ہوتے تھے اور انہیں روپے دو روپے دے کر رخصت کرتے تھے۔ ایک اور غزل وہ گایا کرتے تھے جس کے دو شعر یہ ہیں۔

پس برگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامنِ باد نے سر شام ہی سے بجھا دیا
مجھے دفن کر چکو جس گھڑی تو یہ اس سے کہنا کہ اے پری
وہ جو تیرا عاشقِ زار تھا تہہ خاک اس کو دبا دیا

پیلو کی دھن میں رباب کے زخموں کے ساتھ جب بڑے میاں ایک اور غزل سناتے تو سننے والوں کے ساتھ خود ان کے بھی آنسو نکل پڑتے۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایا ہند تباہ ہوئی کہو کیسی ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے
یہ کسی نے ظلم بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لوگوں کو بے گنہ
و لے کلمہ گویوں کی سمت سے ابھی دل میں ان کے بخار ہے
نہ تھا شہر دہلی یہ تھا اک چمن کہو کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے
یہی تنگ حال جو سب کا ہے یہ کرشمہ قدرتِ رب کا ہے
جو بہار تھی سو خزاں ہوئی جو خزاں تھی اب وہ بہار ہے

شب و روز پھولوں میں جو تُلے کہو خارِ غم کو وہ کیا سہے
ملے طوق قید میں جب انہیں کہا گل کے بدلے یہ ہار ہے
کبھی جو وہ ماتمِ بخت ہے کہو کیسی گردشِ بخت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ وہ شاہ ہے نہ دیار ہے
جو سلوک کرتے تھے اور سے وہ ہیں زندہ اب کسی طور سے
وہ ہیں تنگ چرخ کے دور سے رہا تن پہ ان کے نہ تار ہے
نہ رہے جو تن پہ ہے سر مرا نہیں جان جانے کا ڈر ذرا
کٹے غم ہی نکلے جو دم مرا مجھے اپنی زندگی ہی بار ہے

ان اشعار میں بہت کچھ تحریف ہو گئی ہے۔ کیوں کہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔ تاہم ان اشعار سے ظفر کی دردناک زندگی کا نقشہ آنکھوں کے آگے آجاتا ہے، رنگون میں خود بادشاہ کی حالت زبوں ہو گئی تھی۔ ایک انگریز سیاح نے بادشاہ کو آخری وقت دیکھا تھا تو وہ ایک کھٹولے میں بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں پانی کا جو گھڑا رکھا ہوا تھا اس میں کیڑے کلبلا رہے تھے۔

ظفر کو اپنے جذبات و احساسات کے اظہار پر بڑی قدرت تھی۔ کسی واقعہ یا تاثر کو پوری شدت کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھالتے تھے۔ طویل بحریں انہیں زیادہ مرغوب تھیں مشکل زمینیں پیدا کرنے میں بھی انہیں خاص ملکہ تھا۔ مشکل سے مشکل ردیف قافیہ بے ساختگی سے نباہ جاتے تھے۔

ہو چکی گرمی گلابی بادۂ گلگوں سے بھر
اب تو جاڑا اے پری پیکر گلابی ہو گیا

☆

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نورِ جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا

☆

تم نے کیا نہ یاد کبھی بھول کر ہمیں
ہم نے تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا دیا

☆

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

زبان کا چٹخارہ اس شعر میں دیکھیے۔

آج دیتے ہیں وہی توڑ کے ٹکڑا سا جواب
اے ظفرؔ کھا کے پلے جو مرے گھر کے ٹکڑے

شاعری کے ساتھ ساتھ بہادر شاہ موسیقی اور خطاطی کے بھی استاد تھے۔ انہوں نے گلستاں کی ایک شرح بھی لکھی تھی۔ جس طرح شاہ نصیرؔ، ذوقؔ اور غالبؔ جیسے استادان کے دربار سے وابستہ رہے اسی طرح شاہ بھکن، میاں اچپل اور تان رس خاں جیسے نامی گرامی موسیقار بھی ان کے دربار میں موجود تھے، بہادر شاہ بذات خود موسیقی کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کے بنائے ہوئے خیال، ٹھمریاں، ملہاریں اور ہولیاں آج بھی گائی جاتی ہیں۔ اس قسم کی چیزوں میں بہادر شاہ شوق رنگ تخلص کرتے تھے۔ اس کا نمونہ باگیسری بہار کا یہ خیال ہے۔

رُت بسنت میں اپنی امنگ سوں
پی ڈھونڈھوں میں نکسی گھر سوں
ملے تو لال کروا لگاوں
پاگ بندھاؤں پیلی سرسوں
رنگ بسنت میں اپنی امنگ سوں
رنگ ہے سبزہ نرگس یاں کا
کہے شوق رنگ، رنگ ہے واکا
ان بھیدن کو کوئی نہ جانے
واقف ہوں میں واکی جڑسوں
رُت بسنت میں اپنی امنگ سوں

۱۸۵۸ء میں بادشاہ کو قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ چار سال قید و بند میں رہ کر آخری مغل تاجدار نے دیار غیر میں انتقال کیا۔ اس طرح ۱۸۶۲ء میں تیموری عظمت کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔

پردہ داری می کند برطاقِ کسریٰ عنکبوت
جغد نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

○○○

شاہ جہانی دیگ کی کھرچن

اب سے چالیس پینتالیس سال پہلے تک دلّی میں شاہجہانی دیگ کی کھرچن باقی تھی۔ بڑے وضعدار لوگ تھے یہ دلّی والے جب تک جیتے رہے ان کی وضع میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہر شخص اپنی جگہ پر ایک نمونہ تھا، ایک نگینہ تھا دلّی کی انگوٹھی میں جڑا ہوا۔ انہیں دیکھ کر آنکھوں میں روشنی آجاتی اور ان کی باتیں سن کر دل کا کنول کھل جاتا، خوش مذاق، خوش صفات، اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوں گے؟ یہ ایک مخصوص تہذیب کی پیداوار تھے۔ اور اس تہذیب کی شمع گل ہوئی اور شمع کے ساتھ پروانے بھی رخصت ہوئے۔

میر ناصر علی دہلوی

یہ صاحب جو کمان کی طرح جھکے پیچھے ہاتھ باندھے چوک پر کباڑیوں میں پھر رہے ہیں خاں بہادر میر ناصر علی ہیں۔ اسّی سے اوپر ہیں مگر فراش خانہ سے جامع مسجد روزانہ پیدل آتے جاتے ہیں، آندھی جائے مینہ جائے ان کا پھیرا ناغہ نہیں ہوتا۔ انہیں پرانی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے اس لئے چوک پر بیٹھنے والے کباڑیوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ کباڑے بھی انہیں خوب جان گئے ہیں۔ جو چیز

خان بہادر میر ناصر علی دہلوی

کوڑیوں کے مول لاتے ہیں میر صاحب سے اس کے روپے بناتے ہیں مگر صاحب ان کے جھانسوں میں کم ہی آتے ہیں، یہ اشرفیوں کی چیز روپوں میں ان سے خریدتے ہیں، کبھی میر صاحب کے گھر جا کر آپ دیکھتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ ایک چھوٹا سا نگار خانہ چین ان کے گھر میں اتر آیا ہے۔

یہ وہی ناصر علی ہیں جو "تیرھویں صدی" میں سرسید سے الجھتے سلجھتے رہے، ان کے باپ دادا شاہی مناظرہ کرنے والے تھے، یوں میر صاحب کو دین کی تعلیم پہونچی ہوئی تھی۔ سرسید انہیں "ناصح مشفق" کہتے تھے۔ صاحب طرز ادیب تھے، اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے ان کا طوطی بولتا تھا۔ ان کا آخری پرچہ "صلائے عام" تھا جو ربع صدی تک جاری رہا اور ان کے ساتھ ہی رخصت ہوا، ان کا کتب خانہ دلّی کے بہترین کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا، صورت سے قلندر معلوم ہوتے تھے۔ جب بولنے پر آتے تو سمندر بن جاتے، ادب فلسفہ، مذہب، تاریخ کے جوار بھاٹے آنے لگتے، اپنے آگے کسی کو نہ گردانتے تھے، سب کو طفل مکتب جانتے تھے، مزاج کے کڑوے تھے اور باتیں اکثر کسیلی کرتے تھے، نمک کے محکمے میں ساری عمر نوکر رہے۔ جتنے عرصے ملازمت کی اس سے زیادہ عرصہ تک پنشن لی۔ اتنے جیے اتنے جیے کہ ہم عمروں میں کوئی باقی نہ رہا۔ شاید اسی وجہ سے چڑچڑے ہو گئے تھے۔

دلّی میں حضرت خواجہ باقی باللہ کی درگاہ میں جو راستہ شمال سے جاتا ہے اس پر ایک بزرگ کا مزار ہے جس پر یہ شعر لکھا ہوا ہے۔

فاتحہ مرقدِ ویراں پہ بھی پڑھتے جانا
ان سے کہہ دو جو ہیں اس راہ کے گزرنے والے

ان ہی حافظ ویراں کے میر صاحب مرید تھے، مگر میر صاحب اپنی بعد کی زندگی میں پیری مریدی کے سخت خلاف ہو گئے تھے، میر صاحب کے لباس میں نفاست بہت تھی۔ لباس صاف ستھرا ہوتا تھا، کھانا من بھاتا کھاتے تھے، چائے بڑے اہتمام سے پیتے تھے۔ کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔ کسی سے ملتے جلتے نہیں تھے۔ جتنا وقت ملتا تھا مطالعہ میں گزارتے تھے۔ ہزاروں شعر اردو فارسی کے انہیں یاد تھے۔ اپنے مضامین میں ان اشعار کا نہایت موزوں صرف کرتے تھے۔ میر صاحب جیسی نثر کسی اور کو لکھنی نصیب نہ ہوئی۔ مرض الموت میں شدید تکلیف اٹھائی مگر پیشانی پر شکن تک نہ آئی۔ بڑے صابر و ضابط آدمی تھے۔ مرنے سے کچھ دیر پہلے بیٹے نے مزاج پرسی کی تو بولے۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی

گورا رنگ، کشادہ پیشانی، ملاقی آنکھیں، سنہرے فریم کی عینک، ستواں ناک، موزوں دہن، کتروں لبیں، بھرواں گول سفید ڈاڑھی، بھاری ڈیل، سرو قد، اونچی چولی کا انگرکھا، تنگ پاجامہ، پاؤں میں وارنش کا پمپ شو، دائیں ہاتھ میں چھڑی، بائیں ہاتھ میں لمبا سا سگار، بڑے شاندار آدمی تھے۔ نواب سائل، لوہارو کے نواب زادوں میں سے تھے، بہت بڑے اور مشہور شاعر، اور اس سے بڑھ کر شریف انسان۔ فصیح الملک داغ کے داماد تھے اور شاگرد بھی، داغ کا جب انتقال ہوا اور جانشینی کا جھگڑا آن پڑا تو سائل نے اعلان کر دیا کہ داغ کے سب شاگرد داغ کے جانشین ہیں۔ اس زمانے میں بہت سے استاد اپنے نام کے ساتھ جانشین داغ لکھتے تھے مگر نواب سائل نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا۔ مشاعروں میں اکثر شریک ہوتے اور اپنے مخصوص ترنم میں غزل سناتے تھے، مگر جب مشاعروں میں بیہودگیاں ہونے لگیں تو نواب سائل نے شریک ہونا چھوڑ دیا تھا۔ بیخود دہلوی بھی داغ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور سائل کو اپنا حریف سمجھتے تھے، استاد بیخود تحت اللفظ میں پڑھتے تھے اور انہیں بھی داد بہت ملتی تھی مگر سائل کا ترنم مشاعرہ لوٹ لیتا تھا اس پر بیخود جھنجھلا جاتے اور جو منہ میں آتا کہنا شروع کر دیتے۔ سائل بہت سمائی کے آدمی تھے، خاموش رہتے مگر ان کے شاگرد بھڑک اٹھتے اور دونوں استادوں کے شاگردوں میں فساد ہو جاتا۔ نتیجہ یہ کہ ایک زمانہ میں مشاعرے ہی بند ہو گئے تھے مگر اس درجہ اختلاف پر بھی ان دونوں بزرگوں میں خلوص و محبت کے تعلقات آخر تک قائم رہے، نواب سائل نے اپنے بیٹے کو استاد بیخود کی شاگردی میں دے رکھا تھا۔

نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی

مرنے سے چند سال پہلے نواب سائل کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ گھر پر انہوں نے ایک رکشا رکھ لی تھی، اسی میں آتے جاتے تھے، روزانہ شام کو اردو بازار میں ایک کتب فروش کی دکان کے

آگے وہ اپنی رکشا میں بیٹھے دکھائی دیتے تھے، یہیں ان سے بہ آسانی ملاقات ہو جاتی تھی، ایک دفعہ آبدیدہ ہو کر فرمایا:

مجھے وہ وقت یاد آتا ہے جب میرے والد کی ڈیوڑھی پر ان کا ہاتھی آتا تھا۔ میں لپک کر اس کی دُم پکڑ کر چڑھ جاتا تھا، یا اب یہ وقت ہے کہ دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔"

اردو فارسی میں ان کی قابلیت مسلم تھی، پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن بھی تھے، چھوٹے بڑے سب سے اچھی طرح پیش آتے تھے اس لئے اکثر طالب علم انہیں گھیرے رہتے تھے ایک دن اس شعر پر چند دوستوں میں بحث چل نکلی۔

خواہیم از خدا و نخواہیم از خدا
دیدن رُخِ حبیب و نہ دیدن رُخِ رقیب

لف نشر مرتب کے اعتبار سے اس شعر کی صورت یوں بنتی ہے

خواہیم از خدا دیدن رُخِ حبیب
نخواہیم از خدا نہ دیدن رُخِ رقیب

لہٰذا شعر کا مطلب خبط ہو جاتا ہے، چنانچہ یہ مسئلہ نواب کے سامنے پیش کیا گیا۔ پہلے تو وہ چکرائے مگر غور کرنے کے بعد بولے "کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، رقیب کے بدلے حبیب ہونا چاہیے۔"

نواب سائل بلیرڈ بہت اچھی کھیلتے تھے، کلبوں میں انگریز ان کے ساتھ کھیلنے کے خواہش مند رہتے تھے، لباس تراشنا بہت اچھا جانتے تھے، انگرکھا، سوٹ اور کوٹ، شیروانی، ہر لباس تراش لیتے تھے، کاڑھنا بھی خوب جانتے تھے، کسی پر مہربان ہوتے تو اسے اپنے ہاتھ کا کڑھا ہوا رومال عنایت فرماتے تھے، آخر میں مثنوی جہانگیر و نور جہاں لکھ رہے تھے، کئی لاکھ شعر کہہ چکے تھے، مگر یہ مثنوی ختم نہیں ہوئی اور عمر تمام ہو گئی۔

نواب شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ دہلوی

نواب سائل کے بڑے بھائی تھے نواب تاباں۔ بالکل انہی کی طرح میدہ وشہاب رنگ، ویسا ہی ڈیل ڈول، ناک نقشہ اور لباس، مگر دونوں بھائیوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا، بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی سے نہ جانے کیا کد تھی کہ ہمیشہ برا بھلا کہتے رہتے تھے بلکہ برملا گالیاں تک دینے سے نہ چوکتے تھے اور گالی بھی ایک سے ایک نئی تراشتے تھے۔ سائل بیچارے سر جھکا کر کہتے "بھائی جان،

آدھی مجھ پر پڑ رہی ہیں اور آدھی آپ پر۔" اس پر وہ اور بھڑک اٹھتے اور وہ ملاحیاں سنتے کہ دھری جائیں نہ اٹھائی جائیں۔ مگر کیا مجال جو سائل صاحب کی تیوری پر بل آ جائے، وہ بھائی کی بزرگی کا اتنا احترام کرتے تھے کہ اونچی آواز میں بھی ان کے سامنے نہیں بولتے تھے۔ نواب تاباں بھی شاعر تھے، اردو میں بھی شعر کہتے تھے اور فارسی میں بھی۔ حکیم اجمل خاں کے ہاں شرفائے دہلی کا جمگھٹ رہتا تھا۔ حکیم صاحب بھی طرفہ خوبیوں کے آدمی تھے، یہ جتنے بڑے طبیب تھے اتنے ہی بڑے شاعر بھی تھے، ایک دفعہ شبلی نعمانی دلی آئے تو حکیم صاحب کے ہاں مہمان ہوئے۔ نواب تاباں کی تعریف غائبانہ بہت کچھ سن چکے تھے، ان سے ملنے کے خواہش مند ہوئے، حکیم صاحب نے سوچا کو نواب صاحب کو اگر یہاں بلایا گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس بات کا برا مان جائیں، لہٰذا ایک صاحب کے ساتھ شبلی کو ان کے گھر بھیج دیا۔ نواب صاحب نے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا، عزت سے بٹھایا، خاطر تواضع کی۔ شبلی کی فرمائش پر اپنی غزل سنانی شروع کی، شبلی بھی ذرا مدمغ آدمی تھے خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ تاباں نے دیکھا کہ مولانا ہوں ہاں بھی نہیں کرتے تو چمک کر بولے "ہاں صاحب، یہ شعر غور طلب ہے۔" یہ کہہ کر غزل کا اگلا شعر سنایا۔ مولانا نے اوپری دل سے کہا "سبحان اللہ! اچھا شعر کہا ہے آپ نے" "بس پھر تاباں آئیں تو جائیں کہاں؟" بولے "ابے لنگڑے! میں نے تو یہ شعر تین دن میں کہا اور تو نے ایک منٹ میں اسے سمجھ لیا؟ بیٹا، یہ شعر انجم نباشد!" اس کے بعد ان کا گالیوں کا پٹارہ کھل گیا اور مولانا شبلی کو اپنا پنڈ چھڑانا مشکل ہو گیا۔ ویسے اپنی روزمرہ کی زندگی میں تاباں بڑے زندہ دل آدمی تھے اور دوستوں کو کھلا پلا کر خوش ہوتے تھے، شطرنج کی انہیں دھت تھی اور چال بھی اچھی تھی، بڑے بڑے کھلاڑی ان کے ہاں آتے رہتے تھے۔

سید وحید الدین احمد بیخود دہلوی

استاد بیخود دہلوی

یہ صاحب جو ٹنیا کھل سے ٹلکتے ٹلکتے چلے آ رہے ہیں، گندمی رنگ، بڑی سی پھریری داڑھی، ہاتھوں میں ہزار دانہ سنبھالے، استاد بیخود ہیں، ٹانگیں دیکھیے ذرا ان کی، کمانیں بنی ہوئی ہیں، جوانی میں گھڑسواری کا

شوق تھا، منہ زور سے منہ زور گھوڑا ان کی ران تلے چیں بول جاتا تھا۔ ہم نے انہیں اسی برس کی عمر میں بھی گھوڑے پر سیدھے بیٹھے دیکھا ہے، ان کے والد سو سے اوپر ہو کر مرے تھے، میر صاحب بھی سو کے لگ بھگ ہو کر گئے ہیں۔

دلی والوں کی ٹکسالی زبان بولتے ہیں روزانہ شام کو ٹہلنے نکلتے ہیں۔ یادگار کا ایک چکر کاٹ کر اردو بازار میں وصی اشرف کے کتب خانہ پر ٹھکی لیتے ہوئے واپس جاتے ہیں، انہوں نے بڑے بڑے پرانوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ مرزا غالب کو جب انہوں نے دیکھا تو ان کی عمر پانچ سال کی تھی۔ مرزا کے دیوان کی شرح بھی انہوں نے لکھی ہے، باتیں بڑی مزے کی کرتے ہیں کتب خانہ پر جم جاتے ہیں تو ان کی باتیں سننے کے لئے ہم انہیں چھیڑ دیتے ہیں۔

''کیوں میر صاحب، کیا دشنہ اور خنجر ایک ہی چیز کو کہتے ہیں؟''

میر صاحب 'اماں دشنہ دشنہ ہوتا ہے اور خنجر خنجر ہوتا ہے، بھلا دشنہ خنجر کیسے ہوسکتا ہے اور خنجر دشنہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

اسی سے ملتا جلتا جواب پالکی نالکی کے لئے بھی ملتا ہے۔ کتب خانہ سے روزانہ ایک ناول پڑھنے کے لئے لے جاتے ہیں اور اگلے دن یہ کہہ کر دے جاتے ہیں کہ ''اس میں مزہ نہیں آیا، کوئی اور اچھا سا دو'' یوں اردو کے اچھے برے سارے ناول چاٹ گئے ہیں۔ کسی کو شاگرد بناتے ہیں تو اس سے باقاعدہ مٹھائی لیتے ہیں، داغ کے چہیتے شاگرد ہیں۔ استاد کے پاس برسوں رہے۔ داغ کے شاگردوں کے چاروں رجسٹر انہی کے پاس رہتے تھے۔

کبوتر اڑانے کا شوق تھا، جن بھوت بھی اتارتے تھے، ایک دن پوچھا ''استاد آپ جن بھوت کیسے اتارتے ہیں؟'' فرمایا جب حرامزادی کی چوٹی میں تین بل دے کر ناک میں مرچوں کی دھونی دیتا ہوں سر والا فوراً غائب ہو جاتا ہے۔''

خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی

دلی کے پرانے خاندانوں میں سے ایک خاندان خواجہ میر درد کا ہے، فراق اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے، جاڑوں میں روئی کا پاجامہ پہنے ہم نے انہی کو دیکھا۔ گول چہرہ گول داڑھی، رنگ کھلتا ہوا، دہرا بدن، شعر تو اتنا اچھا نہیں کہتے تھے مگر نثر لاجواب لکھتے تھے، شمس العلماء محمد حسین آزاد کے شاگرد تھے، فراق صاحب درویش صفت بزرگ تھے۔ عمر بہت زیادہ نہیں تھی مگر ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا،

ایک زمانہ میں مسجد فتحپوری کے مدرسے کے مدرس تھے، میرے والد سے ان کے برادرانہ تعلقات تھے۔ جب میں نے صحافت کی دنیا میں قدم رکھا تو ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ خواجہ میر درد کی بارہ دری میں ان کا ایک چھوٹا سا مکان تھا، وہیں قریب کے ایک بیٹھک میں مطب کرنے لگے تھے۔ کبھی مخزن میں لکھا کرتے تھے، اس کے بعد ان کے لکھنے پڑھنے کا شوق ختم ہو گیا تھا۔ مخزن میں ان کے مضامین بھی پڑھے اور ان کی جوانی کی تصویر بھی دیکھی۔ اس سے مجھے اشتیاق ہوا کہ ان سے ضرور لکھوانا چاہئے۔ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے گلے لگا کر رونے لگے اور بولے ''بھتیجے تم سے نہیں لکھوں گا تو اور کس کے لئے لکھوں گا'' چنانچہ ''لال قلعہ کی ایک جھلک'' انہوں نے قسط وار ساقی میں لکھی۔ آخری بار جب میں حاضر ہوا تو پلنگ پر لحاف اوڑھے بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ صاحبزادہ ناصر خلیق فگار کو پاس بلا کر بولے ''سنتے، ہمارے مرنے کی خبر انہیں ضرور کر دینا۔'' غریب آدمی تھے۔ مگر محبت و خلوص کی دولت سے مالا مال۔ بہت بھولے آدمی تھے۔ سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ نے کسی موقع پر انہیں بادشاہ اردو کہہ دیا تھا۔ مرحوم ان کے اس قول کو اکثر دہرایا کرتے تھے۔

میرے بیٹھے پر ایک دفعہ بیخود صاحب ان سے ملنے آگئے۔ دونوں تقریباً ہم عمر ہی تھے۔ گرمجوشی سے ملے۔ منجملہ اور باتوں کے فراق صاحب نے فرمایا ''دلی میں اب کیا رہ گیا ہے؟ نظم کے یہ بادشاہ ہیں اور نثر کا میں۔'' میں نے کہا ''اس میں کیا شک ہے۔'' جب بیخود صاحب چلے گئے تو بولے ''اور یہ بھی کیا رہ گئے ہیں؟ بس میں ہی رہ گیا ہوں۔''

حکیم خواجہ سید ناصر نذیر فراق دہلوی

اسی جوبن میں بعض باتیں بڑی عجیب بھی کہہ جاتے۔ مثلاً یہ کہ لال قلعہ جب بن رہا تھا تو لوہے کے بڑے بڑے کڑھاؤ چڑھے ہوئے تھے۔ ان میں چربی کھولتی رہتی تھی۔ مٹی کی اینٹ جب بن جاتی تو پہلے اس چربی میں پکائی جاتی۔ جب خوب سرخ ہو جاتی تو اسے نکال کر دیوار میں چن دیا جاتا۔

فرماتے تھے کہ سندربن میں ہم نے ایک پرندہ ایسا دیکھا ہے جس کا صرف ایک بازو تھا۔ دوسرے بازو کی جگہ صرف ہڈی کا آنکڑا سا تھا۔ نر کا دایاں پر ہوتا

تھا اور مادہ کا بایاں۔ جب انہیں اڑنا ہوتا تو نر اور مادہ آنکڑے میں آنکڑا ڈال کر پھر سے اڑ جاتے۔ ان کی ایسی بے پر کی اڑانے میں بھی ایک لطف تھا۔

میر باقر علی دہلوی داستان گو

میر باقر علی دہلوی داستان گو

الی کی پہاڑی پر ایک بڑے میاں رہتے تھے، دبلا ڈیل، اکہرا بدن، میانہ قد، چھوٹی سفید داڑھی، کبھی خاصے آسودہ حال تھے مگر اب اجلے پوشی سے گزارا کرتے تھے بڑے چرب زبان اور لسان آدمی تھے، نام تھا میر باقر علی۔ یہ دلی کے آخری داستان گو تھے، جب یہ فن زندہ تھا اور اس کے قدر دان بھی زندہ تھے تو میر صاحب دور دور بلائے جاتے تھے اور جھولیاں بھر بھر کے لاتے تھے، جب زمانہ کے مشاغل بدل گئے اور میر صاحب کا فن کسمپرسی میں پڑ گیا تو میر صاحب چھالیا بیچنے لگے تھے، دلی میں کسی کے ہاں داستان کہنے جاتے تو دو روپے لیا کرتے، پھر ایک دور ایسا آیا کہ لوگوں کو دو روپے بھی اکھرنے لگے تو میر صاحب نے اپنے گھر ہی میں داستان کہنی شروع کر دی اور ایک آنہ ٹکٹ لگا دیا۔ دس بیس شائقین آجاتے اور میر صاحب کو روپیہ سوا روپیہ مل جاتا، امیر حمزہ کی داستان سنایا کرتے تھے۔ بعض دفعہ سامعین کی فرمائش پر کسی ایک پہلو کو بیان کرتے۔ کوئی کہتا میر صاحب آج تو لڑائی کا بیان ہو جائے اور میر صاحب رزم کو اس تفصیل سے پیش کرتے کہ آنکھوں کے سامنے میدان جنگ کا نقشہ قائم ہو جاتا، ہتھیاروں کے نام گنانے پر آتے تو سو سوا سو نام ایک ہی سانس میں گنا جاتے۔ اور یہ نام انہیں صرف رٹے ہوئے نہیں تھے ٹوک کر چاہے جس ہتھیار کو ان سے پوچھ لیجئے۔ اس کی صورت شکل اور اس کا استعمال بتا دیتے تھے، کوئی کہتا "میر صاحب، آج تو عیاریاں بیان ہو جائیں۔" اور میر صاحب عیاریوں کے کارنامے بیان کرنے لگتے ساتھ ساتھ اداکاری بھی کرتے جاتے، اور سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ جاتے۔ میر صاحب کے علم کی کوئی تھاہ نہیں تھی۔ ہر علم میں تیرے ہوئے تھے اور یہ ان کے فن کا تقاضا بھی تھا۔

بڑھاپے میں میر صاحب نے مدرسہ طبیہ میں باقاعدہ طب بھی پڑھی تھی، مگر مطب کبھی نہیں کیا، ان کی اکلوتی بیٹی البتہ طبیبہ تھیں اور زنانہ مطب بھی کرتی تھیں۔

میر صاحب کو فیون اور حقے کا شوق تھا۔ داستان شروع کرنے سے پہلے چاندی کی کٹوری میں روئی میں لپیٹ کر افیون گھولتے تھے، اس گھولوے کی چسکی لگاتے، حقے کا کش لیتے اور داستان شروع کر دیتے، چائے کا بھی شوق تھا، اس کی تین صفتیں بتاتے تھے، لب بند، لبریز اور لب سوز یعنی اتنی میٹھی ہو کہ ہونٹ چپک جائیں، پیالی لبالب بھری ہو اور خوب گرم ہو۔

میر صاحب کے شناسا میر محمود علی صاحب نے بتایا کہ کلکتہ میں ایک دفعہ لکھنؤ کے ایک داستان گو کی دھوم مچی۔ ایک دن ہم بھی سننے گئے تو دیکھا کہ داستان گو صاحب کے آگے طلسم ہوشربا کھلی دھری ہے، اس میں سے پڑھتے جاتے ہیں اور جب بہت جوش میں آتے ہیں تو ایک ہاتھ اونچا کر لیتے ہیں، طبیعت بہت مکدر ہوئی۔ جی چاہا کہ کسی طرح میر باقر علی یہاں آجاتے تو کلکتے والوں کو معلوم ہوتا کہ داستان گوئی کسے کہتے ہیں، نہ سان نہ گمان، اگلے دن کیا دیکھتے ہیں کہ کولوٹولہ میں میر صاحب سامنے سے چلے آرہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اپنے کسی کام سے آئے ہیں، قصہ مختصر میر صاحب کی داستان ہوئی اور لکھنوی داستان گو ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہتا تھا "حضور یہ اعجاز ہے حضور یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔"

میر جالبؔ دہلوی

میر باقر علی کے ایک دوست تھے میر جالب دہلوی، قد و قامت میں انہی جیسے، صورت شکل اور وضع قطع میں بھی ان سے مشابہ اتنا بڑا صحافی اردو صحافت نے آج تک پیدا نہیں کیا، کتابیں پڑھنے کا انہیں بچپن سے شوق تھا جو کتاب رسالہ، اخبار ہاتھ لگ گیا اسے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالتے۔ اخباروں کے اشتہارات تک نہیں چھوڑتے تھے۔ بازار میں کوئی چھپا ہوا کاغذ پڑا مل جاتا تو اسے اٹھا لاتے اور گھر آکر اسے پڑھتے، غریب گھر میں پیدا ہوئے تھے، اسکول کی تعلیم کی خرچ پورا کرنے کے لیے بچوں کو پڑھاتے تھے۔ اس زمانہ میں سستے ناولوں کے ترجمے کی مانگ تھی، میر صاحب نے اس

میر بشارت علی جالب دہلوی

کام کی طرف بھی توجہ کی، مولوی عنایت اللہ اور قاری سرفراز حسین سے مشورہ اور اصلاح لینے لگے، یوں ترجمہ کرنے کی بھی انہیں اچھی مشق ہوگئی، اب انہیں اخبار نویسی کی چیٹک لگی۔ دلّی میں اس وقت کوئی قابل ذکر اخبار نہیں تھا اس لئے میر صاحب لاہور پہونچے اور ایک اخبار میں تیس روپے پر ملازم ہوگئے، اس تیس روپے سے ان کی اخباری زندگی شروع ہوئی اور مرتے دم تک وہ اخباری سلسلہ ہی میں ترقی کرتے چلے گئے، انتخاب لاجواب، پیسہ اخبار اور وکیل کی ادارت نے ان کی منفرد حیثیت قائم کردی، جب مولانا محمد علی نے دلّی سے 'ہمدرد' جاری کیا تو میر صاحب کو اپنے اخبار میں بلالیا، میر صاحب چھاپہ مشین کے کالبے سے لے کر چھپے ہوئے پرچہ کی تقسیم تک ہر کام سے واقف تھے، ایسا کام سنبھالا کہ مولانا محمد علی بالکل نچنت ہوگئے اور جب لکھنؤ سے راجہ صاحب محمود آباد نے ہمدم نکالا تو اس کی ادارت کے لئے راجہ صاحب کی نظر انتخاب میر صاحب ہی پر پڑی۔ ہمدم کے بعد میر صاحب نے اپنا اخبار ہمت جاری کیا جو ان کی زندگی کے ساتھ ختم ہوا۔

میر صاحب چلتے پھرتے انسائیکلو پیڈیا تھے، ہر چیز کے متعلق ان کی معلومات اتنی زیادہ تھی کہ اگر کوئی ان کی تقریر سن لے تو چھوٹی موٹی کتاب تیار کرلے، لوگ ان سے کوئی سوال پوچھ کر گنہگار ہو جاتے تھے، میر صاحب کا لیکچر شروع ہونے کے بعد ختم ہونے میں نہ آتا تھا، ایک دفعہ میر صاحب کے جاننے والے غلطی سے ان سے کچھ پوچھ بیٹھے۔ میر صاحب نے وہیں اپنی معلومات کا پٹارہ کھول دیا، جب وہ صاحب کھڑے کھڑے تھک گئے تو آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف چلنے شروع ہوئے، میر صاحب بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور بولتے رہے، ان صاحب کا گھر آگیا تو وہ رک گئے، میر صاحب بھی رک گئے مگر اپنی معلومات سے انہیں مستفیض فرماتے رہے، وہ گھبرا کر اپنی ڈیوڑھی میں گھس گئے تو میر صاحب بھی ان کے پیچھے پیچھے ڈیوڑھی میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے جب میر صاحب کو ذرا غافل پایا تو چپکے سے سٹک گئے، میر صاحب در و دیوار ہی سے باتیں کرتے رہے یہاں تک جب انہیں ہوش آیا تو دیکھا کہ کوئی متنفس نہیں ہے۔ حیران ہوئے کہ میں یہاں کیسے اور کیوں آگیا؟ ڈیوڑھی میں سے جلدی سے نکل اپنے گھر کی راہ لی، دراصل میر صاحب بھی جنیا بیگم کے عاشق تھے اور اس کی جھونک میں انہیں دین دنیا کی خبر نہیں رہتی تھی۔

میر صاحب بہت باقاعدہ آدمی تھے ردّی سے ردّی اخبار کو بھی پڑھتے تھے اور اس کا فائل بنا لیتے تھے۔ جتنے خط ان کے پاس آتے تھے سب کو محفوظ رکھتے تھے، ان کے کتب خانہ میں کئی ہزار نایاب کتابیں تھیں، افسوس! ان کے انتقال کے بعد ان کا سارا بیش قیمت سرمایہ یا تو دیمک نے کھایا یا چولھا

جلانے کے کام آیا، غالباً پانچ ہزار کتابیں ان کے پوتے جمیل جالبی نے جامعہ ملیہ دہلی کو دی تھیں۔ یقین ہے کہ جب ۱۹۴۷ء میں جامعہ کے کتب خانہ کو فسادیوں نے جلایا تو اس میں بیش قیمت سرمایہ بھی جل گیا ہوگا۔

ملا واحدی دہلوی

ملّا واحدی دہلوی

کوچہ چیلان میں جہاں میر جالب کا مکان تھا اس سے ذرا اور آگے بڑھ کر ملا واحدی کا مکان تھا، واحدی صاحب کی طرح واحدی صاحب کا مکان بھی ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے، ادب، مذہب، صحافت اور سیاست کی اکثر شخصیتوں نے اسی مکان میں فروغ پایا، خواجہ حسن نظامی، نیاز فتحپوری، دیوان سنگھ مفتون، عارف ہسوی اور بہت سوں نے یہیں سے نام پایا، یہاں سے متعدد رسالے جاری ہوئے، واحدی صاحب عمر بھر بڑے خاموش اور مخلص کارکن رہے، نام ونمود کی انہوں نے کبھی پرواہ نہیں کی۔ دوستوں کے دوست بلکہ دشمنوں کے بھی دوست رہے، دلی میں ان کی بہت جائداد تھی، خدمت نے انہیں کھوکھلا کردیا آخر میں ان کا یہی ایک مکان رہ گیا تھا جس میں ۱۹۴۷ء تک رہے، دلی سے انہیں عشق تھا، لیکن یہاں نہیں رہ سکتے تھے۔ شدھ گئے تو ایک گاڑی سے گئے اور دوسری سے لوٹ آئے۔ واحدی صاحب بڑے محنتی اور اصولی آدمی ہیں، انہوں نے اپنی زندگی میں بہت کام کیا بیسیوں ایڈیٹر اور سینکڑوں ادیب پیدا کیے، خواجہ حسن نظامی اپنی ابتدائی زندگی میں واحدی صاحب ہی کے رہین منت رہے۔ خواجہ صاحب نے بھی آخر وقت تک حق دوستی نبھایا، علامہ راشد الخیری سے "شام زندگی" واحدی صاحب ہی نے لکھوائی، علامہ آزاد مزاج آدمی تھے، دنوں قلم ہاتھ میں نہیں لیتے تھے، لوگ خوشامد کرتے، معاوضہ پیشگی دے جاتے مگر وہ توجہ نہ کرتے۔ واحدی صاحب نے نہ جانے کیا منتر پڑھا کہ علامہ کو سولہ آنے اپنے قبضے میں کرلیا، روزانہ انہیں ایک کمرہ میں بند کرکے باہر سے قفل ڈال دیتے، اور جب مقررہ صفحوں کی تعداد پوری ہوجاتی تو انہیں کھول دیتے۔ یوں یہ پوری کتاب لکھوائی گئی۔

خواجہ حسن نظامی دلی سے تین میل کے فاصلہ پر بستی نظام الدین میں رہتے تھے مگر روزانہ انہی کے ہاں بیٹھ کر تصنیف وتالیف کا کام کرتے۔ خواجہ صاحب اور واحدی صاحب کے ایک اور مخلص دیرینہ بھیا احسان تھے جو تھے تو میرٹھ کے رئیسوں میں سے مگر رہتے دلی میں تھے، واحدی صاحب کی طرح یہ بھی وضعدار اور دل والے تھے، ادب کا چسکا اور اخبار کا روگ انہیں بھی ساری عمر لگا رہا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں واحدی صاحب کو بھی دلی چھوڑنی پڑی، یہ گویا ناخن کا گوشت سے جدا ہونا تھا، کراچی کے ایک سرکاری کوارٹر میں اپنے بیٹے کے ساتھ انہیں رہنا پڑا۔ دنوں ان کی آنکھ کا آنسو نہ تھما اس غم کو بھلانے کے لئے واحدی صاحب نے کتابیں لکھنی شروع کیں اور رفتہ رفتہ انہیں صبر آ گیا، خواجہ صاحب بھیا احسان اور دوسرے سب ساتھی رخصت ہوگئے، یہ سب کے ماتم میں سرو چراغاں ہیں۔

علامہ راشدالخیری دہلوی

علامہ راشدالخیری دہلوی

یہ جو ایک بڑی نورانی شکل کے بڑے میاں شپڑ شپڑ کرتے چلے آرہے ہیں علامہ راشدالخیری ہیں، انہوں نے اپنی ساری عمر اسی قلندرانہ وضع میں گزار دی، کبھی اپنا حلیہ درست کرنے کا انہیں خیال نہیں آیا، دراصل انہوں نے اپنی زندگی اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے وقف کر رکھی ہے، سادگی ان کا خاصہ طبعی ہے، بڑے آدمی ہیں مگر چھوٹے آدمیوں کی خدمت کر کے انہیں خوشی حاصل ہوتی ہے، پاس پڑوس، رشتہ، کنبہ، دوست احباب میں گھوم پھر کر سب کی خیریت معلوم کرتے ہیں، کسی کی تکلیف ان سے دیکھی نہیں جاتی، دامے، درمے، قدمے، سخنے، ہر طرح مدد کرنے کو تیار رہتے ہیں، رانڈ بیواؤں کا ان کے گھر میں تانتا بندھا رہتا ہے۔ ان کی بیگم بھی انہیں کی مزاج کی آدمی ہیں، کسی کو کچھ دیتے ہیں تو سیدھے ہاتھ کی خبر الٹے ہاتھ کو نہیں ہوتی۔

رات کا وقت پڑوس میں سے کسی عورت کے رونے کی آواز آئی، مولانا بے قرار ہو کر اٹھے۔ جا کر

پوچھا تو معلوم ہوا شام تک بھر دا سا لال کھیلتا رہا۔ گلے میں کچھ یونہی سی تکلیف تھی، اب لحظہ بہ لحظہ اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے بچہ ہاتھوں میں آ گیا۔ مولانا نے دلاسہ دیا، فوراً تانگہ کر کے نئی دلی پہونچے اور اپنے ساتھ ڈاکٹر چاولہ کو لے کر آئے، ڈاکٹر نے انجکشن دیا، مولانا نے فیس دی ور ابھی ڈاکٹر ڈیوڑھی تک ہی پہونچا تھا کہ ماں کی دلدوز چیخ نے بچے کی موت کا اعلان کر دیا، گھر والے اتنے نادار تھے کہ کفن دفن کا انتظام بھی مولانا ہی کو کرنا پڑا

مولانا نہایت دردمند انسان تھے اس لئے ان کی طبیعت غم پسند ہوگئی تھی، زندگی کے غمناک پہلوؤں ہی کو انہوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں کا موضوع بنایا، سب سے زیادہ مظلوم مخلوق انہیں مسلمان عورت دکھائی دیتی تھی۔ اسی کی حمایت میں وہ عمر بھر لکھتے رہے، اپنی موثر غم انگیز تحریر کے باعث وہ مصور غم کہلائے۔

جو لوگ حزن پسند ہوتے ہیں عموماً جھینے مزاج کے بھی ہوتے ہیں مگر مولانا اپنی نجی زندگی میں بڑے خوش مزاج اور بذلہ سنج تھے، خوب ہنستے ہنساتے تھے، بڑے آدمیوں سے ملنے میں انہیں پس وپیش ہوتا تھا مگر برابر والوں اور چھوٹوں سے جی کھول کر باتیں کرتے تھے دوسروں کی باتوں سے بھی لطف اٹھاتے تھے، خصوصاً جب کسی سے کوئی غلطی ہو جائے ایک بزرگ نے فرمایا

میں ان سے خوب بھینچ بھینچ کر گلے ملا (بھینچ بروزن کھینچ) مولانا پھڑک گئے، پوچھا کیسے ملے؟ وہ بولے بھینچ بھینچ کر، بار بار ان سے پوچھتے تھے اور ہنستے تھے پھر بولے ''اچھا کاغذ قلم لاؤ اور ایک شعر لکھ لو، ابھی موزوں ہوا ہے۔

جو پودوں کو پانی دیا سینچ سینچ
لگے ملنے گل بھی گلے بھینچ بھینچ

مولانا کی خوش مزاجی بستر مرگ پر بھی قائم رہی جو کوئی بیمار پرسی کو آتا، س سے ہنسی کی باتیں کرتے، ان کے بھانجے محمد میاں نے پوچھا۔

''کیوں ماموں جان، جارج پنجم کے بعد تو اس کا بیٹا ہی بادشاہ بنے گا؟''

مولانا نے فرمایا ''نہیں آپ کے حق میں وصیت کئے جا رہے تھے۔''

پنڈت امر ناتھ ساحر دہلوی

دلی کے آخری دور کے ذی فخر لوگوں میں سے پنڈت جی بھی تھے، عمر ستر اور اسی کے درمیان،

اونچا پورا قد، بہت لمبی چوڑی داڑھی، ریٹائرڈ تحصیلدار تھے، میر ناصر علی کی طرح ان کی پنشن پانے کی مدت بھی ملازمت کی مدت سے تجاوز کر گئی تھی۔ اردو شاعری کے عاشق و استاد تھے، فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، مگر اتنے گہرے اور ادق عرفانی مضامین باندھتے کہ سامعین کے پلے کچھ نہ پڑتا، پنڈت جی دلّی کے پرانے وضع دار ہندوؤں کا آخری نمونہ تھے، ان کی عبا قبا، جبہ و دستار دیکھ کر یہ بتانا مشکل ہوتا کہ یہ ہندو ہیں یا مسلمان، ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ دلّی کے ہندو مسلمانوں کے لباس اور بول چال میں پہلے کوئی نمایاں فرق نہیں ہوتا تھا پنڈت جی کی زبان بھی چغلی نہیں کھاتی تھی، یہی کیفیت ہم نے پنڈت دتاتریہ کیفی اور پنڈت تربھون ناتھ زار کی بھی دیکھی، پنڈت جی بہت خلیق اور متواضع آدمی تھے، ایک دفعہ چند لڑکے رات گیارہ بجے ان کے گھر پہونچ گئے چوڑی والان سے جو راستہ بازار سیتارام کو جاتا ہے اس سرے پر ان کا بالا خانہ تھا، کنڈی کھڑکی تو پنڈت جی ہاتھ میں لالٹین لئے زینے پر سے اترے۔ پوچھا'' کیسے زحمت فرمائی؟ لڑکوں نے کہا'' ہمیں آپ کا کلام سننے کا اشتیاق ہے، صبح کی گاڑی سے ہمیں واپس جانا ہے'' پنڈت جی نے فرمایا'' کیا مضائقہ ہے'' اور خندہ پیشانی سے سب کو اپنے ساتھ اوپر لے آئے۔ کمرہ کھول کر آرام سے بٹھایا، جل پان پیش کیا اور اپنا کلام انہیں سنا کر رخصت کرنے نیچے تک آئے۔

اسکول اور کالج کے لڑکے جب چاہتے پنڈت جی کو مشاعرے کی صدارت کے لئے لے جاتے، بعض بدتہذیب لڑکے پنڈت جی سے بدتمیزی کرجاتے تو پنڈت جی ناراض ہوجاتے مگر فوراً من بھی جاتے، ایک مقامی کالج کے مشاعرے میں ایک صاحب زادہ نے پنڈت جی کو مخاطب کرکے مطلع پڑھا۔

یہ کہنا جا کے بیٹا اپنی ماں سے
کہ تم روٹھی ہو کیوں ابا میاں سے

پنڈت جی کی آنکھیں ابل پڑیں بولے'' کیا مضائقہ ہے، صاحبزادے تمہارے باپ سے شکایت کروں گا'' دوسرے لڑکوں نے کہا'' پنڈت جی اس گستاخ کو معاف کردیجئے، ہاتھ جوڑ رہا ہے۔'' پنڈت جی مسکرائے اور بولے'' ادھر لاؤ اسے میں اس کے کان کھینچوں گا'' پھر محبت سے کان کھینچ کر بولے۔'' کیا مضائقہ ہے، باادب بانصیب بے ادب بے نصیب جاؤ۔''

پنڈت جی خود بھی سالانہ مشاعرہ بڑے پیمانے پر کرتے تھے مہمانوں کے قیام وطعام کا انتظام کرتے، دور دور سے شعراء ان کے مشاعرہ میں شریک ہونے آتے، دہلی میں اس مشاعرے کی دھوم مچ جاتی، پنڈت جی کے بعد اس شان کے مشاعرے دلّی میں دیکھنے میں نہیں آئے۔

مولانا خلیقی دہلوی

اب سے چالیس سال پہلے ''ادب لطیف'' کی تحریک طاعون کی طرح پھیلی۔ اس کی محرک بڑی حد تک ٹیگور کی گیتانجلی تھی۔ اس دور کے ادیبوں کو یک نئی چیز ہاتھ آئی کہ ایسے بھی چھوٹے چھوٹے خیالی مضامین لکھے جاتے ہیں جن میں خوبصورت فقرے اور اچھوتی ترکیبیں ہوں چاہے مطلب کچھ بھی نہ نکلتا ہو نیاز فتحپوری نے گیتانجلی کا ترجمہ عرضِ نغمہ کے نام سے کر دیا اور انگریزی سے ناواقف دیبوں نے اسی انداز پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ بعض اچھے ادیب بھی اسی سستے رنگ میں رنگ گئے۔ یلدرم، نیاز، دلگیر، مہدی افادی، ل احمد اور خلیقی دہلوی نے خوب خوب قلم کی جولانیاں دکھائیں اس جتھے کے پہلے سرغنہ شاہ دلگیر اکبرآبادی تھے، نقاد کے ایڈیٹر جن کے بعد دوسرے لیڈر نیاز فتحپوری، نگار کے ایڈیٹر، اس ٹولی میں بیان کے

مولانا محمد دین خلیقی دہلوی

ساتھ ساتھ خیال کے بانکپن کا جس نے سب سے زیادہ لحاظ رکھا، وہ ایک صاحب تھے محمد دین خلیقی دہلوی، تھے تو تجارت پیشہ آدمی مگر ادب کا بڑا ستھرا مذاق رکھتے تھے، کوئی اچھوتی ترکیب جھ میں آ جاتی تو گھنٹوں اس کا لطف لیتے، لکھتے بہت کم تھے اور مختصر لکھتے تھے، مگر جو کچھ لکھتے یہ معلوم ہوتا کہ نگینے جڑ دیے ہیں جس طرح شاعر اپنی غزل یا نظم سناتا ہے یہ اپنی نثر سناتے تھے، ان کے اکثر فقرے کانوں میں گونج رہے ہیں، کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں

> ''ایک دن بستی والوں نے دیکھا کہ چشمے کا پانی شراب بن گیا ہے،
> شراب اس لئے بن گیا ہے کہ صبح کے وقت قدِ آدم انسانی آئینے اس میں
> معتدل کیے جاتے تھے۔ (یعنی عورتیں اس میں نہایا کرتی تھیں)

خلیقی صاحب اپنے نثر پاروں کی داد پاتے تو ازراہِ انکسار فرماتے ''تنگ قلم ہوں''۔ باتیں کرنے میں بھی اکثر مغلق الفاظ بولتے تھے، یہ عادت غالباً انہیں مولانا عبدالسلام صاحب کی صحبت میں

پڑی تھی، خلیقی صاحب نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ انہیں دل کا عارضہ ہو گیا تھا اور یہ بھی انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ مرض لا علاج ہے۔ خاصے بھاری بھرکم آدمی تھے، بیماری میں گھلتے چلے گئے، فرماتے تھے کہ ''مجھے اس کی خوشی ہے کہ بیماری سے مر رہا ہوں۔''

قاری سرفراز حسین دہلوی

قاری سرفراز حسین دہلوی

میرے والد کے پاس جو حضرات اکثر آتے تھے اور جن کے گھر وہ اکثر جایا کرتے تھے ان میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی بڑے کلّے ٹھلّے کے تھے، دہرا ڈیل، کسرتی بدن، سر پر کرشی کی ترکی ٹوپی، کالا فراک کوٹ، سفید پتلون پاؤں میں ڈاسن کا کالا شو، دائیں ہاتھ میں چھڑی، بائیں ہاتھ میں سفید دستانے، گول چہرہ، گیہواں رنگ، کشادہ پیشانی، ستواں ناک، کترواں مونچھیں، مختصر سی خوشنما داڑھی، آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ، ان سے ہمارے گھر میں پردہ نہیں کیا جاتا تھا، ابّا انہیں دیکھتے ہی کھل جاتے اور اپنی ساری سنجیدگی و بردباری بالائے طاق رکھ دیتے، یہ تھے قاری سرفراز حسین عزمی دہلوی جو اپنی باتوں سے ظرافت کے پھول کھلاتے رہتے، زندہ دل بڑے خوش کلام، ان کی شخصیت بڑی پہلودار تھی، رنڈیوں کی زندگی پر انہوں نے آٹھ دس ناول لکھے جن میں سب سے مشہور ''شاہد رعنا'' ہے۔ یہ وہی کتاب ہے جسے دیکھ کر مرزا ہادی رسوا نے ''امراؤ جان ادا'' لکھی۔ ناولوں کے علاوہ قاری صاحب نے علم الکلام پر بھی ایک کتاب لکھی تھی، تبلیغ کے سلسلے میں انگلستان اور جاپان گئے تھے۔

قاری صاحب اس قدر خوش گفتار تھے کہ لوگ ان کی باتیں سننے کے لئے ترستے تھے، مذہب، ادب، سیاست، تاریخ، فنون، کسی گھر بند نہیں تھے، ایک دفعہ مسوری میں ایک رئیس نے چاہا کہ قاری صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی باتوں سے ان کا جی بہلائیں، قاری صاحب نے ٹالنے کے لئے کہہ دیا کہ میں سو روپے فی گھنٹہ لوں گا، وہ بھی بگڑے دل رئیس تھے، دو سو روپے روزانہ قاری صاحب کو دیتے رہے اور قاری صاحب وہ روپیہ انجمن اسلامیہ کو بھیجتے رہے۔

۱۹۱۱ء میں شیخ عبدالقادر کی سرپرستی میں علامہ راشد الخیری نے رسالہ تمدن جاری کیا، اس کے پہلے پرچے میں قاری صاحب کا بھی ایک مضمون شائع ہوا عنوان تھا ''انسان، فرشتے کی عینک سے'' یہ مضمون ڈپٹی نذیر احمد کے نزدیک بہت قابل اعتراض تھا، اس لئے کہ اس میں مذہبی روایات کا مذاق اُڑایا گیا تھا، ڈپٹی صاحب علامہ راشد الخیری کے پھوپھا تھے، فوراً ان کی طلبی ہوئی، ڈپٹی صاحب نے بڑی لعن طعن کی، ان کے بعد قاری صاحب پیش ہوئے، ڈپٹی صاحب ان پر بھی خوب برسے، دونوں نے توبہ تلا کی اور معاملہ رفع دفع ہوا، اس کے بعد قاری صاحب نے اپنے کسی مضمون میں مذہب کا مذاق نہیں اُڑایا بلکہ خود مذہب کی طرف ڈھل گئے اور مبلغ بن کر سمندر پار ملکوں میں گئے، خوش گفتار تو تھے ہی تقریر اردو میں بھی اچھی کرتے تھے اور انگریزی میں بھی۔

آخری عمر میں گوشہ گیر ہو گئے تھے اور کتابیں لکھا کرتے تھے، جب ہاتھ میں رعشہ آ گیا تو ایک منشی رکھ لیا تھا۔ قاری صاحب بولتے جاتے اور منشی لکھتا رہتا، مگر قاری صاحب اس سے مطمئن نہیں ہوتے تھے اور کبیدہ خاطر رہتے تھے خود لکھنے کی کچھ اور ہی بات ہوتی ہے۔

۱۹۳۰ء میں جب میں نے ساقی جاری کیا تو قاری صاحب نے ایک ناول ''ثروت دلہن'' اپنے منشی سے لکھوایا۔ یہ ناول قسط وار ساقی میں شائع ہوا۔

خواجہ حسن نظامی دہلوی

دلّی سے تین میل دور بستی نظام الدین میں خواجہ حسن نظامی صاحب رہتے تھے، خواجہ صاحب دین اور دنیا دونوں میں کامیاب رہے، وہ اپنی شہرت اور کامیابی کے لئے ہر ذریعہ اختیار کرتے تھے، سب سے پہلے تو ان کی نرالی دھج تھی کہ ہزاروں کے مجمع میں نظر ان ہی پر پڑتی تھی، سر پر زرد کلاہ نما ٹوپی، شانوں پر زلفیں لہراتیں، کشادہ پیشانی، سنہری فریم کی عینک، ہونٹوں پر لاکھا جما ہوا، کترواں لبیں، چھریری داڑھی ٹخنوں تک خاکی جبہ آنکھوں میں مقناطیسی کشش تحریر و تقریر دونوں کے بادشاہ تھے۔

سلطان جی کی درگاہ کے مجاوروں میں سے تھے، بچپن ہی میں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے، پھیری پر کتابیں بیچتے اور اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ پالتے مگر جوہر فطری نے انہیں اس پستی پر قانع نہ ہونے دیا اور ایک وقت ایسا آیا کہ خواجہ صاحب آفتاب بن کر چمکے، کئی لاکھ مریدوں کے پیر بنے، پانسو کتابوں کے مصنف اور مؤلف، بیسیوں اخبار، رسالوں کے ایڈیٹر، اللہ نے مال و دولت سے بھی سرفراز فرمایا، مگر اتنے بلند مراتب حاصل ہونے کے بعد بھی ان کی وضع داری میں فرق نہ آیا، غرور و تکبر

خواجہ حسن نظامی دہلوی

ان کے پاس تک نہ پھٹکا۔ جن سے جیسے تعلقات ابتداء میں تھے ویسے ہی آخر تک رہے، صرف ایک پرانے رفیق سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست سے آخر میں بگاڑ ہو گیا تھا، خواجہ صاحب نے سردار جی سے بارہا صلح صفائی کرنی چاہی مگر وہ بھی بڑے ہٹیلے آدمی ہیں، اپنی ضد پر اڑے رہے اور خواجہ صاحب کے خلاف لکھتے رہے مگر خواجہ صاحب نے ان کی کڑوی کسیلی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔

خواجہ صاحب نے تبلیغی کام بھی بہت کیا، جب شدھی در سنگھٹن نے زور باندھا تو خواجہ صاحب خم ٹھونک کر میدان میں آگئے، سوامی شردھانند سے مباہلہ کرنے کے لیے انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ جامع مسجد کے مینار پر سے دونوں کو دیڑیں جو راہ حق پر ہوگا وہ بچ رہے گا، مگر سوامی جی نے اس چیلنج کو منظور نہیں کیا۔

ایک دفعہ ایک معاملہ میں مولانا محمد علی سے خواجہ صاحب کی ٹھن گئی دونوں طرف سے دھواں دھار مضامین لکھے گئے۔ خواجہ صاحب عجیب عجیب سرخیوں کے پوسٹر بھی لکھ کر شہر میں لگواتے تھے، مولانا نے خواجہ صاحب ہی کو قد آدم پوسٹر کہنا شروع کر دیا تھا، چند بھلے آدمیوں نے بیچ میں پڑ کر اس ناگوار قضیہ کو ختم کرایا۔

خواجہ صاحب کی غیر معمولی کامیابی نے ان کے بہت سے حاسد پیدا کر دیے تھے، ان میں سے بعض ان کی جان کے لاگو بھی ہو گئے تھے ایک دن ایک آریہ سماجی انہیں قتل کرنے کے ارادے سے ان کے کمرے میں گھس آیا، خواجہ صاحب بالکل اکیلے تھے مگر ذرا نہ گھبرائے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈپٹا ”کیوں آیا ہے؟ واپس چلا جا“ وہ ایسا مرعوب ہوا کہ فوراً واپس چلا گیا۔ ایک دفعہ شہر سے اپنی بستی میں رات کو کچھ دیر سے پہنچے، جب ان کی کار گیرج کے قریب پہونچی تو کسی نے تین چار فائر کیے اور بھاگ گیا۔ خواجہ صاحب تو بچ گئے مگر ان کے خسر کے گولی لگی اور انہوں نے وہیں دم دے دیا۔

خواجہ صاحب انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے مگر وائسرائے تک سے مل لینے میں انہیں بار نہیں ہوتا تھا۔ حکام سے سفارش کر کے انہوں نے ہزاروں کے کام نکالے، مگر خود کبھی حکام رسی سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

بڑی پہلودار شخصیت تھی خواجہ صاحب کی۔ صوفی صاف باطن تھے، پیر تھے مسلمانوں کے پیر تھے، صاحب طرز انشاپرداز تھے، بہت بڑے صحافی تھے اور بہت بڑے انسان تھے۔

خواجہ حسن نظامی دلی کی تہذیب کے موتم تھے ع

اُن کے مرنے سے مرگئی دلّی

مولانا عبدالسلام دہلوی

دلّی کے ایک قلندر مزاج بزرگ تھے، چار ابرو کا صفایا، گول چہرہ، کھلتا ہوا رنگ، سر پر دوپلی، ململ کا کرتا اور چست پاجامہ، پاؤں میں زری کی جوتی، ان کے علم و فضل کی دھاک بڑے بڑوں کے دلوں پر بیٹھی ہوئی ہے، جس علم سے کہو وجود باری تعالیٰ ثابت کر دیتے تھے عربی فارسی کی تمام پرانی کتابیں نہیں پڑھی تھیں، جو روند جاتا، اللہ میاں سے ناتا۔ چھڑا دم، کتابیں تھیں اور طالب علم، شاگرد دلی میں مشکل ہی سے کسی کو قبول کرتے تھے، کچھ لیتے لواتے تو تھے ہی نہیں اس لئے ان پر کسی کا بس نہیں چلتا تھا، کسی کو شاگرد بناتے تو پہلے اس کا امتحان لیتے اور وہ بھی اتنا سخت کہ شاگرد توبہ کرتا ہوا وہاں سے بھاگ جائے، گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ دیکھئے اور شاگرد سے جناب کا یہ ارشاد کہ ”جا بے دھوپ میں کھڑا ہو جا“ اب وہ غریب صحن میں کھڑا سنک رہا ہے اور جناب اندر پڑے پنکھا جھل رہے ہیں۔ کسی کو ذرا ای خطا پر درے باندھ کر مارتے اور اف تک کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ نیا شاگرد پہلے ہی دن بھاگ کھڑا ہوتا، مگر جوان کی آزمائش کی آگ میں تپ جاتا ہے وہ پھر کندن بھی بن جاتا ہے۔

مولانا عبدالسلام نیازی دہلوی

وہ دیکھئے سامنے سے مولانا جھومتے چلے آرہے ہیں، قوی الجثہ آدمی ہیں کوئی نہیں جانتا ہو

تو پہلوان سمجھے، سر اور چہرے پر مشین پھری ہوئی ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بھدرا کرا کے چلے آرہے ہیں، پان کھاتے ہیں، اونچی آواز میں بولتے ہیں تیل بیچتے ہیں اور روکھی سوکھی کھاتے ہیں، صوفی منش ہیں، قوالی شوق سے سنتے ہیں، رنڈیوں کا گانا بھی سن لیتے ہیں، صوفیوں کے حلقے میں بیٹھتے ہیں تو ان کے لتے لے ڈالتے ہیں، ان کے علم وفضل کا دریا سب کو تنکوں کی طرح بہا لے جاتا ہے، عرسوں میں شریک ہوتے ہیں، ایک عرس میں جہاں بڑا بڑا جغادری صوفی بیٹھا تھا مولانا بھی تشریف فرما تھے کہ ایک حسین طوائف لانگتی پھلانگتی آگئی اور اس کے پیچھے پیچھے اس کی نائکہ بھی، ایک دل پھینک صوفی نے حل جلالہ' کہہ کر طوائف کو اپنے پاس بٹھالیا، مولانا نے نائکہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

''یہ عم نوالہ بھی ساتھ ہیں، انہیں بھی سنبھالئے''۔

مولانا نے بلا کا حافظہ پایا تھا، دلی کی ایک مشہور طوائف کا مجرا ہورہا تھا، مولانا نے اسے ٹوک کر کہا:

''کیا پانچ پانچ سات سات شعر کی غزلیں سنا رہی ہو؟ تمہیں جو لمبی سے لمبی چیز یاد ہو سناؤ۔''

طوائف بھی پرانی تعلیم کی عورت تھی سوڈیڑھ سو بند کا ایک خمسہ اس نے شروع کر دیا اور دو گھنٹے کی خبر لائی۔ مولانا ساتھ ساتھ اشعار پڑھتے جاتے تھے اور جب اس نے خمسہ ختم کر دیا تو مولانا نے شروع سے آخر تک لفظ بلفظ وہی خمسہ دُہرا دیا۔

مولانا اپنے آگے کسی کو نہیں گانٹھتے تھے، جوش ملیح آبادی مولانا کی تعریف سن کر ملنے گئے، مولانا اچھی طرح ملے مگر جب وجود باری تعالیٰ پر جوش صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا تو مولانا چمک گئے اور بولے:۔

''تمہارا دماغ شیطان کی کھڈی ہے۔''

اس کے بعد سینکڑوں شعر اقبال کے سنا ڈالے اور کہا:

''بس شاعر تو اقبال ہے۔''

مولانا حیدر آباد دکن بھی گئے تھے کسی نے مشورہ دیا کہ آپ حضور نظام کی خدمت میں پیش ہو جائیں تو کچھ وظیفہ مقرر ہو جائے گا۔ مولانا نے بگڑ کر کہا:

''اگر تمہارے نظام کی ساری دولت ایک پلڑے میں رکھی جائے اور میرا ایک بوسیدہ سے بوسیدہ بال دوسرے پلڑے میں تو انشاءاللہ میرا بال ہی بھاری اترے گا۔''

مولانا کو جب جلال آتا تو ان کی تقریر سننے کے قابل ہوتی، نہایت مرصع اور مغلق فقرے ہوتے تھے۔ ایک طوائف کے متعلق ارشاد ہوا کہ:

''اس شستِ انگی کے لئے تو عمود زریں ہی چاہئے۔''

مولانا کو لکھنے کا شوق نہیں تھا، ایک آدھ مضمون لکھا بھی وہ خاصہ پھسپھسا تھا مگر بولنے میں کوئی ان کے آگے دم نہ مار سکتا تھا۔

مولانا دلّی ہی میں رہے اور ہمیشہ اکیلے رہے، ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں ایک سکھ کرپان لئے مولانا کے گھر میں گھس آیا، مولانا نے ایک ڈانٹ پلائی، اس پر کچھ ایسی دہشت طاری ہوئی کہ کرپان اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھگ گیا۔

آغا شاعر قزلباش دہلوی

پنڈت امرناتھ ساحر کے ایک سالانہ مشاعرے میں جس کی صدارت میر ناصر علی کر رہے تھے، ایک بڑے میاں ڈھیلا ڈھالا سا صافہ لپیٹے اپنا کلام سنانے صدر مقام پر ہائے ہائے کرتے آئے، گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، سفید مونچھیں، داڑھی منڈی ہوئی، ہاتھ پاؤں بے قابو، دوزانو بیٹھنے کے بعد جب سانس ٹھیک ہو گیا تو جناب صدر کی طرف دیکھ کر انہوں نے کہا ''چیں!'' معلوم ہوا کہ اجازت چاہی ہے، پھر رونی آواز میں سامعین سے کہا ''استاد کی رباعی تبرکاً پڑھتا ہوں'' رباعی جو پڑھی تو آواز ایسی نکلی جیسے بادل گرج رہا ہو، یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ وہ ایں بے بسی یا بہ ایں شور شوری؟ معلوم ہوا کہ یہ صاحب جب سناتے ہیں تو اپنی تکلیفیں بھول جاتے ہیں، نام آغا قزلباش ہے، داغ کے چہیتے شاگرد ہیں۔ تحت اللفظ پڑھتے استاد ہی کی طرح پڑھتے ہیں، داغ کو پڑھتے نہ سنا ہو تو انہیں سن لو، استاد کی رباعی ختم ہوئی تو تحسین و آفرین کے شور سے لالہ پدم داس کی حویلی گونج گئی، آغا صاحب نے اپنا کلام سنانا شروع کیا تو ہر ہر شعر پر

آغا شاعر قزلباش دہلوی

قیامت برپا ہوتی رہی، جب غزل ختم کی تو پھر بیدم ہو گئے اور نقاہت کی وجہ سے خود ڈائس سے نہ اتر سکے۔ سر پرست صاحب نے سہارا دے کر اتارا اور اپنے پاس بٹھا لیا، آغا بہت بیمار تھے، تھوڑی دیر بعد چلے گئے، ان کی جوانی مشہور تھی، بڑے دیدور جوان تھے، ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے اور سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے تھے، اب یہ صورت تھی کہ بیماری اور ناداری نے انہیں ایک ڈراونی چیز بنا دیا تھا، ان کے جاننے والے اب انہیں دیکھ کر آنکھیں چراتے اور دور ہی سے کترا کر نکل جاتے، برے وقت کا ساتھی کوئی نہیں، بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ کوئی سہارا لگانے والا نہیں تھا، جن ریاستوں میں جوانی گزاری ان ریاستوں کے رئیس مر کھپ گئے، ایسے بوڑھے بیل کو کون بھس دے؟ ناچار اپنے پرانے دوستوں اور قدر دانوں کے گھروں پر جاتے مگر وہ بھی کب تک ساتھ دیتے؟ اُپرانے لگے اور اندر ہی سے کہلو نے لگے کہ "نہیں ہیں"۔

آغا صاحب شاعر تو بڑے تھے ہی، انہوں نے ناول بھی لکھے اور ڈرامے بھی، پورے قرآن شریف کا ٹکسالی اُردو میں منظوم ترجمہ بھی انہوں نے کیا تھا، کاش وہ ترجمہ چھپ جائے۔

آغا کا آخری وقت ایسا خراب ہوا کہ اللہ دشمن کا بھی نہ کرے، کسی دوست کو دیکھ تو آبدیدہ ہو گئے، جامع مسجد کو دیکھا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے، لال قلعہ کو دیکھا تو رونے لگے غرض یونہی روتے دھوتے دنیا سے سدھارے۔

مرزا حیرتؔ دہلوی

دریبے میں پائے والوں کی طرف سے داخل ہو کر چند قدم چلنے کے بعد ایک تین در کی دکان بائیں ہاتھ کو آتی ہے۔ اس کے تھڑے کی طرف گاؤ تکیے سے لگے ایک بزرگ بیٹھے رہتے تھے، گورا رنگ، سفید بُراق سر سیدی ڈاڑھی، غلافی آنکھیں، گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں، لبوں پر پان کی سرخی، یہ مرزا حیرتؔ دہلوی تھے، بہت بڑے عالم تھے، مگر دماغ تخریب کی طرف مائل تھا، ہنگاموں ہی کو وجہ رونق سمجھتے تھے۔

دلّی میں چھاپے کی مشین سب سے پہلے انہوں نے ہی لگائی تھی اور کرزن گزٹ جاری کیا تھا، اس اخبار میں جس کی چاہتے خبر لیتے، جس کی چاہتے ٹوپی اتار لیتے، شورش پسند آدمی تھے، نت نئے ہنگامے برپا کرتے رہتے تھے، واقعہ کربلا ہی سے انکار کر دیا تھا اور حساب لگا کر یہ بتایا تھا کہ جس زمانہ میں اس کا واقع ہونا بتایا جاتا ہے گرمی کا موسم ہی نہ تھا بلکہ سخت سردی کا زمانہ تھا، مولانا حالیؔ نے مسدس

مدوجزر اسلام لکھی تو دنوں اس کی تردید و تضحیک میں مضامین لکھتے رہے، حالی فرماتے ہیں۔ ع

عرب کچھ نہ تھا اک جزیرہ نما تھا

مرزا حیرت نے اس پر فرمایا۔

ذرا دیکھئے تو یہ کیا کہہ رہے ہیں

عرب کو جزیرہ نما کہہ رہے ہیں

ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ قرآن شائع ہوا تو اسکے فوراً بعد ہی مرزا حیرت کا ترجمہ قرآن شائع ہوئیں ور اس کا سائز بھی رکھا تو گز بھر کا۔ شبلی نعمانی کے ساتھ حیدر آباد دکن گئے، سر سالار جنگ کی خدمت میں دونوں پہونچے، شبلی نے مرزا کی تعریف کر کے تعارف کرایا، سالار جنگ نے مرزا سے کلام سننے کی فرمائش کی، مرزا نے شبلی کی ایک تازہ نظم سنانی شروع کردی۔ شبلی نے ٹہوکا دیا تو چٹکی لے کر انہیں خاموش کر دیا، سالار جنگ نے ایک ہزار روپیہ انعام دیا۔ باہر نکل کر شبلی نے کہا:

"یہ کیا حرکت تھی آپ کی؟"

بولے: "تم سناتے تو تمہیں پھوٹی کوڑی بھی نہ ملتی، مجھے ہزار روپے تو مل گئے"۔

جب مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی کی چلی تو مرزا حیرت مولانا کے طرفداروں میں ہو گئے اور اپنے اخبار "دورِ عمر" میں خواجہ صاحب کے خلاف لکھنے لگے، ایک دن مرزا حیرت اپنی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک بدمعاش نے کسی بات پر جھگڑا کر کے ان پر ہاتھ چھوڑ دیا تھا، لوگوں نے بیچ بچاؤ کیا مگر اس کمبخت نے ایک جوتا ایسا کھینچ کر مارا کہ مرزا کے منہ پر لگا، اس دن کے بعد سے مرزا حیرت نے دکان پر سامنے کے رخ بیٹھنا چھوڑ دیا۔

مرزا حیرت کے انتقال کے بعد ان کا نایاب اور قیمتی کتب خانہ لال کنوئیں پر ایک کباڑیے کے ہاں برسوں کوڑیوں کے مول بکتا رہا۔

دلّی کی یاد آئی تو دلّی کی وضعدار ہستیوں کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگی، ان کا تذکرہ زلفِ یار کی طرح درازہی ہوتا چلا جاتا ہے، یا اسے شبِ فراق کی درازی سے مشابہ سمجھئے، آنکھیں اب ان صورتوں کو ڈھونڈتی ہیں اور ماضی کے دھندلکے میں نظریں بھٹک کر مایوس لوٹ آتی ہیں۔

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

دلّی کا غسلِ خونیں

توبہ توبہ! تھوتھو! شیطان کے کان بہرے ـــــ اب سے دُور دلّی پر وہ بپتا کا وقت پڑا کہ خلقِ خدا تراہ تراہ پکار اٹھی۔ وہ بیرا کھیری مچی کہ مرد، عورت، بوڑھے، بچے، سب کھیرے ککڑی کی طرح کاٹے جانے لگے۔ انسانیت دم توڑ چکی تھی اور فتنہ و فساد کا شیطان ننگا ہو کر ناچ رہا تھا دلّی کے ان بازاروں میں جہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا ہُو کا عالم ہو گیا تھا۔ جہاں کبھی جُمن برساتی تھی وہاں بھیروں ناچ رہا تھا۔

شام کے ۶ بجے سے صبح کے ۶ بجے تک کرفیو لگا رہتا۔ فوجیں گشت کرتی رہتیں اور فوجی جوان اونچی بنے ناکوں پر کھڑے رہتے، ٹھائیں ٹھائیں گولیاں چلتیں۔ دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہوتی رہتیں، مگر صرف مسلمانوں کی۔ حکومت کا نظریہ یہ تھا کہ اس سارے شر اور فساد کی جڑ مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کے گھروں کی تلاشیاں ہوتیں، ترکاری کاٹنے کی چھری بھی اگر کسی کے گھر میں نکل آتی تو اس گھر کے سارے مرد گرفتار کر کے جیل میں ٹھونس دیے جاتے۔ اوّل تو مسلمان افسر ہی دلّی میں کہاں تھے؟ اور جو تھے انہیں بے دست و پا کر دیا گیا تھا۔ ان کے گھروں پر پہرے بٹھا دیے گئے تھے۔ ان کے لائسنس ضبط کر لیے گئے تھے اور ان کے اسلحہ مال خانوں میں داخل ہو گئے تھے۔ پولیس کے مسلمان ملازموں سے رائفلیں لے لی گئی تھیں اور انہیں ڈنڈے تھما دیے گئے تھے۔ دکھاوے کے لیے دلّی کے حاکمِ اعلیٰ ایک مسلمان صاحب ہی تھے۔ مگر وہ اپنی بڑی سی کوٹھی میں ایک طرح سے نظر بند ہی تھے۔ وہ بیچارے مسلمانوں کے لیے کیا کرتے؟ خود اپنی خیر منا رہے تھے۔ کہنے کو پنڈت جواہر لال نہرو وزیرِ اعظم تھے اور وہ واقعی اپنی ذات سے چاہتے تھے کہ دلّی میں امن و امان رہے۔ مگر وقتی سیاست میں ان کا خلوص بے اثر ثابت ہو رہا تھا۔ ان کے ڈپٹی پٹیل کا سکہ چل رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے مسلمانوں سے باپ مارے

کا پیر تھا۔ وہ اس پر تل گیا تھا کہ دلی ہی نہیں سارے ہندوستان کو مسلمانوں سے خالی کرالے اور سارے مسلمانوں کو پاکستان کی طرف ہانک دیا جائے۔ گاندھی بار بار کہتا تھا "ارے کم بختو ایسا مت کرو، اگر تم نے سارے مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال دیا تو پھر تم کھاؤ گے کس کو؟"

گاندھی سیاست کا پرانا گھاگ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہندوؤں کی بالادستی اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک کہ مسلمان زیردست رہیں گے۔ ان بیوقوفوں کی گاڑھی کمائی کسی نہ کسی ذریعے سے سمٹ سمٹا کر ہندوؤں کے خزانوں میں آ جاتی ہے، انہیں اگر نکال باہر کیا تو ہندو خود ایک دوسرے کو کھانے لگے گا۔ مگر اس دانشمند بوڑھے کی بات کسی نے نہ مانی۔ پنجاب سے آنے والے شرنارتھیوں کی مبالغہ آمیز کہانیوں نے مسلمانوں کے خلاف بھڑکے ہوئے جذبات کو اور ہوا دی۔ جو بھی ادھر سے آتا دلی ہی کا رخ کرتا۔ دلی کی آبادی بڑھتے بڑھتے ۳۵ لاکھ ہو گئی۔ جہاں دیکھو جدھر دیکھو شرنارتھی۔ مقامی ہندوؤں نے پہلے تو ان کی آؤ بھگت کی۔ اور اکثر نے انہیں اپنے گھروں میں جگہ دی، مگر جلد ہی میزبانوں کو تجربہ ہو گیا کہ ان پردیسی ہندوؤں سے دیسی مسلمان اچھے تھے، ان لٹے پٹے ہوؤں نے گھروں پر بھی قبضہ کر لیا اور بازار پر بھی۔ اب یہ کھانے بھی لگے اور غرانے بھی لگے۔ سانپ کے منہ کی چھچھوندر نہ اُگلی جائے اور نہ نگلی جائے۔ نگلے تو اندھا، اُگلے تو کوڑھی!

چاندنی چوک میں ۵ بازار اور قائم ہو گئے، پٹریوں پر شرنارتھی ہر قسم کا سودا لے کر قطار در قطار جم گئے۔ دکانوں تک اب کوئی گاہک پہونچ ہی نہیں سکتا تھا اور گاہک پہونچے بھی کیوں؟ اسے اپنی ضرورت کی چیز کم داموں پر ان خاک نشینوں سے مل جاتی تھی، ایک قطار سے گاہک بچ نکلتا تو دوسری قطار والے اسے اچک لیتے، غرض دکانداروں کے نتھنے ڈھیلے ہونے شروع ہو گئے، دھمکیوں سے کام نہ چلا تو خوشامد پر اُتر آئے، مگر معاملہ روٹی کا تھا، نہ دھمکیاں کام آئیں نہ خوشامد۔ میونسپل کمیٹی کو آسیا کہ پٹریاں اس وبال سے صاف کرائے مگر رز ولوشن ہی پاس ہو ہو کر رہ گئے، مقامی پولیس کی کیا شامت آئی تھی جو اس بھڑوں کے چھتے کو چھیڑتی سارے شہر کا امن و امان تہس نہس نہ ہو جاتا؟ ذرا سی بات پر شرنارتھی اُدھم مچا دیتے تھے۔

سڑکوں پر آلو چھولے والوں کے ٹھیلے، دہی بڑوں کی چاٹ والے اور سب سے بڑھ کر گوشت کے پکوان والے، خالصاؤں کی جھٹکا گاڑیاں اڑی رہتیں، محلوں میں بکرے اور سور کاٹے جا رہے تھے اور ان کے تکے سربازار بھونے جا رہے تھے۔ شہر کے ہندو اور ان کی عورتیں جب قریب سے گزرتیں تو

چربی کا بھبکا ان کے دماغوں کو چڑھتا اور وہ رام رام کرتی وہاں سے بھاگتیں، بہو بیٹیوں کی عزت ویسے ہی محفوظ نہیں رہی تھی۔ یہ دلّی کے مسلمان پڑوسی تو تھے نہیں کہ انھیں اپنی ماں بہن اور بیٹیاں سمجھتے، ذرا کسی نے تیوری بدل کر بات کی اور مہمان مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے۔ صبح ہوتے ہی ان کی عورتیں دھوتیاں باندھ باندھ کر سڑکوں پر لگے ہوئے نلکوں پر نہانے بیٹھ جاتیں۔ مرد کسی حیلے بہانے یہیں ٹہلتے رہتے اور ان کی عریانی کے نظارے سے لطف اندوز ہوتے۔ حد یہ کہ نماز فجر کے وقت بعض مسجدوں میں نمازیوں کی تعداد ایک دم سے بڑھ گئی تھی، مسجد کے نیچے نل جو لگا ہوا تھا! مگر تماشائیوں کے ہجوم کے باوجود نہانے والیوں کی پیشانی پر ہلکی سی شکن تک نہ آتی تھی۔ اسی بے نیازی سے نہاتی رہتیں اور اسی گیلے بدن سے چپکی ہوئی گیلی دھوتیوں سے اپنی جائے قیام پر چلی جاتیں اور یونہی روزانہ صبح کو یہ قدِ آدم نسائی آئینے نلکوں پر معتدل ہوتے اور دیکھنے والوں کی نظروں کو خیرہ کرتے ہوئے چلے جاتے۔

دلّی کی آبادی یکایک دگنی ہو جانے کی وجہ سے شہر میں جگہ جگہ کوڑے کے متعفن ڈھیر لگنے لگے تھے۔ بے موسم کی بارش نے اس گندگی میں اضافہ کر دیا۔ مہتروں کے دماغ بگڑے تھے کہ سیدھے منہ بات نہ کرتے تھے۔ وہ تو بس اس موقعہ کی تاک میں لگے ہوئے تھے کہ شہر میں کب افراتفری پھیلے اور کب مسلمانوں کو لوٹنا شروع کر دیں۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ مہتروں اور مہترانیوں سے زیادہ اور کون گھروں کے حال سے واقف ہو سکتا ہے؟ چنانچہ جب دلّی لٹنی شروع ہوئی تو سب سے زیادہ انھی بھنگیوں نے مسلمانوں کے گھروں کو لوٹا۔

بمبئی کی دیکھا دیکھی دلّی میں بھی چھرے گھونپنے کی وارداتیں ہونے لگیں۔ ہندوؤں کے محلوں سے مسلمانوں کا اور مسلمانوں کے محلوں سے ہندوؤں کا گزر مخدوش ہو گیا، مسلمانوں کو جب معلوم ہوتا کہ آج سات مسلمانوں کے چھرے گھونپے گئے ہیں تو وہ بھی سات گھنٹائیں کر کے فوراً حساب چکتا کر دیتے، کچھ دنوں تک تو یہ حساب یونہی برابر سرابر چلتا رہا۔ اس کے بعد خبروں میں ریڈیو نے یہ بتانا چھوڑ دیا کہ ہندو کتنے مارے گئے اور مسلمان کتنے۔ دونوں کی اکٹھی تعداد بتا دی جاتی۔ مگر چھرے بازی چلتی رہی اور اکّے دکّے کی خیر منائی جاتی رہی۔

خبر آئی کہ پہاڑی دھیرج پر ایک مسلمان کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ قرول باغ کے چند منچلے تاک میں لگ گئے۔ تھوڑی دیر میں ایک خوبصورت نوجوان سائیکل پر آتا دکھائی دیا جیسے ہی وہ قریب پہونچا ایک نے بڑھ کر سائیکل کے پہیے میں ہاکی اسٹک اڑا دی۔ اس کے گرتے ہی باقیوں نے ہاکی اسٹکوں سے اس

کا کام تمام کر دیا اور وہاں سے چمپت ہو گئے بعد میں معلوم ہوا کہ مرنے والا بھی مسلمان ہی تھا اور قرولباغ کے ایک مولوی صاحب کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ایسے بھی اکثر کیس ہوئے۔ بعد میں یہ بھی ہو گیا کہ حلیے سے اگر ہندو مسلمان کی پہچان نہ ہوتی تھی تو شکار کو ننگا کر کے دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیا جاتا تھا۔ مارنے سے پہلے اتنی احتیاط ضرور برت لی جاتی تھی۔ اس کے بعد یہ نوبت آئی کہ خوردہ قتل بند ہو گئے اور تھوک قتل شروع ہو گئے۔ قرول باغ کے ایک اسکول میں بچے امتحان دے رہے تھے۔ وہاں چند جیالے سکھ تلواریں سونت سونت کر پہونچ گئے۔ حکم ہوا کہ ہندو لڑکے الگ ہو جائیں اور مسلمان لڑکے الگ۔ اس کے بعد ان سورماؤں نے سوا سو مسلمان بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان میں سے صرف ایک بچہ خدا جانے کس طرح بچ بچا کر اپنے گھر آ گیا۔ اور شہر میں آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی، مسلمانوں میں سخت جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ حکومت نے کرفیو اور سخت کر دیا اور اتنی بڑی خبر نہ تو ریڈیو پر آئی اور نہ اخباروں میں۔

حکومت کی پالیسی کچھ یہ ہو گئی تھی کہ مسلمانوں میں خوف و ہراس پھیل دو تا کہ ان کے حوصلے پست ہو جائیں اور ڈر کر پاکستان بھاگ جائیں۔ جو بچ رہیں گے وہ پھر کبھی سر نہ اٹھا سکیں گے۔ ایک خوش نویس اس لئے پکڑ لیا گیا کہ اس کے بستے میں سے قلم تراش برآمد ہو گیا۔ کئی مسلمان محض اس لئے گرفتار کر لئے گئے کہ ان کی جیبوں میں سے دیا سلائی کی ڈبیاں نکل آئیں جو یقیناً آتش زنی کے لئے رکھی گئی تھیں۔ ایک بڑھئی کو محض اس لئے گرفتار کر لیا گیا کہ اس کے تھیلے میں سے کئی تیز دھار دار آلے پائے گئے۔ ان واقعات سے مسلمانوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب شہر میں کسی کی عزت محفوظ نہیں رہی۔ لوگ پریشان ہو کر کانگریسی مسلمانوں کے پاس جاتے تو ان سے کہا جاتا کہ جناح کے پاس جاؤ۔ افسرانِ بالا میں ان کی کوئی سنتا نہ تھا۔ عدالتوں میں سے انصاف اٹھ گیا تھا۔ مسلمانوں کے لائسنس ضبط کئے جا رہے تھے اور ان کی بندوقیں مال خانے میں داخل کی جا رہی تھیں، ان تمام جارحانہ کارروائیوں کے باوجود دلّی کے مسلمان ڈٹے ہوئے تھے۔ اور اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ دہلی دارالحکومت ہے، یہاں تمام غیر ملکی سفارتخانے ہیں، یہاں حکومت کوئی فساد نہیں ہونے دے گی۔ یہ ہنگامی حالات ہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی تھے جو جان گئے کہ حریفوں کی نیتیں بیداد پر مائل ہیں۔ دلّی میں خون خرابہ ضرور ہو گا، اس لئے غافل نہیں رہنا چاہئے۔ چنانچہ چپ چپاتے مقابلے کی تیاریاں جاری رہیں۔ گپتیاں بنوائی گئیں۔ اور کچھ نہیں تو چھتوں پر اینٹیں چنوائی گئیں، رات کو محلوں کی مسجدوں میں اہل محلہ جمع ہو کر بچاؤ کی تدبیریں سوچتے۔ محلے کے نوجوانوں کی والنٹیر فورس بنائی

گئیں جو ایک اشارے پر گھروں سے نکل کر کھلی جگہوں میں آ جائیں۔ اونچے اونچے مکانوں پر لال اور سبز رنگ کے قمقمے لگائے گئے۔ کہ جب لال بتیاں جلیں تو سب ہوشیار ہو جائیں کہ خطرہ ہے، اور جب سبز جلیں تو سمجھیں کہ خطرہ گزر گیا۔ ہر محلے کے سرے پر لوہے کے دروازے چندہ کر کے چڑھوا دئے گئے، سب کو تاکید کی گئی کہ کم از کم ایک ہفتہ کا راشن گھر میں رکھیں، محلے کے جو سر دھرے تھے ان سے کہا گیا کہ تم دس دس بیس بیس بوریاں گیہوں کی اپنی حویلیوں میں محفوظ رکھو، وقت چونکہ سب پر پڑا تھا اس لئے سب چھوٹے بڑے سر جوڑ کر کام کر رہے تھے۔ اس پریشانی میں بھی ایک تنظیم پیدا ہو گئی تھی، راتوں کو ہندو محلوں سے جے کارے لگنے شروع ہوتے تو تمام مسلمان محلے جواب میں اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے اور لال بتیاں روشن ہو جاتیں۔ گلیوں میں سارے مرد لاٹھیاں، پلنگ کے سیروے، پٹیاں، پائے اور گھبراہٹ میں پھونکنی اور دیپنا تک لے کر نکل آتے۔ مگر تھوڑی دیر میں پھر سناٹا ہو جاتا اور ہری بتیاں جل جاتی تھیں، عجیب بھیانک سماں ہو جاتا، اکثر راتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ جاتیں۔ پھر یہ ایک معمول ہو گیا اور اس میں سے خوف کا عنصر نکل گیا۔

کرفیو کی پابندیاں صرف مسلمانوں کے لئے تھیں۔ کرفیو کے ختم ہونے سے پہلے اگر کسی نے گھر سے قدم نکالا تو دھر لیا گیا، جوش ایمانی میں جو لوگ صبح کی نماز پڑھنے گھر سے باہر نکلتے دھر لئے جاتے، نہ داد نہ فریاد، مسجدیں ویران ہو گئیں، کانگریسی مولویوں نے چپ سادھ لی۔ ان کے پاس تو بس ایک ہی جواب تھا کہ یہ سب کیا دھرا جناح کا ہے۔

گاندھی کی پرارتھنا روزانہ شام کو ریڈیو پر نشر کی جانے لگی۔ وہ روزانہ یہی کہتا تھا کہ:

"مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے ہتھیار مجھے دے جائیں۔"

اس کا آہنسا صرف مسلمانوں کے لئے تھا، شاید وہ دنیا کو یہ جتانا چاہتا تھا کہ ہندوستان میں جو فتنہ و فساد برپا ہے اس کے تمام تر ذمہ دار مسلمان ہی ہیں، مگر مسلمانوں پر اس کے خلوص کا پول کھل چکا تھا، انہوں نے اسے ہتھیار دینے کے بدلے زمین میں ہتھیار گاڑ دئے، تاکہ سند رہیں اور وقت ضرورت کام آئیں۔

اگست کے آخر اور ستمبر کے شروع میں حریفوں کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ ۱۵ راگست کو آزادی مل گئی تھی اور انگریزوں کا دست شفقت اب بھی انہیں پر تھا، مسلمانوں کے حمایتی پاکستان جا رہے تھے، جو مسلمان یہاں رہ گئے تھے بے دست و پا تھے، خاکساروں کی طرح ایک ہندوؤں کی جماعت جن

سنگھ بن گئی تھی۔ جسے باقاعدہ فوجی تربیت دی جا رہی تھی، خاکساروں کی عسکری جماعت غلط رہنمائی کے باعث ایک مضحکہ خیز چیز بن کر رہ گئی تھی، علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی کے حکم پر مٹھی بھر خاکسار دتی میں جمع ہو گئے تھے۔ انہیں پکڑ کر جیل میں بند کر دیا گیا۔ سکھوں کو ورغلا کر ہندوؤں نے باڑھ پر رکھ دیا تھا۔ ان کی کرپانیں بڑھ کر تلواریں بن گئی تھیں۔ مسلح ہونے کی وجہ سے ان کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔

قاعدہ قانون کوئی باقی نہیں رہ گیا تھا لہٰذا یہ من مانی کرتے پھرتے تھے، پولیس اور فوج نے ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں، انہیں دیکھ کر دتی کے بجار یاد آ جاتے تھے، جو نہایت بے تکلفی سے جس دکان میں چاہتے منہ ڈال دیتے، بجاروں کو ہندو اپنے دیوتاؤں کے نام پر پُن کر دیا کرتے تھے اور انہیں کھلانا پلانا ثواب سمجھتے تھے، ان کا کام بس کھانا اور سنڈیانا تھا، پھر بھی سانڈ ان کے لئے ایک مصیبت بن گئے تھے۔ مسلمانوں کو مارنے کے لئے ہندوؤں نے سکھوں کو خوب کھلا پلا کر تیار کیا تھا، جب مسلمانوں پر ان کا بس نہ چلتا تو ہندوؤں پر پلٹ پڑتے۔ دندناتے ان کے گھروں میں گھس آتے اور جو کچھ ہاتھ لگتا لے کر چل دیتے۔ دتی کے مسلمانوں نے کئی سانڈ کھا ڈالے تھے، وہ بھلا ان بجاروں کو کب بخشنے والے تھے؟ جب بھی اور جہاں بھی ان میں سے کوئی ہتھے چڑھ گیا اس کی شامت بلا دی، لہٰذا مسلمانوں کے محلوں میں انہوں نے جانا چھوڑ دیا تھا۔

دتی میں جب ابتری پھیلنی شروع ہوئی تو ہندوؤں کے محلوں سے مسلمان نکل کر مسلمانوں کے محلوں میں آنے لگے۔ بلکہ بعض ہندوؤں نے پرانے مسلمان پڑوسیوں سے خود ہی کہہ دیا۔

"میاں جی، اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔ حالات بہت خراب ہو گئے ہیں، اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو ہم تمہیں نہیں بچا سکیں گے۔"

بعض نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

"یہاں بہت خونریزی ہونے کا اندیشہ ہے، تم پاکستان چلے جاؤ" مگر مسلمانوں کے تصور میں بھی یہ نہیں آتا تھا کہ دتی ایک منظم منصوبے کے تحت مسلمانوں سے خالی کرالی جائے گی۔ پھر انہیں یہ گھمنڈ بھی تھا کہ جب ہم اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر میدان میں نکل آئیں گے تو حریفوں کے پتے پانی ہو جائیں گے۔ تاریخ کی سینکڑوں مثالیں اس کی گواہ تھیں، چنانچہ دتی کے سارے مسلمان دتی میں جمے رہے، پاکستان جانے والے پاکستان جا چکے تھے اور ۱۴ اگست کو کراچی میں قیام پاکستان کا جشن

بھی ہو چکا تھا۔

یکم ستمبر کو سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق دتی کے بڑے بڑے علاقوں کو ایک ایک کر کے مسلمانوں سے خالی کرانے کی مہم شروع ہونے والی تھی، مگر کچھ تو بے موسم کی لگاتار بارشوں کے سبب اور کچھ تنظیمی خرابی کے باعث اس اسکیم میں پانچ دن کی دیر ہوگئی، ۶ر ستمبر سے اس کا آغاز ہوا اور صبح ہونے سے پہلے قرول باغ میں آتش زنی اور لوٹ مار شروع ہوگئی۔ ملٹری کے ٹرک آتے اور مسلمانوں کو بھر بھر کے جامع مسجد پر چھوڑ جاتے۔ ہندو اپنے مکانوں پر کھڑے گولیاں چلا رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ ان ہی گولیاں چلانے والوں میں مشہور ڈاکٹر بھی تھا، خدا جانے اس نے کتنے مسلمانوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا ہوگا کہ ایک گولی پیچھے سے آئی اور اس کی کنڈی میں لگی، وہ گیند کی طرح لڑھک کر سڑک پر آپڑا۔

گولی کس نے ماری؟

اس کا آج تک پتہ نہیں چل سکا، لیکن چند روز بعد علاقائی مسلم لیگ کے صدر ڈاکٹر قریشی کو نظام الدین کے ریلوے اسٹیشن سے یہ کہہ کر گرفتار کر لیا گیا کہ یہی ہندو ڈاکٹر کا قاتل ہے۔

جیل میں ڈاکٹر قریشی پر انسانیت سوز مظالم کئے گئے۔ مہینوں بعد ان پر مقدمہ چلایا گیا اور فاضل جج نے ان کو پھانسی کی سزا دی، مگر زندگی تھی، بہ ہزار خرابی چھوٹ کر کراچی پہونچے تو ان کی صحت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ چند روز بعد چل بسے۔

دلی کے مسلمان دلی میں ایسے پھنس گئے تھے جیسے چوہے دان میں چوہے۔

نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن

زمین تنگ اور آسمان دور تھا۔ قرولباغ سے شہر لٹنا شروع ہوا۔ مسلمان اگر اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے تو آگ میں زندہ جلا دئے جاتے، اور اگر باہر نکلتے تو تہ تیغ کر دئے جاتے۔ دلی کے بعض بااثر مسلمان جان ہتھیلی پر رکھ کر بڑے افسروں کے پاس جاتے اور ان کے حکم سے مسلح ٹرک لے کر قرولباغ جاتے، ٹرک میں لوگوں کو سوار ہوتے دیکھ کر جان بچانے کے لئے مسلمان ان ٹرکوں میں گدا گد گدا گد سوار ہو جاتے، اگر ان کے پاس سامان ہوتا تو سامان پھینک دیا جاتا۔ نقدم جامع مسجد پر پہونچ کر معلوم ہوتا کہ کسی کے بچے رہ گئے، کسی کے بوڑھے ماں باپ رہ گئے، اس نفسا نفسی کے عالم میں اپنے ہی تن بدن کا کسی کو ہوش نہیں تھا۔ پردہ نشین خواتین ننگے سر رہ گئی تھیں، پاؤں میں جوتی تو شاید ہی کسی کے

رہی ہو۔ شام تک قرولباغ میں نام کو مسلمان نہ رہا، جامع مسجد اور مشرقی رخ کے سنگھاڑے ان نگھروں سے بھر گئے، شہر والوں نے چندہ کر کے کھانا پکوایا اور ان میں تقسیم کیا، اسی روز نئی دلّی میں لودھی کالونی بھی لٹی۔ یہ سرکاری ملازمین کی کالونی تھی۔

اگلے دن سبزی منڈی پر حملہ ہوا۔ یہاں کے مسلمان بڑے جیوٹ تھے، پہلے سے مقابلے کے لئے تیار تھے، چھتوں پر مورچے بنا کر بیٹھ گئے اور مار مار کر حملہ آوروں کا بُھرکس نکالنے لگے، جب جن سنگھ والے ہٹ گئے تو باقاعدہ ملٹری آ گئی، مسلمان سمجھے کہ یہ بھی جن سنگھ والے ہیں، فوج سے بھی بھڑ گئے، مگر جب معلوم ہوا کہ یہ پبلک نہیں حکومت ہے تو ان کے چھکے چھوٹ گئے اور بھگدڑ مچ گئی۔ اب جو برین گنوں در اسٹین گنوں سے گولیوں کی بارش ہوئی ہے تو کشتوں کے پشتے لگ گئے، شام تک سبزی منڈی بھی ختم ہو گئی۔ رات کی خبروں میں ریڈیو نے بتایا کہ سبزی منڈی میں امن وامان ہو گیا ہے۔ ۲۴ گھنٹے کے کرفیو کی وجہ سے شہر کے ایک علاقے کے لوگوں کو کچھ خبر نہ ہوتی تھی کہ دوسرے علاقوں میں کیا ہو رہا ہے۔ اور شام کو گاندھی جی اپنی پرارتھنا میں روزانہ یہی کہا کرتے تھے کہ

”مسلمانوں کو شانتی سے رہنا چاہئے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے ہتھیار مجھے دے جائیں۔“

کرفیو کے وقت میں شرنارتھی تالے توڑ کر مسلمانوں کی دکانیں لوٹتے تھے۔ اس لوٹ میں پولیس یا فوج کے پہرہ دار کا بھی حصہ ہوتا تھا، ایک دن پنڈت جواہر لال نہرو کناٹ پیس میں اچانک نکل آئے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک دکان لٹ رہی ہے۔ غصہ میں کار میں سے کود کر لوٹنے والوں کو دھکے دے کر دکان سے باہر نکالنے لگے، لوٹنے والوں کو کیا معلوم کہ یہ کون ہے؟ انہوں نے مزاحمت کی تو پنڈت جی نے ایک فوجی سے رنقل جھپٹ کر کہا ”نکل جاؤ بدمعاشو یہاں سے، ورنہ گولی ماردوں گا۔“ ان کے ساتھ فوجیوں کو دیکھ کر لوٹنے والے بھاگ کھڑے ہوئے۔ پنڈت جی کا مارے غصے کے برا حال تھا۔ بہت دیر تک جھلاتے رہے۔ مگر بیچارے ایک پنڈت جی سارے مسلمانوں کو بھلا کیسے بچا سکتے تھے؟ حکومت کی ساری کل بگڑی ہوئی تھی۔

دلّی کا تیسرا بڑا محلہ پہاڑ گنج تھا جو نئی دلّی اور پرانی دلّی کے درمیان تھا۔ اس میں بڑے جاندار بندہانی رہتے تھے، اور دولتمند چاندی والے بھی تھے۔ نئی دلی کی طرف جو اس کا سرا تھا اس پر شرنارتھیوں نے چھاؤنی چھار کھی تھی۔ درگاہ حضرت رسول نما میں بھی کئی کنبے بسے ہوئے تھے بہت سی قبریں توڑ کر

زمین ہموار کر لی گئی تھی اور جھونپڑیاں اور ڈیرے تمبو لگا لئے تھے۔ اس درگاہ کے سجادہ نشین جو دلی کی ایک ایک قبر کی بقا کے لئے مقدمہ بازی کرنے میں مشہور تھے، جان بچا کر فراش خانہ میں آ گئے تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک دن شرنارتھی ان کے گھر میں گھس آئے اور بولے کہ

''اگر جان کی سلامتی چاہتے ہو تو یہاں سے اسی وقت چلے جاؤ۔ ورنہ مکان تو جائے گا ہی، تم سب کی جان بھی جائے گی۔'' ناچار بیک بینی و دو گوش وہاں سے چلے آئے۔

سبزی منڈی ختم ہونے کے بعد رات کو پہاڑ گنج پر حملہ ہوا۔ مسلمان اس کے لئے پہلے سے تیار تھے، گولہ بارود سے بھی لیس تھے۔ دونوں طرف سے گولیاں چلتی رہیں۔ بندھانی کٹ کٹ کر لڑے مگر حملہ آور کسی طرح پسپا نہیں ہوئے، دو دن تک یہ معرکہ چلتا رہا۔ آخر فوج بھیجی گئی۔ سبزی منڈی کی طرح پہاڑ گنج والے بھی چنوں کی طرح بھننے لگے، فوج کو دیکھ کر مسلمانوں کے جی چھوٹ گئے اور بدحواس ہو کر بھاگنے لگے۔ بھاگتوں پر سکھ ٹوٹ پڑے اور عورتوں سے ان کی گٹھڑیاں اور پوٹلیاں چھیننے لگے۔ جو زیور پہنے ہوئی تھیں ان کے زیور نوچنے لگے، کسی کے کانوں کی بالیاں نوچیں، کسی کے گلے کی چپاکلی جھٹکا دے کر توڑی، عورتوں نے جب یہ لوٹ کھسوٹ دیکھی تو اپنی جان بچانے کے لئے اپنے زیور خود ہی اتار کر پھینکنے شروع کر دیئے، لوٹنے والے لوٹنے میں لگے اور یہ اپنی جان بچا کر بھاگتی رہیں۔ جب مسلمانوں کے محلوں میں پہونچی ہیں تو انہیں سر پیر کی خبر ہی نہ تھی۔ شام کو ریڈیو سے اعلان ہوا کہ پہاڑ گنج کی شورش فرو ہو گئی، ایک مسلمان کے گھر سے پندرہ من بارود نکلی، اور ایک پاگل رات بھر گولیاں چلاتا رہا۔

پہاڑ گنج میں ہمارے جاننے والے ایک ڈاکٹر حسین بخش رہتے تھے۔ مرنجان مرنج آدمی تھے۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ دور دور سے لوگ ان کے پاس بغرض علاج آیا کرتے تھے۔ خدمت خلق کا بھی ان میں جذبہ تھا۔ کانگریسی مسلمان تھے۔ میونسپل کمیٹی کے الیکشن میں انہیں قدردانوں نے کھڑا کر دیا اور ڈاکٹر صاحب میونسپل کمشنر بھی بن گئے تھے۔ غرض خاصے عزت دار آدمی تھے۔ جب دلی کی حالت بگڑنی شروع ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے بھی محلہ بدلنے کا ارادہ کیا، مگر محلہ کے ہندوؤں نے انہیں جانے نہیں دیا، اور یہی کہتے رہے کہ آپ تو کانگریس کے آدمی ہیں، آپ کا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا، پھر ہم کیسے ہیں؟ پہلے ہماری جان جائے گی ہمارے بعد آپ پر آنچ آئے گی'' خدا جانے ان کے مشیروں کی نیت بخیر تھی یا نہیں، ڈاکٹر صاحب نے ان پر اعتبار کیا اور وہیں رہ گئے، بعض مسلمان دوستوں نے

انہیں سمجھایا بھی کہ اگر حملہ ہو گیا تو یہ لوگ آپ کو بچا نہیں سکیں گے، ڈاکٹر صاحب پھر کہیں اور جانے پر تیار ہو گئے، مگر ہندو پڑوسیوں نے انہیں پھر جھٹکا دیا۔ غرض ڈاکٹر صاحب پہاڑ گنج سے نکل نہیں سکے۔ اور خدا جانے کس بے دردی سے مارے گئے، پہاڑ گنج کے ایک صاحب کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی ایک سولہ سترہ سال کی لڑکی کو اٹھا لیا گیا۔ خدا جانے اس بدبخت پر کیا گزری۔ اگلے دن اس کی برہنہ لاش اس حالت میں دیکھی گئی کہ اس کی دونوں چھاتیاں کٹی ہوئی تھیں۔ اور اوپر سے نیچے تک اس کا پیٹ چاک تھا۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے گھر والوں کی لاشوں کا بھی پتہ نہیں چلا۔

جو لکھ پتی تھے اور جن کی بڑی بڑی حویلیاں تھیں وہ ایک ہی رات میں فقیر ہو گئے۔ در نہیں سر چھپانے کو جگہ نہ ملتی تھی، جامع مسجد میں کئی ہزار آدمیوں نے پناہ لی تھی۔ اللہ کے نیک بندے اس تباہی اور پریشانی کے عالم میں بھی دیگیں پکوا پکوا کر انہیں بھیجتے تھے، راشن کی دکانیں خالی ہو گئی تھیں۔ سبزی ترکاری نہ ملتی تھی، راشن کیسے لایا جاتا اور ترکاریاں کہاں سے آتیں؟ راشن ڈپو اور سبزی منڈی تک کسی مسلمان کا پہونچنا ممکن ہی نہیں تھا۔

لوگوں نے اپنے پالتو جانور کاٹنے شروع کر دیے تھے۔ سوکھی روٹیاں پانی میں بھگو کر کھائی جا رہی تھیں۔ گیہوں، جو، باجرہ، مکئی جو کچھ بھی میسر آتا سل پر پیس کر ٹکڑ پکا لئے جاتے۔ چکیوں کا رواج دلی میں مدتوں سے نہیں رہا تھا، بازار میں گیہوں پسوایا جاتا یا پسا پسایا آٹا بنئے کے ہاں سے آ جاتا تھا، بازار بند پڑے ہوئے تھے۔ گیہوں ابال کر اور نمک چھڑک کر پیٹ کا دوزخ بھر لیا جاتا۔ بدہضمی اور پیچش کی شکایت عام ہو گئی تھی، ڈاکٹر اور دوائیں مشکل سے ملتی تھیں، یہی شب و روز تھے کہ ایک دن ہمارے محلے میں صبح صبح خلیفہ بنو نے آ کر آواز دی، خلیفہ بڑے جی دار آدمی تھے، لکڑی چلانا بہت اچھی جانتے تھے، مگر بڑھاپے نے ان کے کس بل توڑ دیے تھے۔ کہتے تھے "میاں اب میرے ہاتھ کیا دیکھو گے؟ کبھی جوانی میں دیکھتے لطف آ جاتا، میاں چارپائی کے نیچے کبوتر چھوڑ دو، مجال ہے جو نکل جائے؟ ہاتھ قلم کرا دینا، اب بھی خاک چاٹ کر کہتا ہوں دس پانچ کے بس کا تو اب بھی نہیں ہوں" ہاں تو خلیفہ نے آواز دی تو جی سن سے ہو گیا کہ نہ جانے محلے پر کیا نئی افتاد پڑی۔ بارے ڈرتے ڈرتے جا کر ان سے پوچھا "خلیفہ خیر تو ہے؟" بولے "میاں اللہ خیر ہی رکھے گا۔ لو بابو جی، یہ گھر میں دے آؤ پک کے" یہ کہہ کر انہوں نے اپنے شالی رومال کے نیچے سے کوئی دو سیر گوشت کا دونا نکال کر تھما دیا۔ پوچھا "خلیفہ یہ کہاں سے لائے؟ اور کتنے کا لائے؟"

بولے ''میں نے آج اپنے ترکی کو حلال کردیا، دیکھنا گوشت کیسا تو فہ ہے، چاندی کے ٹکڑے ہیں، چاندی کے۔''

''خلیفہ یہ تم نے کیا کیا؟''

''جی میاں مجھ سے جنور کی بے بسی دیکھی نہ گئی، آدمیوں تک کو کھانے کو نہیں مل رہا، اسے کہاں سے کھلاتا؟ بھلا جس جناور کو دودھ جلیبیاں کھلا کر پالا ہو اسے گھاس تک نصیب نہ ہو نالت ہے اس کے جینے پر، لو اب دیر نہ کرو بابو جی، خوب کسا ہوا قورمہ پکواؤ، اور بچوں کو کھلاؤ''

خلیفہ منہ پھیر کر جلدی جلدی قدم اٹھاتے چلے گئے، شاہد ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ انہوں نے بڑے شوق سے اس الٹی چکتی کے دنبے کو پالا تھا، روزانہ نہلاتے، مہندی لگاتے، گلے میں رنگ برنگ موٹے موٹے منکوں کی مالائیں ڈال رکھی تھیں، ایک تسلے میں اس کے لئے چنے ہر وقت رکھے رہتے تھے۔ سیر آدھ سیر جلیبیاں چلتے پھرتے اسے کھلا دیتے، دیکھنے کے لائق جانور تیار ہوا تھا، خلیفہ نے ساری عمر شادی نہیں کی، ایک بیٹھک لے رکھی تھی، اسی میں رہتے تھے اور اسی میں بلی کا کام کرتے تھے دنبے پالنے کا انہیں شوق تھا اور بھی عجیب شوق تھا کہ سال بھر میں جب اسے خوب کھلا پلا کر تیار کر لیتے تو ایک دن اسے کاٹ کر قورمہ کی دیگ چڑھوا دیتے اور محلے والوں کو کھلا کر خوش ہو جاتے، اس کے بعد پھر ایک دنبہ لے کر پال لیتے، مگر اس دفعہ خلیفہ نے اپنا دنبہ ناخوشی سے کاٹا تھا اور شاہد ان کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ اس کا قورمہ پکواتے، یہ تھے دلی کے دل والے، اور یہ تھا دلی کے غریبوں کا حوصلہ!

پہاڑ گنج کی بربادی کے بعد نہ جانے کیا بات ہوئی کہ دلی کے باقی محلے برباد نہیں کئے گئے ورنہ منصوبے کے مطابق ایک ہفتہ میں دلی کو مسلمانوں سے خالی کرالیا تھا، شاید حکومت کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر یہاں یہی کٹا چھنی رہی تو ہندو اور سکھ جو ابھی تک پاکستان میں رہ گئے تھے ان میں سے ایک بھی بچ کر ہندوستان نہ آسکے گا، ریلوں کا بھی یہی حشر ہو رہا تھا، جب ہندوستان والوں نے چن چن کر ریلوں میں مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کردیا تو پاکستان سے بھی ہندو اور سکھوں کی گاڑیاں کٹی ہوئی آنے لگیں اور یہ متوازی کارروائی اس وقت تک جاری رہی جب تک ہندوستان والوں نے جارحانہ حرکتیں بند نہ کردیں، یہی حرکت ان مہاجر اور شرنارتھیوں کے قافلوں کے ساتھ بھی ہوتی رہی جو ایک ملک سے دوسرے ملک آجا رہے تھے۔

جب تقریباً آدھا شہر مسلمانوں سے خالی ہو گیا تو پرانے قلعہ میں کیمپ کھول دیا گیا تا کہ اجڑے ہوئے مسلمان اس میں جا کر پناہ لیں اور وہاں سے پاکستان سدھار جائیں، جامع مسجد میں کئی ہزار خانماں برباد پڑے ہوئے تھے، ایک دن گاندھی جی انہیں دیکھنے اور لیکچر دینے آئے۔ کار سے اترتے ہی احراریوں نے انہیں گھیرے میں لے لیا تا کہ ہجوم ان سے دور رہے۔ گاندھی جی سیڑھیاں چڑھ کر اندر پہونچے تو لٹے ہوئے مسلمان ان کے درشن کرنے اس قدر بیتاب ہو کر لپکے جیسے مہاتما نہیں آسمان سے پرماتما اتر آیا ہو۔ "مہاتما گاندھی زندہ باد" کے نعروں سے مسجد گونج گئی۔ اللہ اللہ کیا وقت تھا! گاندھی جی کو دیکھ کر لوگ خانہ خدا میں خدا کو بھول گئے، مگر ہم نے دیکھا کہ گاندھی نے ان سے ایک لفظ بھی تسلی کا نہیں کہا۔ خاموش آیا اور خاموش چلا گیا اور بیچاری نعرے لگاتے ہی رہ گئے۔ اگلے دن سرکاری حکم آ گیا کہ جامع مسجد خالی کر دی جائے، عبادت خانے اس لئے نہیں ہوتے کہ لوگ انہیں اپنا گھر بنالیں۔ مسجد کے نیچے ٹرک کھڑے ہوئے تھے جو لوگوں کو بھر بھر کے پرانے قلعے پہونچا رہے تھے، شام تک جامع مسجد خالی ہو گئی، بھلا خدا کے گھر میں بندوں کا کیا کام؟ مگر دلی کی سینکڑوں مسجدوں میں شرنارتھی بسے ہوئے تھے اور بعض میں سورتیاں رکھ کر پوجا پاٹ بھی ہونے لگا تھا۔ مہاتما یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر خاموش تھا۔ کان اس نے پہلے ہی بند کر رکھے تھے، اب اس نے آنکھیں بھی بند کر لی تھیں۔

پُرانا قلعہ بھر گیا تو ہمایوں کے مقبرے میں بھی کیمپ کھول دیا گیا۔ مسلمانوں کے قدم اکھڑ چکے تھے، کسی کی جان محفوظ نہیں تھی۔ گولیاں چلتی رہتی تھیں، گورکھے جسے چاہتے گولی مار دیتے، لوگ اپنی اثاثہ کوڑیوں کے مول بیچ کر کیمپوں کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے، خالی گھروں پر ہندو اور سکھ قبضہ کر رہے تھے۔ خود مسلمان بھائی پگڑیوں پر گھر دلاتے پھر رہے تھے۔ پرانے قلعہ اور ہمایوں کے مقبرے میں قیامت کا نمونہ تھا، بارش ہو رہی تھیں، لوگ بھیگ رہے تھے، ہیضہ پھیلا ہوا تھا، لوگ کتے کی موت مر رہے تھے۔ شریف خواتین بدحواس پھر رہی تھیں۔ پانی کا صرف ایک نل تھا۔ اسی ہزار آدمی اس پر ہجوم کئے رہتے۔ دو دو مٹھی چاول کا راشن سرکار کی طرف سے کبھی کبھی مل جایا کرتا تھا۔ پاکستان سے روٹیاں اور دودھ کے ڈبے وغیرہ مفت تقسیم کرنے کے لئے آتے تھے مگر یہ سب چیزیں بک جاتی تھیں یا خود ساختہ منتظمین آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ ہندو اور سکھ بیس روپے تولہ سونا خریدتے پھرتے تھے۔ مگر انسانی فطرت بھی عجیب ہے، اس قیامت کے وقت بھی دنیا کے سارے کام ہو رہے تھے۔ مکر، دھوکہ، فریب، چوری، آشنائی، زنا سبھی کچھ ہو رہا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ ایک دن پرانے قلعہ کی مسجد میں ہم نے دیکھا کہ یار لوگ ہیجڑوں سے

دل بہلا رہے تھے۔ رنڈیاں سرکاری ٹکٹوں پر ہوائی جہازوں سے پاکستان روانہ ہونے کے لیے پر تول رہی تھیں۔ ان کے چاہنے والے افسروں نے انہیں اپنی بیویاں بنا کر ٹکٹ بھیج دیے تھے۔ قائداعظم نے مہاجرین کے لئے بطور خاص بی۔ او۔ اے۔ سی کے جو ہوائی جہاز بھیجے تھے ان میں زیادہ تر رنڈیاں اور بھڑوے ہی پاکستان گئے۔ پھر وہ جہاز آنے بند ہو گئے۔ تین سو ساڑھے تین سو میں لاہور کا ٹکٹ ملتا تھا۔ ہوائی اڈے تک پہونچنے کے لئے ٹیکسی والے دو سو روپے طلب کرتے تھے اور اڈے پر پہونچنے کے بعد فوجی تلاشی لینے کے بعد سامان ضبط کر لیتے تھے، یہ کہہ کر کہ "اب تو تم پاکستان جا رہے ہو اب تمہیں اس کی کیا ضرورت ہے؟"

دلّی کے تقریباً سبھی مزاروں کی بے حرمتی کی جا چکی تھی۔ حضرت قطب صاحب بختیار کاکی کا مزار گاندھی نے دوبارہ بنوایا۔ صرف سلطان جی کی درگاہ سلامت رہی۔ باقی تمام درگاہوں کو نقصان پہونچا۔ شاہ بولا کا جہاں مزار تھا وہاں پیاؤ لگ گئی۔ چھ خہ والوں میں لال پتھر کی جو مسجد تھی اس کا نام و نشان بھی نہیں رہا۔ ایک بدعقیدہ شخص نے کہا "یہ ان ہی بزرگوں کے مزار ہیں جن سے منتیں مرادیں مانگی جاتی تھی۔ جب ان سے اپنی ہی قبریں نہیں بچائی گئیں تو بھلا یہ کسی اور کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

اور جو کچھ ہوا وہ سبھی نے دیکھ لیا۔

ستمبر کے وسط سے سرکاری ملازمین کے لئے ریلیں چلنی شروع ہو گئیں۔ مگر ان ریلوں میں غیر ملازمین بھی گھس جاتے تھے اور ایسے بھرتے تھے کہ بیچ بیچ تل دھرنے کو جگہ باقی نہ رہتی تھی۔ یہ ریلیں نظام الدین کے چھوٹے سے اسٹیشن سے روانہ ہوتی تھیں۔ ایک دن میں دو دو تین تین چلتی تھیں۔ شروع کی دو ایک ریلیں لاہور صحیح سلامت پہونچیں۔ ان کے بعد ریلیں پنجاب کے علاقہ میں جہاں چاہے روک کر لوٹ لی جاتی تھیں اور مسافروں کی بڑی تعداد کو قتل کر دیا جاتا۔ جب کئی کئی دن میں یہ کٹی ہوئی ریلیں پاکستان پہونچتیں تو پاکستان والے شرنارتھیوں کی ریلوں کو جواب میں کاٹ کر بھیجنے لگے۔ چار پانچ دن تک یہی سلسلہ رہا۔ اس کے بعد پاکستان ایک ایسی ریل پہونچی جس میں سوائے لاشوں کے کچھ بھی نہ تھا۔ چنانچہ وہاں سے بھی ایک ایسی ہی ریل ہندوستان بھیج دی گئی۔ اس کے بعد ریلوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بند ہو گیا۔ ڈاک، تار، ٹیلی فون، سب بند۔ بہت دنوں تک دونوں ملکوں میں بے خبری رہی۔ دلّی اور لاہور دونوں جگہ کے ریڈیو پر صبح سے رات تک بس یہ اعلان ہوتے رہتے تھے کہ فلاں پہونچ گیا، فلاں کہاں ہے؟ مہینے سوا مہینے تک یہی ہوتا رہا۔ پھر کوئی دو مہینے کے بعد ریلیں

پھر آنے جانے لگیں اور ان کا کنتا کتا بھی بند ہو گیا۔ مگر دلی سے لاہور تک کا بارہ گھنٹے کا سفر سات سات دن میں طے ہوتا تھا۔ راستہ بھر پانی بھی نہیں ملتا تھا۔ کتنے ہی آدمی ریل میں مر جاتے تو انہیں انھی کے کسی کپڑے میں لپیٹ کر کہیں کسی گڑھے میں دبا دیا جاتا۔ یہ بھی ہوا کہ گود کے بچے مر گئے اور ریل میں سے اُترنے کا حکم نہیں ہے تو ماں مرے ہوئے بچے کو دونوں گود میں لئے بیٹھی رہی۔ مسافر پیاس سے جب جاں بہ لب ہو جاتے تو بارش کے پانی سے کپڑا تر کر کے چوس لیتے۔ مگر جب ریلیں پاکستان میں داخل ہوتیں تو سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جاتا۔ لوگ اپنے غم بھول جاتے اور خوشی سے دیوانہ وار پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے، پاکستان کے اسٹیشنوں پر لوگ گرم گرم روٹیاں، ترکاری یا آم کا اچار لئے چشم براہ ہوتے کہ کب مہاجرین آئیں اور کب ہم انہیں کھلائیں۔ اخوت کا بے پناہ جذبہ کارفرما تھا۔ افسوس کہ اس جذبے کو کسی مفید کام میں نہیں لگایا گیا۔ اور آخر میں یہ جذبہ نفرت کی صورت اختیار کر گیا۔

میلوں لمبے قافلے دیہاتوں سے پاکستان کی جانب چل رہے تھے۔ ان کے پاس بندوقیں نہیں تھیں، تلواریں نہیں تھیں، صرف لاٹھیاں تھیں۔ سینکڑوں میل کی مسافت انہیں پیدل طے کرنی تھی۔ خدا جانے ان کے کھانے پینے کا کیا انتظام تھا۔ ظاہر ہے کہ انہیں راستے میں کسی دیہات سے کوئی چیز نہیں مل سکتی تھی، یہاں تک کہ پانی بھی نہیں، حریفوں نے کنوؤں میں زہر ڈال دیا تھا۔ رات برات ان قافلوں پر حملے بھی ہوتے رہتے تھے۔ ان کا مال واسباب لوٹ لیا جاتا اور ان کی لڑکیاں چھین لی جاتیں۔ مغویہ عورتوں کی تعداد لاکھوں پر ہے۔ ان کے دلوں پر ان کے جسموں پر کیا گزری؟ یہ ایک دکھ بھری کہانی ہے جسے سننے کے لئے پتھر کا دل چاہئے کیونکہ اس میں ہماری بے غیرتی کا پردہ چاک ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے یونہی ڈھکا چھپا رہنے دیجئے۔ اپنا گھٹنا کھولو اور آپ لاجوں مرو!

تھکے ہارے، بھوکے پیاسے، لٹے پٹے قافلے جب پاکستان پہونچتے تو ان میں سے بیسیوں آدمی پاکستان کا نام لے کر الحمد للہ کہتے اور مر جاتے۔ انہیں محض یہ لگن زندہ رکھتی تھی کہ ہم بس پاکستان پہونچ جائیں۔ پاکستان پہونچتے ہی وہ زمین کو چومتے اور دم دی دیتے۔ ان بھوکے پیاسوں کو اگر روٹی دی جاتی تو روٹی ان کے لئے اتنی سار ہو جاتی۔ روٹی کا حلق سے اتارنا غضب ہو جاتا۔ بھوک کا مارا ہوا مہاجر پھنکا بھی نہیں کھاتا تھا، لاہور کے اس وقت کے سیول سرجن ڈاکٹر اجمل حسین کا بیان ہے کہ ہم نے ان آنے والوں کے لئے ایک گھولوا بنایا تھا جس سے ان کے ہاضمہ میں کسی قدر توانائی

آجائے مگر یہ نسوت پانی بھی اکثر کو راس نہ آتا تھا۔ ان کی بے چارگی پر ہمارے لئے سوائے کف افسوس ملنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

مہاجر موج در موج ہندوستان سے چلے آ رہے تھے۔ جس کا کوئی ٹھورٹھکانا نہیں تھا وہ کیمپ میں پہونچ جاتا۔ والٹن کیمپ میں کئی لاکھ مہاجر پڑے ہوئے تھے۔ لاہور کی سڑکوں پر اور میدانوں میں مہاجر پڑے ہوئے تھے۔ والٹن کیمپ میں ہیضہ پھیلا ہوا تھا اور جا بجا مردے پڑے دکھائی دیتے تھے۔ خندقیں کھود کر انہیں ایک طرف دبا دیا جاتا تھا۔ مہاجروں کی اس بے سروسامانی سے یار لوگوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ پرانے قلعہ کی طرح یہاں بھی سینکڑوں صرّاف اونے پونے سونا خریدتے پھرتے تھے، جو کچھ پرانے قلعہ میں ہو رہا تھا اس سے زیادہ والٹن کیمپ میں ہو رہا تھا۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

OOO

ختم شد